



وَمَا إِلَهُكُمْ إِلَّا اللَّهُ يُخَذُّهُمُ الْعَزْزُ فَمَا لَهُمْ حَتُّهُمْ
اور جو رسول تہیں نے توڑ دے گا اور جس سے تم کو منع کریں تو اس سے باز آ جاؤ۔ (الحیثیر: ۷)

دواکم حدیث

حجیت حدیث پر منفرد انداز میں لکھی گئی ایک تحقیقی کتاب

تألیف:

محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ

تحقیق و تعلیق:

حافظ شاہجہان

فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد دوم



UMM UL QURA

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

*** توجہ فرمائیں! ***

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب.....

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ

لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں۔

متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی

نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر
تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.KitaboSunnat.com





وَمَا تَنْكُرُ السُّنَنُ بِفِي زَوْجٍ وَمَا تَنْكُرُ عَنْهُ فَاتَّهَمُوا
اور جو رسول آپس سے تو وہ لے لاور بس سے تم کو منع کریں تو اس سے باز آجاؤ (الحیث: ۷)

دوامِ حدیث

حجیت حدیث پر منفرد انداز میں لکھی گئی ایک تحقیقی کتاب

تألیف:

محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندوی رحمہ اللہ

تحقیق و تعلیق:

حافظ شاہ مجسم

فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد دوم



بہارِ احیاءِ سنن

دوامِ حدیث

تالیف محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندوی تحقیق و تعلیق حافظ محمد مومنا فضل مدینہ یونیورسٹی

ملنے کا پتہ

Pakistan

Umm-ul-Qura Islamic University
Commissioner Road,
Fattomand, Gujranwala
Ph: 0333-8110896
0321-6417723

Madinah

Zulfiker Ibrahim Al-Memoni Al-Atharee
Islamic University
P.O Box 10133, Madinah
Kingdom of Saudi Arabia
Mob: (00966) (0)553462757
Tel: (00966) (04) 8283701
www.madeerah.com

Coventry

Maktabah Ahlul Hadeeth
P.O Box 3070
Coventry CV6 5WL
England U.K.
maktabah_ahlulhadeeth@hotmail.com

Coventry

Islamic Bookshop Coventry
801 Foleshill Road
Foleshill
Coventry CV6 5WL
England U.K.
Mob: (0044) (0) 7970070578
Tel: (0044) (0) 2476-725881

عبد القدوس

مارچ 2008ء

1100

الْمَكْتَبَةُ الْإِسْلَامِيَّةُ

۹۹۔۔۔ ہے ماڈل ٹاؤن - لاہور

نمبر ۱۶۱۳۴.....

کمپوزنگ

طبع اول

تعداد

قیمت

ناشر: ام القرى پبلی کیشنز

0322 8110896, 0321-6417723

فہرست

- 33 مقدمہ ❀
- 37 دین میں حدیث نبوی کا مقام اور اس کی معجزانہ حفاظت ❀
- 75 تقریظ ❀
- 96 دیباچہ ❀
- 98 مصنف کا مبلغ علم! ○
- 100 احادیث میں تناقض یا!! ○

پہلا باب

حدیث میں تحریف

- 110 مصنف کا تردد: ○
- 113 حقیقت و حجت حدیث: ❀
- 113 حدیث کی تعریف: ○
- 113 افعال رسول کی اقسام: ○
- 113 اقوال رسول کی اقسام: ○
- 114 فرمان رسول کی شرعی حیثیت: ○
- 115 احادیث کی تعداد: ○
- 117 حفاظت و کتابت حدیث: ❀
- 117 کتب احادیث کے طبقات: ○
- 117 طبقہ اولیٰ: ○

دوامِ حدیث

6

- 117 ----- طبقہ ثانیہ: ○
- 118 ----- طبقہ ثالثہ: ○
- 119 ----- طبقہ رابعہ: ○
- 119 ----- طبقہ خامسہ: ○
- 120 ----- صحیح حدیث کی اقسام: ○
- 120 ----- متواتر کی اقسام: ○
- 120 ----- صحیح حدیث پر عمل واجب ہے: ○
- 120 ----- صحیح حدیث کی شرائط قرآن سے مأخوذ ہیں: ○
- 122 ----- صحت حدیث کی دیگر شرائط: ○
- 123 ----- دلیل کی اقسام: ○
- 124 ----- حدیث قرآن کا بیان ہے: ○
- 125 ----- شریعت ہم تک کیسے پہنچی؟ ○
- 126 ----- حج کا بیان حدیث میں ہے: ○
- 126 ----- احکام زکوٰۃ کی تفصیل حدیث میں ہے: ○
- 127 ----- حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے: ○
- 128 ----- بیان قرآن، قرآن سے الگ بھی ہے: ○
- 128 ----- پہلی مثال: ○
- 129 ----- دوسری مثال: ○
- 129 ----- تیسری مثال: ○
- 130 ----- چوتھی مثال: ○
- 130 ----- پانچویں مثال: ○

- قرآن مجید کس طرح نازل ہوا: 131
- حدیث اور اقسام وحی: 131
- نبی کریم ﷺ کا اجتہاد: 132
- چھٹی مثال: 133
- ساتویں مثال: 134
- آٹھویں مثال: 135
- نویں مثال: 136
- دسویں مثال: 136
- کتابت و حفاظت حدیث: 138
- نبی اکرم ﷺ کا حدیث لکھوانا: 138
- پہلی دلیل: 138
- دوسری دلیل: 138
- تیسری دلیل: 138
- چوتھی دلیل: 139
- پانچویں دلیل: 139
- چھٹی دلیل: 139
- ساتویں دلیل: 140
- حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا حدیث لکھنا: 140
- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا حدیث لکھنا: 140
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حدیث لکھنا: 140
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حدیث لکھنا: 141

- احادیث حکومت کا آئین تھیں: 141
- تابعین کے عہد میں کتابت حدیث: 141
- عمر بن عبدالعزیز کا حدیث لکھنا: 141
- امام زہری رحمہ اللہ کا حدیث لکھنا: 142
- کتابت حدیث کے مراحل: 142
- قرونِ اولیٰ میں قوتِ حافظہ: 143
- منکرین حدیث کے دلائل: 144
- حضرت ابوسعید خدری رحمہ اللہ کی حدیث: 144
- ✦ جواب: 144
- صحیفہ عمرو بن حزم: 146
- حضرت ابوبکر رحمہ اللہ کا اثر: 147
- ✦ جواب: 147
- حضرت ابوبکر رحمہ اللہ کا دوسرا اثر: 148
- ✦ جواب: 148
- حضرت عمر رحمہ اللہ کا اثر: 150
- ✦ جواب: 150
- حضرت عمر رحمہ اللہ کا دوسرا اثر: 151
- ✦ جواب: 151
- حضرت عمر رحمہ اللہ کا تیسرا اثر: 153
- ✦ جواب: 154
- حضرت عمر رحمہ اللہ کا چوتھا اثر: 155

- 156 ----- جواب: ✦
- 156 ----- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر: ○
- 157 ----- جواب: ✦
- 157 ----- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا دوسرا اثر: ○
- 157 ----- جواب: ✦
- 158 ----- حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر: ○
- 158 ----- جواب: ✦
- 159 ----- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تیسرا اثر: ○
- 160 ----- جواب: ✦
- 160 ----- زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اثر: ○
- 160 ----- جواب: ✦
- 161 ----- حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث: ○
- 162 ----- جواب: ✦
- 163 ----- ضحاک بن مزاحم کا اثر: ○
- 163 ----- جواب: ✦
- 164 ----- جریر کا اثر: ○
- 164 ----- جواب: ✦
- 165 ----- ابو خالد احمر کا اثر: ○
- 166 ----- جواب: ✦
- 166 ----- شعبہ کا اثر: ○
- 168 ----- جواب: ✦

- شعبہ کا دوسرا اثر: ----- 168
- ✦ جواب: ----- 169
- انیاس بن معاویہ کا اثر: ----- 170
- ✦ جواب: ----- 171
- امام داؤد طائی کا اثر: ----- 172
- ✦ جواب: ----- 172
- فضیل بن عیاض کا اثر: ----- 173
- ✦ جواب: ----- 173
- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اثر: ----- 176
- ✦ جواب: ----- 176
- سفیان ثوری رضی اللہ عنہ کا اثر: ----- 177
- ✦ جواب: ----- 178
- سفیان بن عیینہ کا اثر: ----- 179
- ✦ جواب: ----- 179
- بکر بن حماد کے شعر: ----- 180
- ✦ جواب: ----- 181
- سفیان ثوری کا ایک اثر: ----- 181
- ✦ جواب: ----- 182
- سفیان کی طرف منسوب ایک اثر: ----- 184
- ✦ جواب: ----- 184
- سفیان کا ایک اور اثر: ----- 184

- 185 ----- جواب: ✦
- 185 ----- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی عمر: ○
- 186 ----- جواب: ✦
- 186 ----- محدثین پر الزام تراشی: ○
- 187 ----- جواب: ✦
- 187 ----- الزام تراشی کی حقیقت: ○
- 188 ----- جواب: ✦
- 190 ----- اعتراض: ○
- 190 ----- جواب: ✦
- 191 ----- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی: ○
- 193 ----- جواب: ✦
- 193 ----- حدیث میں قطع و برید: ○
- 194 ----- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد: ○
- 194 ----- نبی کریم ﷺ کے متعلق غلط فہمی: ○
- 195 ----- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو موقع شناسی کی تربیت: ○
- 195 ----- حدیث کا صحیح مفہوم: ○
- 197 ----- نبی اکرم ﷺ کا انداز تربیت: ○
- 198 ----- علماء پر الزام تراشی: ○
- 199 ----- جواب: ✦
- 199 ----- احادیث کی شرعی حیثیت: ○

دوسرا باب:

تدوین حدیث

- تدوین حدیث کے مراحل: 201
- منکرین کتابت حدیث کے دلائل اور ان کی حقیقت: 202
- برق صاحب کی غلطی: 202
- حضرت انس رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی: 203
- حقیقت حال: 203
- ”متفق علیہ“ کا معنی: 204
- حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بعض احادیث پر اعتراض: 204
- ✦ جواب: 205
- شق صدر والی حدیث: 206
- ✦ جواب: 209
- افکار و جذبات کا محل: 209
- شق صدر کی حقیقت: 210
- شق صدر کا صحیح مفہوم: 213
- احادیث کی تعداد کے متعلق غلط فہمی: 215
- ✦ جواب: 215
- وضع احادیث کا فتنہ: 216
- ✦ جواب: 216
- حفاظت حدیث کے اسباب: 216

- قرآن و حدیث دونوں محفوظ ہیں: 217
- احادیث کی شرعی حیثیت: 218
- قرآن اور تواتر: 218
- محدثین کی مساعی جیلہ کی ناقدری: 219

تیسرا باب

چند عجیب راوی و صحابہ

- موضوع احادیث کا تذکرہ: 220
- ✦ جواب: 223

چوتھا باب

ائمہ حدیث اور راویوں کے متعلق

- ان اقوال کے اسباب: 225
- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول: 225
- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول: 226
- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دوسرا قول: 226
- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا تیسرا قول: 227
- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا چوتھا قول: 228
- عروۃ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قول: 230
- حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا قول: 231
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول: 231

- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول: 232-----
- حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا قول: 233-----
- ✦ جواب: 235-----
- امام مالک رحمہ اللہ کا قول: 236-----
- ✦ جواب: 236-----
- امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول: 236-----
- ✦ جواب: 236-----
- امام اعمش رحمہ اللہ کا قول: 237-----
- ✦ جواب: 237-----
- امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول: 238-----
- ✦ جواب: 238-----
- سعید بن مسیب، حسن بصری اور عکرمہ رحمہم کا قول: 239-----
- ✦ جواب: 239-----
- قتادہ رحمہ اللہ کا قول: 239-----
- ✦ جواب: 240-----
- سلیمان تیمی رحمہ اللہ کا قول: 240-----
- ✦ جواب: 240-----
- یحییٰ بن معین کا قول: 240-----
- ✦ جواب: 240-----
- امام مالک رحمہ اللہ کے متعلق چند اقوال: 241-----
- ✦ جواب: 241-----

- حماد بن ابی سلیمان کا قول: 242-----
- ✦ جواب: 242-----
- امام شعبی اور نخعی کا قول: 242-----
- ✦ جواب: 243-----
- جابر بن یزید کا قول: 243-----
- ✦ جواب: 243-----
- ابو جعفر ہاشمی کا قول: 244-----
- ✦ جواب: 244-----
- شعبہ بن حجاج کا قول: 244-----
- ✦ جواب: 245-----
- صالح المری کا قول: 245-----
- ✦ جواب: 245-----
- یزید بن ہارون کا قول: 245-----
- ✦ جواب: 246-----
- حمزۃ الزیات کا قول: 246-----
- ✦ جواب: 247-----
- ابواسحاق الفزازی کا قول: 248-----
- ✦ جواب: 248-----
- اعتراض: 249-----
- ✦ جواب: 249-----

پانچواں باب

حدیث پر ایک مکالمہ

- وحی کی اقسام: 250
- کن امور میں آنحضرت ﷺ کی اقتداء ضروری نہیں: 251
- مکالمہ 252
- قائل حدیث 252
- منکر حدیث 252
- قائل حدیث 252
- منکر حدیث 252
- قائل حدیث 253
- منکر حدیث 253
- قائل حدیث 253
- منکر حدیث 254
- قائل حدیث 254
- حدیث قرآن کی طرح حجت ہے: 255
- منکر حدیث 256
- قائل حدیث 257
- منکر حدیث 258
- قائل حدیث 258
- اطاعتِ رسول کا مطلق حکم: 258

- 259 ----- منکر حدیث ○
- 261 ----- قائل حدیث: ○
- 264 ----- منکر حدیث ○
- 265 ----- قائل حدیث ○
- 266 ----- منکر حدیث ○
- 266 ----- قائل حدیث ○
- 267 ----- منکر حدیث ○
- 267 ----- قائل حدیث ○
- 268 ----- منکر حدیث ○
- 269 ----- قائل حدیث ○
- 271 ----- منکر حدیث ○
- 272 ----- قائل حدیث ○

چھٹا باب:

تحریف احادیث کے اسباب

- 274 ----- پہلا سبب: کتابت حدیث کی ممانعت ❁
- 275 ----- جواب ❁
- 275 ----- حفاظت حدیث کی صورتیں ○
- 275 ----- تحریف قرآن کی مذموم کاوش: ○
- 276 ----- حدیث محفوظ ہے: ○
- 277 ----- اعتراض: ○

- 277 ----- جواب: ✦
- 278 ----- اعتراض: ○
- 278 ----- جواب: ✦
- 279 ----- اعتراض: ○
- 279 ----- جواب: ✦
- 279 ----- اعتراض: ○
- 280 ----- جواب: ✦
- 280 ----- اعتراض: ○
- 281 ----- جواب: ✦
- 282 ----- اعتراض: ○
- 283 ----- جواب: ✦
- 284 ----- اعتراض: ○
- 284 ----- جواب: ✦
- 285 ----- مالی قربانی کی اقسام: ○
- 286 ----- تحریفِ حدیث کا دوسرا سبب: آسان اسلام ✦
- 286 ----- موضوع احادیث کا تذکرہ: ○
- 286 ----- پہلی حدیث: ○
- 286 ----- دوسری حدیث: ○
- 287 ----- تیسری حدیث: ○
- 287 ----- چوتھی حدیث: ○
- 287 ----- پانچویں حدیث: ○

- 288 ○ چھٹی حدیث:
- 288 ○ ساتویں حدیث:
- 288 ○ آٹھویں حدیث:
- 289 ○ نویں حدیث:
- 290 ● تحریف حدیث کا تیسرا سبب: طریقت
- 290 ○ چند موضوع احادیث
- 290 ○ پہلی حدیث:
- 291 ○ دوسری حدیث:
- 291 ● تحریف حدیث کا چوتھا سبب: بادشاہوں کی خوشامد
- 292 ○ پہلی موضوع حدیث:
- 292 ○ دوسری حدیث:
- 292 ○ تیسری حدیث:
- 292 ○ چوتھی حدیث:
- 293 ○ پانچویں حدیث:
- 293 ○ چھٹی حدیث:
- 293 ○ ساتویں حدیث:
- 293 ○ آٹھویں حدیث:
- 294 ● پنجم: فرقہ پرستی
- 294 ○ پہلی موضوع حدیث:
- 294 ○ دوسری حدیث:
- 295 ○ تیسری حدیث:

- چوتھی حدیث: 296
- پانچویں حدیث: 296
- مسئلہ خلق قرآن: 296
- غلط فہمی کا ازالہ: 297
- چھٹی موضوع حدیث: 298
- ساتویں حدیث: 298
- آٹھویں حدیث: 298
- نویں حدیث: 298
- ششم: امتیاز رنگ و نسل 299
- پہلی حدیث: 299
- دوسری حدیث: 299
- ہفتم: ملا درمدخ خود گوید 299
- پہلی حدیث: 300
- دوسری حدیث: 300
- تیسری حدیث: 300
- چوتھی حدیث: 300
- پانچویں حدیث: 300
- چھٹی حدیث: 301
- ساتویں حدیث: 301
- آٹھویں حدیث: 301
- نویں حدیث: 301

- 301 ————— دسویں حدیث: ○
- 302 ————— گیارہویں حدیث: ○
- 302 ————— بارہویں حدیث: ○
- 303 ————— تیرہویں حدیث: ○
- 303 ————— چودھویں حدیث: ○
- 303 ————— پندرہویں حدیث: ○
- 304 ————— سولویں حدیث: ○
- 304 ————— سترہویں حدیث: ○
- 304 ————— اٹھارویں حدیث: ○
- 305 ————— ہشتم: حقائق حیات ✿
- 305 ————— گندم کے متعلق: ○
- 306 ————— ایک سوال اور اس کا جواب: ○
- 306 ————— جواب: ✦
- 307 ————— چند موضوع احادیث: ○

ساتواں باب

”موطاً پر ایک نظر“

- 310 ————— پہلا اعتراض: ○
- 311 ————— جواب: ✦
- 312 ————— دوسرا اعتراض: ○
- 313 ————— جواب: ✦

- تیسرا اعتراض: قرآن میں رد و بدل 313
- ✦ جواب: 314
- چوتھا اعتراض: 315
- ✦ جواب: 315
- پانچواں اعتراض: 317
- ✦ جواب: 317
- چھٹا اعتراض: 318
- ✦ جواب: 319
- ساتواں اعتراض: 319
- ✦ جواب: 320

آٹھواں باب:

صحیح بخاری پر ایک نظر

- پہلا اعتراض: 322
- ✦ جواب: 323
- دوسرا اعتراض: 324
- ایک پیشین گوئی: 325
- ✦ جواب: 326
- تیسرا اعتراض: تاریخی غلط بیانیان: 329
- ✦ جواب: 330
- چوتھا اعتراض: 332

- 334 ----- ✦ جواب:
- 335 ----- ○ پانچواں اعتراض:
- 342 ----- ✦ جواب:
- 350 ----- ○ نزول قرآن کے اسباب:
- 351 ----- ○ ”اسلام“ کا معنی:
- 352 ----- ○ چھٹا اعتراض:
- 354 ----- ✦ جواب:
- 355 ----- ○ نواں باب
- 355 ----- ○ ”حضور کی تصویر حدیث میں“
- 355 ----- ○ اعتراض:
- 358 ----- ✦ جواب:
- 361 ----- ○ اعتراض
- 362 ----- ✦ جواب:
- 362 ----- ○ اعتراض:
- 363 ----- ✦ جواب:
- 363 ----- ○ اعتراض:
- 363 ----- ✦ جواب:
- 364 ----- ○ اعتراض: مباشرت در حیض
- 366 ----- ✦ جواب:
- 367 ----- ○ اعتراض:
- 367 ----- ○ ”کردار رسول ﷺ پر ایک اور جھوٹ“

- 367 ----- ✦ جواب:
- 367 ----- ○ اعتراض:
- 368 ----- ✦ جواب:
- 368 ----- ○ اعتراض:
- 369 ----- ✦ جواب:
- 370 ----- ○ اعتراض:
- 371 ----- ✦ جواب:
- 371 ----- ○ اعتراض: حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح
- 372 ----- ✦ جواب:
- 373 ----- ○ ”سیرت رسول ﷺ کا ایک اور منظر“
- 374 ----- ✦ جواب:
- 378 ----- ○ اعتراض:
- 379 ----- ✦ جواب:
- 380 ----- ○ اعتراض:
- 382 ----- ✦ جواب:
- 384 ----- ○ اعتراض:
- 384 ----- ✦ جواب:

دسواں باب:

”حدیث میں نماز کی صورت“

- 386 ----- ○ اعتراض:

- 386 ----- جواب: ✦
- 387 ----- اعتراض: ○
- 388 ----- جواب: ✦
- 388 ----- اعتراض: ○
- 388 ----- وضوء: ○
- 389 ----- ہر نماز کے لیے وضوء: ○
- 389 ----- تردید بالا: ○
- 390 ----- جواب: ✦
- 391 ----- لہو سے وضوء ٹوٹنے کا مسئلہ: ○
- 391 ----- مجامعت کے بعد غسل: ○
- 391 ----- آگ کی کچی ہوئی چیز سے وضوء: ○
- 391 ----- وضوء میں الحشاء دھونے کی تعداد: ○
- 391 ----- غسل کے پانی سے وضوء: ○
- 392 ----- تعداد رکعات: ○
- 393 ----- عصر کے بعد نماز: ○
- 393 ----- تکبیر اقامت: ○
- 394 ----- نماز میں صرف فاتحہ کافی ہے: ○
- 394 ----- دعائے قنوت کا وقت: ○
- 394 ----- دعاء افتتاح: ○
- 395 ----- نماز میں مختلف اعمال کی اجازت: ○

- 396 نمازی کے آگے سے گزرنا ○
- 397 رفع الیدین ○
- 397 اجتماع صلوٰتین ○
- 398 کیا حائضہ نماز ادا کرے؟ ○
- 399 رکوع و سجود میں قرآن ○
- 399 نماز میں انسانی کلام ○
- 400 دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا ○
- 400 جواب ✦
- 400 جوتوں میں نماز ○
- 401 سجدے میں بازو کھولنا ○
- 401 پہلی رکعت کے بعد بیٹھنا ○
- 401 نماز چھوٹی ہو یا لمبی ○
- 402 وقتِ عصر ○
- 403 اعتراض ○
- 403 جواب ✦
- 404 ”چند اور اختلاف“ ○

گیارہواں باب

بہترین عمل

- 406 اعتراض ○
- 408 جواب ✦

بارہواں باب

”اللہ کی عبادت“

418 ----- جواب: ✦

تیرہواں باب

لفظ ”مغفرت“ کی تحقیق

424 ----- جواب: ✦

425 ----- مغفرت کے اسباب ○

426 ----- گناہ کے اثرات ○

426 ----- گناہ کا مفہوم ○

426 ----- گناہ کے اثرات کا علاج ○

427 ----- حقوق کی اقسام ○

427 ----- گناہ کی اقسام ○

428 ----- مغفرت کے طریقے ○

430 ----- توجیہ ○

چودہواں باب

شفاعت

431 ----- اعتراض ○

432 ----- جواب: ✦

433 ----- شفاعت کی حقیقت ○

پندرہواں باب

”قرآن سے متضاد احادیث“

- 435 ----- پہلی حدیث: ○
- 437 ----- جواب: ✦
- 438 ----- اعتراض: ○
- 438 ----- جواب: ✦
- 438 ----- اعتراض: ○
- 439 ----- جواب: ✦
- 439 ----- اعتراض: ○
- 439 ----- جواب: ✦

سترہواں باب

تقدیر

- 442 ----- جواب: تقدیر کی حقیقت ✦

اٹھارہواں باب

متضاد احادیث

- 446 ----- پہلی حدیث: ○
- 446 ----- جواب: ✦
- 447 ----- دوسری حدیث: ○

- 448 ----- جواب: ✦
- 449 ----- تیسری حدیث: ○
- 449 ----- درخت کا ٹٹا: ○
- 450 ----- جواب: ✦
- 450 ----- چوتھی حدیث: آگ سے عذاب دینا: ○
- 451 ----- جواب: ✦
- 453 ----- پانچویں حدیث: کیا گھوڑا منحوس ہے؟ ○
- 454 ----- جواب: ✦
- 454 ----- چھٹی حدیث: نماز میں بھولنے کی وجہ ○
- 455 ----- جواب: ✦
- 456 ----- ساتویں حدیث: ○
- 456 ----- جواب: ✦
- 457 ----- آٹھویں حدیث: تعظیم قبلہ ○
- 458 ----- جواب: ✦
- 459 ----- نویں حدیث: کیا احرام میں شکار کا گوشت کھانا جائز ہے؟ ○
- 460 ----- جواب: ✦
- 461 ----- دسویں حدیث: کیا احرام میں خوشبو لگانا جائز ہے؟ ○
- 462 ----- جواب: ✦
- 462 ----- گیارہویں حدیث: کیا رسول اللہ نے اللہ کو دیکھا تھا؟ ○
- 463 ----- جواب: ✦
- 464 ----- بارہویں حدیث: شہد والا قصہ ○

- 464 ----- جواب: ✦
- 465 ----- تیرہویں حدیث: ○
- 465 ----- شق صدر: ○
- 466 ----- جواب: ✦
- 467 ----- چودہویں حدیث: خیر النساء کون ہے؟ ○
- 468 ----- جواب: ✦

انیسواں باب

چند دلچسپ احادیث

- 469 ----- سجدہ آفتاب: ○
- 469 ----- جواب: ✦
- 471 ----- سورج کا جانا: ○
- 471 ----- عرش کے نیچے سجدہ کرنا: ○
- 472 ----- اذن مانگنا: ○
- 473 ----- سجدہ قبول نہ ہونا: ○
- 473 ----- اذن نہ ملنا: ○
- 473 ----- حدیث کا مطلب: ○
- 474 ----- حدیث کی دوسری توجیہ: ○
- 474 ----- شیطان کا طول و عرض: ○
- 475 ----- جواب: ✦
- 477 ----- شرک کی حقیقت: ○

- 479 ایک اور توجیہ: ○
- 480 حدیث کا علم الجغرافیہ: ○
- 481 جواب: ✦
- 483 حدیث کا علم الطب: ○
- 484 جواب: ✦
- 485 حدیث کا علم التولید: ○
- 486 جواب: ✦
- 488 حدیث کا علم الاصوات: ○
- 488 جواب: ✦
- 490 حدیث کا علم الآداب: ○
- 490 جواب: ✦
- 491 کھڑے ہو کر پیشاب کرنا ○
- 491 جواب: ✦
- 492 حدیث کا علم الزلزال: ○
- 492 جواب: ✦
- 493 حدیث کا علم اللسنة: ○
- 493 جواب: ✦
- 494 حدیث کا علم النباتات: ○
- 495 جواب: ✦
- 496 حدیث کا علم الحقائق: ○
- 497 جواب: ✦

- 498 ----- جواب: ✦
- 499 ----- حدیث کا علم التاريخ: ○
- 499 ----- جواب: ✦
- 500 ----- حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ: ○
- 501 ----- جواب: ✦
- 501 ----- اختتامی کلمات: ❁
- 502 ----- خلاصہ کلام: ❁
- 504 ----- فقہ اشتراکیت اور اسلام: ❁
- 504 ----- آخری تنبیہ: ❁

مقدمتہ

حضرت حافظ صاحب محدث گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب ”مقام حدیث“ کا جواب مکمل کیا، تو اسی کے متصل ”دوام حدیث“ کے عنوان سے ہی ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی انکار حدیث پر مبنی کتاب ”دو اسلام“ کا جواب بھی ”ایک اسلام“ کے ذیلی عنوان سے مکمل کر دیا اور برق صاحب کے ان تمام مغالطات اور اعتراضات کا مکمل جواب دیا، جن سے متاثر ہو کر برق صاحب نے انکار حدیث کی راہ اختیار کی تھی۔

برق صاحب کی مذکورہ کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد کئی علماء کرام نے اس کو ہدف تنقید بنایا اور متعدد جوابات لکھے، جن میں مندرجہ ذیل کتب شامل ہیں:

- ① خالص اسلام، مولانا داؤد راز دھلوی رحمۃ اللہ علیہ
- ② صحیح اسلام، مولانا عبدالعزیز رحمانی
- ③ صیانة الحديث، مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈاگری
- ④ تفہیم اسلام، مسعود احمد بی ایس سی
- ⑤ صرف ایک اسلام، سر فراز احمد خان صفدر دیوبندی

حضرت حافظ صاحب نے بھی برق صاحب کی کتاب کا تفصیلی جائزہ لیا اور اپنی خداداد مجتہدانہ بصیرت سے کتاب میں مذکور تمام اعتراضات کا تفصیلی جواب دیا، جہاں جہاں مؤلف نے جادہ حق سے انحراف کرتے ہوئے ٹھوکریں کھائی تھیں، ایسے تمام مقامات کی نشاندہی کی اور صحیح موقف کو اجاگر کیا۔

بعد ازاں برق صاحب نے مذکورہ علماء کی جوابی تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے

بعد اپنے سابقہ عقیدہ سے رجوع کر لیا اور حدیث و سنت کو بھی اسلامی شریعت کا بنیادی ماخذ و مصدر تسلیم کر لیا، چنانچہ اسی سلسلہ میں انہوں نے اپنی سابق غلطی کی تلافی کرتے ہوئے ”تاریخ حدیث“ کے نام سے دفاع و خدمت حدیث میں ایک کتاب بھی لکھی، تاکہ یہ کتاب ان کے اعتراف حق پر شاہد عدل بن جائے، مذکور کتاب کے مقدمے میں برق صاحب اپنے سابق موقف کی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جو لوگ اس موضوع پر میری پہلی تحریروں سے آشنا ہیں، وہ یقیناً یہ اعتراض کریں گے کہ میرا موجودہ موقف پہلے موقف سے متصادم ہو رہا ہے، ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ انسانی فکر ایک متحرک چیز ہے، جو کسی ایک مقام پر مستقل قیام نہیں کرتی اور سدا خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے، جس دن فکر انسان کا یہ ارتقاء رک جائے گا، علم کی تمام راہیں مسدود ہو جائے گی، کمال صرف رب ذوالجلال کا وصف ہے، وہ جو بات کہتا ہے، از ابتدا تا انتہا ہر لحاظ سے کامل ہوتی ہے اور کسی تغیر کو قطعاً گوارہ نہیں کرتی، لیکن انسان صداقت تک پہنچتے پہنچتے سو بار گرتا ہے، میں بھی سو بار گرا اور ہر بار لطف ایزدی نے میری دستگیری کی کہ اٹھا کر پھر ان راہوں پر ڈال دیا، جو صحیح سمت کو جا رہی تھیں۔“ (تاریخ حدیث: ۱۳)

برق صاحب کے اعتراف حق اور رجوع الی الحدیث کے باوجود ان کی کتاب ”دوا اسلام“ مارکیٹ میں موجود ہے اور نا عاقبت اندیش ناشر اور تاجر حضرات اس کتاب کے ذریعہ حدیث رسول کے خلاف مذموم پراپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔ مزید برآں جن مغالطات اور فاسد آراء سے متاثر ہو کر برق صاحب نے ٹھوکر کھائی تھی، آج کل بھی عوام الناس کی صفوں میں ایسے ہی مغالطات کی نشر و اشاعت ہو رہی ہے، جن کے مطالعہ سے بعض ناپختہ ذہنوں کے بھٹک جانے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اسی ضرورت کے پیش نظر حضرت حافظ صاحب کی زیر نظر تالیف کی افادیت

پہلے سے بڑھ گئی ہے، تاکہ جو لوگ بھی حدیث مصطفیٰ ﷺ کے خلاف مسموم فضا پیدا کرنے میں مصروف ہیں، ان کے لیے یہ کتاب تازیانہ عبرت بن سکے اور ایسے زہریلے اثرات سے متاثر قلوب و اذہان کے لیے باعث ہدایت بن جائے۔

اسلوب تحقیق

کتاب کے اس حصہ میں بھی حصہ اول کی مانند تحقیقی اسلوب اختیار کیا گیا ہے، یعنی:

۱ آیات کی نشاندہی

۲ احادیث کی تحقیق و تخریج

۳ آثارِ صحابہ و تابعین وغیرہم کی تحقیق و تخریج

۴ بعض مطالب کی حواشی میں مزید توضیح و تفصیل

۵ حضرت حافظ صاحب نے کتاب میں جن مصادر و مراجع سے عبارات نقلی کی

تھیں یا ان کا حوالہ دیا تھا، اصل کتاب سے رجوع کر کے عبارات و الفاظ کا

تقابل کرنے کے حوالہ جات لکھ دیے گئے ہیں، مزید برآں بعض مقامات پر

حضرت حافظ صاحب کے کلام کی تصویب و تائید میں متقدمین علماء کا کلام نقل کیا

گیا ہے اور بسا اوقات حوالہ جات ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا ہے

۱ حضرت حافظ صاحب محدث گوندلوی رحمہ اللہ نے جن جن مقامات پر برق صاحب کی

کتاب ”دوا سلام“ سے اقتباسات نقل کیے تھے، ایسے تمام مقامات پر برق صاحب

کی مذکور کتاب مد نظر رکھتے ہوئے منقولہ عبارات کا تقابل و اصلاح کی گئی ہے۔

۲ بعض مقامات پر ایضاح مطالب کے لیے ذیلی عناوین کا اضافہ کیا گیا ہے۔

شاہد محمود

۱۶ صفر، ۱۴۲۹ھ

03338110896

دین میں حدیث نبوی کا مقام اور اس کی معجزانہ حفاظت

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر رحمۃ اللہ علیہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، وبعد :

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى

الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا﴾ (الفصح : ۲۸)

”وہی عظیم ذات ہے، جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ ارسال

فرمایا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، گواہی دینے والا اللہ ہی کافی ہے۔“

ابتداء عہد اسلام میں تو مسلمانوں کو پوری دنیا اور دنیا کے تمام اہل ادیان پر مادی و عسکری غلبہ بھی حاصل تھا، جہاں تک اسلام کے غلبہ کا تعلق ہے، تو تاریخ اسلام کے کسی دور میں بھی دنیا کی کوئی طاقت اسلام کی حقانیت و صداقت، اس کی براہین قاطعہ اور بینات واضحہ پر کبھی جزوی طور پر بھی غالب نہیں آسکی۔ اسلام کی دو اساسی دلیلیں ہیں :

الف : قرآن کریم، ب : صاحب قرآن، یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

دونوں معصوم عن الخطاء، مصئون عن التغير اور محفوظ بحفظ اللہ و رعایتہ

ہیں، اس لئے مغلوبیت ان کی طبیعت اور مزاج میں شامل ہی نہیں ہے، ان سے ٹکرانے والا اپنا نقصان ہی کرے گا، وہ قطعاً نقصان پذیر یا زوال پذیر نہیں ہیں، اللہ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ لَا يُحِبَّ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَ لَيْسَ لَهُ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءُ أُولَئِكَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ (الاحقاف: ۲۲)

”اور جو شخص اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول نہیں کرے گا، وہ زمین میں عاجز کرنے والا نہیں ہے اور نہ ہی اس کے (اللہ) کے سوا کوئی حمایتی ہوں گے، وہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔“

﴿وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ﴾ (سبا: ۳۸)

”اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں میں یہ محنت کرتے ہیں کہ ہمیں ہرا دیں، وہ عذاب میں گرفتار رہیں گے۔“

﴿وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْحَجِيمِ﴾

(الحج: ۵۱)

”اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں (بزعیم خویش) ہمیں عاجز کرنے کے لئے سعی کی، وہ اہل جہنم ہیں۔“

دین کے دوسرے مرجع و دلیل رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا :

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدة: ۶۷)

”اے رسول! جو وحی تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کی گئی ہے، وہ سب لوگوں کو پہنچا دو، اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو آپ نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔“

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ أَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۚ إِنَّا كَفَيْنَاكَ عَنِ الْمُسْتَبِزِّينَ﴾ (الحجر: ۹۴، ۹۵)

”جو حکم تجھے دیا گیا ہے، اسے کھولی کر بیان کر دو اور مشرکوں سے منہ موڑ لو، ہم مذاق کرنے والوں کے مقابلے میں تجھے کافی ہیں۔“

غلبہ اسلام کے حوالے سے مسلمانوں کو کبھی کسی قسم کی خفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، فرمایا:

﴿قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (الأنعام: ۱۴۹)

”کہہ دو! دلیل کامل اللہ ہی کے لئے ہے۔“

﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾

(الاسراء: ۸۱)

”اور کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا، یقیناً باطل نابود ہونے کے لئے ہی ہوتا ہے۔“

﴿بَلْ تَقْذِفْ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمْ الْوَيْلُ

مِمَّا تَصِفُونَ﴾ (الأنبياء: ۱۸)

”بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر دے مارتے ہیں، تو وہ اس کا سر پھوڑ دیتا ہے، تو وہ یکا یک

ناپید ہو جاتا ہے، اور جو باتیں تم بناتے ہو، اس میں تمہاری ہی بربادی ہے۔“

۱۔ رسول اللہ پر ایمان حجیت حدیث و سنت پر ایمان کو مستلزم ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ پر ایمان کا لازمی تقاضا اس کی نازل کردہ کتاب قرآن کریم پر ایمان ہے، کتاب اللہ پر ایمان کے بغیر اللہ پر ایمان کا کوئی مطلب نہیں، ویسے ہی حدیث رسول اللہ ﷺ پر ایمان کے بغیر رسول اللہ ﷺ پر ایمان کوئی حیثیت نہیں رکھتا، حدیث و سنت کی حجیت پر ایمان ایک اہم ترین دینی ضرورت ہے، اسکے بغیر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت پر ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی، یہ ایک ایسا واضح اور دو ٹوک مسئلہ ہے، جس میں کسی بحث و جدل، تنازع اور توقف یا تردد کی گنجائش نہیں ہے، از اول تا آخر پوری امت مسلمہ کا اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ آپ ﷺ نے نبی

اور رسول ہونے کی حیثیت سے جو خبر دی ہے، اس میں آپ معصوم عن الخطاء ہیں، چونکہ اللہ نے آپ کو صادق قرار دیا ہے، تو اللہ کی اس تصدیق کا لازمی نتیجہ ہے کہ نبی ﷺ نے جو خبر بھی دی، وہ اس کے عین مطابق ہے، جو عند اللہ ہے، لہذا اسے قبول کرنا واجب ہے، فرمایا:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم: ۴-۳)
 ”اور وہ خواہش نفس سے نہیں بولتے، وہ صرف وحی ہے، جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے۔“
 نیز فرمایا:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ﴾ (الحاقة: ۴۴، ۴۶)
 ”اور اگر وہ ہم پر اپنی طرف سے کوئی بات کہہ دیتے، تو ہم انہیں دائیں طرف سے پکڑ لیتے، پھر ان کی شرگ کاٹ دیتے۔“

رسول اکرم ﷺ امت کو تمسک بالسنة کا حکم دیتے تھے، اس کی مخالفت سے منع فرماتے اور ڈراتے تھے، صحابہ کرام آپ ﷺ کے جملہ احکام کی تعمیل کرتے، آپ ﷺ کے افعال، اقوال اور تقریرات کی متابعت کرتے تھے، نزول وحی کے زمانے میں فرمان نبوی اور عمل صحابہ کی اللہ کی طرف سے تائید و تقریر وحی منزل کی حیثیت ہی رکھتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَ يُغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ (آل عمران: ۳۱)

”کہہ دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔“

خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي۔“ (متفق علیہ)

”جس شخص نے میری سنت سے بے رغبتی اختیار کی، سو وہ مجھ سے نہیں ہے۔“

اللہ نے اپنے رسول پر ایمان کا واضح حکم دیا اور اس کی اطاعت تمام اہل جہاں پر فرض قرار دی، کیا اس کا لازمی تقاضا نہیں ہے کہ آپ ﷺ معصوم ہیں اور دین و شریعت کے باب میں جو کچھ بھی آپ ﷺ کرتے اور کہتے ہیں، وہ ہمیشہ کے لیے حجت اور دلیل ہے، جس کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے، فرمایا:

﴿فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾

(التغابن: ۸)

”سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر بھی اور اس نور پر بھی جو ہم نے نازل کیا اور اللہ اس سے خوب خبردار ہے، جو عمل تم کرتے ہو۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّهُ وَاتُّمَّ تَسْمَعُونَ﴾ (الأنفال: ۲۰)

”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور اس سے روگردانی نہ کرو، جب کہ تم سن بھی رہے ہو۔“

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ﴾

(آل عمران: ۳۲)

”کہہ دیجئے! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں، تو یقیناً اللہ کافروں کو پسند نہیں فرماتے۔“

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللَّهَ۔“ (متفق علیہ)

”جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔“

یہ حدیث ایک طرف ایسی شخصیت کا فرمان ہے، جو معصوم عن الخطاء نبی اور رسول ہے، نبوت و رسالت کے باب میں جس کی ہر خبر علم الہی کے عین مطابق ہوتی ہے، دوسری طرف یہ کوئی نئی بات بھی نہیں، بلکہ قرآن کریم میں مذکور اللہ تعالیٰ کے ارشادات کا خلاصہ اور ترجمہ ہی ہے، جن کا اوپر ذکر ہوا۔

یہ قرآن کریم کی واضح اور صریح نصوص ہیں، ایسی تصریحات قرآن کریم میں ان کے علاوہ بھی بے شمار ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و اتباع کا تقاضا کرتی ہیں، اور آپ ﷺ کی ذات گرامی کو بحیثیت نبی اور رسول مطاع اور متبوع قرار دیتی ہیں، ان میں سے کسی ایک آیت میں بھی یہ شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کسی خاص زمانے تک محدود تھی، یا اس کا تعلق صرف عہد نبوی اور حیات طیبہ سے تھا، یا یہ اطاعت صرف احکام قرآن پر مقصود تھی، یا آپ ﷺ کے ارشادات کی کوئی خاص قسم واجب الطاعۃ تھی، کتاب و سنت میں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی، جو آپ ﷺ کی اطاعت و اتباع کے عموم کی تخصیص پر دلالت کرتی ہو، اس لئے آپ ﷺ حیات و میتا ہر عہد اور ہر زمانے کے لوگوں کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں ہر طبقے کے لیے واجب الطاعت والاتباع ہیں، حدیث و سنت کی حجیت پر ایمان لا ئے اور اس پر عمل کئے بغیر مذکورہ آیات اور ان میں وارد احکام الہی پر ایمان اور عمل کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ جیسے قرآن کریم کی یہ آیات پینات اپنے نزول سے لیکر ہمیشہ تک واجب الایمان والعمل ہیں، ویسے ہی رسول اللہ ﷺ کی حدیث و سنت پر عمل کے حکم میں دوام و استمرار ہے، جس میں کسی ادنیٰ سی تبدیلی، تنسیخ اور ترمیم کا کسی کو اختیار نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ (الأحزاب: ۳۶)

”اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دیں، تو اس میں انہیں کوئی اپنا بھی اختیار ہو۔“

جب قرآن کریم کے تمام اصول و ضوابط، تعلیمات و ہدایات، اور اوامر و نواہی میں بالاتفاق دوام و ثبات ہے، تو اطاعتِ رسول اور اتباعِ سنتِ نبوی کے قرآنی احکام کو اس سے مستثنیٰ قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس کی کوئی معقول دلیل نہیں، جس کا علم و عقل اور منطق کے میزان میں کوئی وزن ہو، بلکہ یہ صرف ایمان کی کمزوری اور سینہ زوری ہے، جسے چند سرکش انسانوں کی ہواؤں نے جنم دیا ہے، اور انہوں نے اپنی بے عقلی، نااہلی اور پراگندہ ذہنیت کے باعث باطنی افکار اور مستشرقین کی اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں معاندانہ تحقیقات کے زیر اثر رسول اللہ ﷺ کی شخصیت، آپ ﷺ کے مقام و مرتبے اور آپ ﷺ کی حدیث و سنت کے بارے میں ایسا تنازع کھڑا کرنے کی مذموم کوشش کی ہے، جس سے امت کی وحدت پر بدترین اثرات مرتب ہو سکیں اور امت اپنے مرکزِ حقیقی سے کٹ کر پارہ پارہ ہو سکے، اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ ”مرکز ملت“ اور امت کے اجتماعی شعور کے نام پر کیا گیا، لیکن دشمنانِ دین کی یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی، کتابِ اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی روشنی کبھی مدھم نہیں پر سکتی۔ اِنْ شَاءَ اللَّهُ، اللہ کے وعدے سچے اور فیصلے اٹل ہیں، اللہ کا فرمان ہے:

﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۚ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ (الصف: ۸-۹)

”یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے چراغِ ہدایت کو پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے، خواہ کافر اسے ناپسند ہی کریں، وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا، تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے، خواہ مشرک اسے ناپسند ہی کریں۔“

حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ ”اہل قرآن“ کہلاتے ہیں، قرآنی تعلیمات کے علم بردار ہیں، قرآنی ہدایت کی نشر و اشاعت کو اپنا مشن قرار دیتے ہیں، اس کے باوجود قرآن کریم کی اتنی ساری واضح اور صریح آیات پر انکی نظر ہی نہیں پڑتی! مگر قرآن کریم کی درج ذیل تصریح سے یہ حیرت و استعجاب خود بخود ختم ہو جاتے ہیں:

﴿سَأَصْرِفُ عَنْ آيَتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ﴾ (الأعراف: ۱۴۶)

”جو لوگ زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، میں ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا، اگر یہ لوگ ہر آیت کو دیکھ لیں، تو بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور اگر یہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں، تو اسے نہ اپنائیں اور اگر گمراہی کی راہ دیکھ لیں، تو اس راہ کو اختیار کر لیں، ایسا اس لیے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور وہ ان سے غافل ہیں۔“

حق و باطل میں التباس نہیں ہے۔

الوہیت، ربوبیت اور ہر نوع کی عبادت میں اللہ تعالیٰ وحدلہ لا شریک لہ ہے۔ پورے قرآن کریم میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں ملتا، جہاں نبی ﷺ کی اللہ کے

ساتھ عبادت میں شرکت کا ادنیٰ سا شبہ بھی پڑتا ہو، تو اگر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع فرض اور واجب نہیں ہے اور آپ ﷺ کی حدیث و سنت ہمیشہ کے لیے حجت اور دلیل نہیں ہے، تو ان بے شمار واضح اور صریح آیات اور ان میں مذکور اطاعت رسول ﷺ کے بار بار اصرار و تکرار حکم سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کیا راہنمائی فرمانا چاہتے ہیں؟

قرآن کریم تو اللہ نے نازل ہی اس مقصد کے لیے فرمایا ہے کہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو کفر و ضلالت کے اندھیروں سے نکال کر نورِ ہدایت سے نوازنا چاہتا ہے اور اپنے رسول ﷺ کے ذریعے ان پر جادۂ حق واضح کرنا چاہتا ہے، جو اس نے کر دیا ہے، اس میں حق و باطل کے التباس اور شکوک و شبہات پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور قرآن کریم کو رسول اللہ ﷺ سے الگ کر کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے:

﴿كَتَبْنَا إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ﴾ (إبراهيم: ۱)

”یہ ایک کتاب ہے، جسے ہم نے تیری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تو لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے، غالب و قابل تعریف ذات کے راستے کی طرف۔“

لہذا بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اطاعت رسول سے فرار قرآن سے فرار ہے، حدیث و سنت کی حجیت اور اسکے دوام و ثبات اور استمرار سے انکار قرآن حکیم کے معجزہ خالده ہونے کے انکار کے مترادف ہے:

﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ (محمد: ۲۴)

”کیا یہ لوگ قرآن پر غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔“

۲۔ نبی ﷺ کی شخصیت اور منصب رسالت پر ایمان لازم و ملزوم ہیں۔

صفات باری تعالیٰ پر ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کی معتزلہ، جہمیہ اور فلاسفر کے میزان منطق و فلسفہ میں تو کوئی حیثیت ہو سکتی ہے، مگر وحی الہی کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے ہاں میزان عدل میں اس نوعیت کے خود ساختہ ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، زبانی دعویٰ ایمان کو اللہ کے ہاں قبولیت حاصل نہیں ہوتی، فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَهُمْ بِمُؤْمِنِينَ﴾

(البقرة: ۸)

”اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لے آئے ہیں، حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔“

بالکل ایسے ہی خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر ایمان آپ ﷺ کے منصب نبوت و رسالت اور اس کے تقاضوں پر ایمان کے بغیر دین و شریعت کے نقطہ نظر سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس قسم کے دعویٰ ایمان سے منکرینِ حدیث و سنت کے شوقِ آوارگی، شریعت کی حدود و قیود سے آزادی اور آزاد خیال مغربی ثقافت کے دل دادہ مسلمانوں کے ایک خاص طبقے میں مقبولیت کے جذبہ کی تسکین تو ہو سکتی ہے، مگر اللہ رب العزت کے ہاں میزان عدل میں اس سے ایمان بالرسول کے تقاضے قطعاً پورے نہیں ہو سکتے، اسکے لیے تو آپ ﷺ کے مقام نبوت اور منصب رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اور آپ ﷺ کا یہ مقام و منصب تاقیام قیامت قائم و دائم ہے، ”دوامِ حدیث و سنت“ کا یہی معنی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی شخصیت اور آپ ﷺ کا مقام و منصب اعلان نبوت سے آج تک امت مسلمہ میں متفق علیہ رہے ہیں، آپ ﷺ کی حدیث و سنت بھی بالا

تفاقِ حجتِ تسلیم کی جاتی رہی ہے، اس بارے میں مسلمانوں میں کبھی دورائے نہیں رہیں، اگر کہیں کوئی اختلاف نظر آئے گا، تو اس کی بنیاد درآمدی افکار پر ہوگی، البتہ آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو متنازعہ فیہ قرار دینے کے لیے یہود و نصاریٰ بعثتِ نبوی سے ہی مسلسل سعی لا حاصل میں مشغول ہیں، عہدِ اول میں منافقین نے اور پھر منکرینِ حدیث اور ان کے ہم نوا نام نہاد اہل علم نے آنحضرت ﷺ کے بارے میں اس یہودی فکر کو مسلمانوں میں رواج دینے کے لیے بڑی فدویانہ کوششیں کی ہیں، مگر ان کی ان ایمان سوز مساعی رذیلہ کی یہود و نصاریٰ کے ہاں ہی کوئی قدر و قیمت ہو تو ہو، مسلمانوں نے اسے کبھی تسلیم نہیں کیا، جیسے آپ ﷺ کی ذات گرامی مسلمہ شخصیت ہے، ویسے ہی آپ ﷺ کا مقام و منصب، نبوت و رسالت اور آپ ﷺ کی حدیث و سنت بالاتفاق دین و شریعت کا جزو لا ینفک ہے۔ رسول اکرم ﷺ نبی اور رسول بھی ہیں، شارح اور مفسر بھی ہیں، تشریع و تقنین کا حق بھی اللہ نے انہیں عطا فرمایا ہے، اس لیے وہ مظاہر اور متبوع بھی ہیں، حاکم اور قاضی بھی، بشیر و نذیر اور سراج منیر بھی، اہل ایمان کے لیے اسوۂ حسنہ بھی اور پوری انسانیت کے لیے اللہ کی طرف سے رحمۃ للعالمین بھی، اور آپ ﷺ کے ان تمام مقامات و مراتب کے لیے قرآن حکیم حجت قاطع اور برہان ساطع ہے، یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، آپ ﷺ کے حقیقی تعارف کے لیے قرآن کریم اور کتبِ حدیث کے ابواب مناقب، ابواب معجزات اور دلائل نبوت کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے، علاوہ ازیں کتب سیرت نبویہ کے مطالعے سے آپ ﷺ کی شخصیت اور منصب کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں، مستشرقین اور منکرینِ حدیث کی الجھی ہوئی تحریریں شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہیں، ان کی بجائے مخلص اہل علم و عرفان اور اصحابِ یقین و ایمان کی روشن تصنیفات کا مطالعہ دلوں کو جلا اور دماغوں کو ضیاء بخشنے کے کام آتا ہے، عربی زبان پر دسترس نہ ہو، تو اس نیر تاباں کے

ذکر جمیل سے اردو کا دامن بھی مالا مال ہے۔

سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی اور خطبات مدراس، قاضی سلیمان منصور پوری کی رحمة للعالمین، مولانا مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتم اور مولانا صفی الرحمن مبارک پوری کی ”الرحیق المختوم“ تو ہر لائبریری کی زینت اور ہر جگہ دستیاب ہیں، محترم ڈاکٹر فضل الہی رحمہ اللہ کی کتاب ”نبی کریم ﷺ بحیثیت معلم“ بھی مقام نبوت و رسالت سمجھنے کے لیے ایک وقیع علمی و ستاویز اور فکر محذثین کی ترجمان تالیف ہے، جس کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

۳۔ اسوۂ حسنہ پر ایمان بھی حجیت حدیث و سنت پر ایمان کو مستلزم ہے

اللہ رب العزت نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو امت کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا، آپ ﷺ کی ذات پاک اور حیات طیبہ کو انسانی عزت و عظمت اور شرف و وقار اور حیات اسلامی کی مکمل ہیئت کا معیار بنایا، گویا جو شخص آپ ﷺ کی ذات گرامی کو بہترین نمونہ سمجھ کر اس میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتا، اس کی اللہ کے دربار میں رسائی نہیں ہو سکتی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ
وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾ (الأحزاب: ۲۱)

”یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ زندگی ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہے۔“

آپ ﷺ کی حیات طیبہ کو عملی نمونہ سمجھ کر اس کی پیروی کو اللہ نے اپنی محبت کی شرط قرار دیا، فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (آل عمران: ۳۱)

”کہہ دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔“

ان دلائل کے پیش نظر امت اسلامیہ کے تمام ائمہ و فقہاء نے بالاجماع حدیث و سنت کے بارے میں دائمی حجت اور دلیل کا عقیدہ ہی اپنائے رکھا، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ ہدیٰ سب نے اطاعت رسول کو اطاعت الہی قرار دیا، ان میں سے کسی نے بھی اپنی فقہ اور اپنے فتویٰ و اجتہاد کو حجت یا وحی کی طرح نہیں سمجھا اور اسے معصوم عن الخطاء نہیں کہا، اپنے کسی ایسے قول پر کبھی اصرار نہیں کیا، جس کے بارے میں انہیں پتہ چل گیا کہ وہ خلاف سنت ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تو یہاں تک منقول ہے:

”یوشک ان تنزل علیکم حجارة من السماء أقول لكم قال رسول

اللہ وثقولون قال ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما“

”قریب ہے کہ تم پر آسمان سے سنگ باری ہو، میں کہتا ہوں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم کہتے ہو ابو بکر اور عمر نے یوں کہا ہے!“

جس کا مطلب واضح ہے کہ اسوۂ حسنہ صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، حجت صرف آپ ﷺ ہی کے افعال و اقوال اور تقریرات ہیں، نہ ان سے صرف نظر کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی ان کے ہم پلہ کسی کو مقام حاصل ہے، خواہ وہ خلافت علی منہاج النبوة کا امین اور ترجمان خلیفۃ المسلمین اور امیر المؤمنین ہی کیوں نہ ہو، اسی نوعیت اور مفہوم کے متعدد اقوال ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء امت سے بھی ماثور ہیں، جو اجماع امت کی ترجمانی کرتے ہیں، خلافت اسلامیہ کے ادارے اور خلیفۃ المسلمین سے بہتر مرکز ملت کی کیا علامت ہو سکتی ہے، ایسے ہی امت کے دین و

شریعت کے احکام و مسائل کے بارے میں اجتماعی فہم و شعور کی ترجمانی اجماع سے بڑھ کر کس طریقے سے ہو سکتی ہے، اسوۂ حسنہ، اطاعت رسول، محبت سنت اور ”دوام حدیث“ پر ایمان اور عمل خلفاء راشدین کی سنت اور متفق علیہ طرز عمل ہے اور پوری امت کے اہل علم کا اس پر اجماع ہے، لہذا مرکز ملت اور اجتماعی شعور کے علم بردار اہل قرآن کو بھی اسے قبول کر لینا چاہیے، بصورت دیگر قرآن کریم کی درج ذیل آیت کریمہ پر توجہ کی ضرورت ہے، فرمایا:

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ
الْمُؤْمِنِينَ نُفِئْهُ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾

(النساء: ۶۱، ۵۰)

”اور جو شخص ہدایت واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ کے علاوہ کسی راستے پر چلے، جدھر وہ جاتا ہے، ہم اسے ادھر ہی پھیر دیں گے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔“

اور امت کا یہ اجماع عصرِ صحابہ سے تا حال قائم ہے، تاریخ اسلام کے کسی دور میں بھی اس کی مخالفت نہیں کی گئی۔

ختم نبوت، عموم رسالت اور ”دوام حدیث“

سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت انسانی تاریخ کے اس عہد میں ہوئی، جب انسانیت اپنی حراماں نصیبی کی آخری حدود کو چھو رہی تھی، جو دین، اخلاق و آداب، تہذیب و شرافت اور انسانی اقدار کا بدترین عہد زوال تھا، تمام سابقہ آسمانی شریعتیں دست برد زمانہ کا شکار ہو کر ضائع ہو چکی تھیں، ضمیر فروش اور دین فروش مذہبی راہنماؤں اہبار و رہبان (علماء و مشائخ) نے انہیں قرب الہی کے حصول کی بجائے

اپنی شکم پروری کا ذریعہ بنالیا تھا، ان شریعتوں کے اصل نشانات مٹ چکے تھے، آسمانی کتابوں اور ان کی تعلیمات و ہدایات میں تحریف ہو چکی تھی، ان کی روشن کرنیں مدہم پڑھ چکی تھی، انسانی معاشروں میں عملاً ان کے آثار نہ ہونے کے برابر تھے، حتیٰ کہ ان کے حقیقی خدوخال تک رسائی بھی ناممکن ہو چکی تھی، ان حالات میں رسول اکرم ﷺ کی شخصیت کی صورت میں جو آفتاب و ماہتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا، غارِ حرا سے نورِ نبوت و رسالت کی جو کرنیں پھوٹیں اور وحی الہی کے نزول کا آغاز ہوا، وہ دراصل اسی دعوتِ توحید کا تسلسل تھا، جس کی دعوت دینے کے لیے سابقہ تمام انبیاء و رسل اللہ کی طرف سے تشریف لائے تھے اور یہ سابقہ شریعتوں کی تجدید و تکمیل تھی، جس کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرَىٰ مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنَّا تَبِيعُ إِلَّا مَا يُوْحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ (الأحقاف: ۹)

”کہہ دیجئے! میں رسولوں میں سے کوئی نئے انداز کا رسول تو نہیں ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں، جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو صرف واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔“

﴿قَالُوا يَاقَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَى طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (الأحقاف: ۳۰)

”وہ (جن) کہنے لگے: اے ہماری قوم! ہم نے ایک کتاب سنی ہے، جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے، اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، سچے دین اور صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔“

آپ ﷺ رحمۃ اللعالمین تھے، آپ کی نبوت و رسالت پوری انسانیت کے

لیے تھی اور ہمیشہ کے لیے تھی، فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (الأنبياء: ۱۰۷)

”اور ہم نے تو آپ ﷺ کو تمام اہل جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (سبا: ۲۸)

”اور ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لیے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ اس بات کو جانتے ہی نہیں۔“

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ ٱلَّذِى يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهِ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

(الأعراف: ۱۵۸)

”کہہ دیجئے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے لیے آسمان اور زمین کی بادشاہی ہے، معبود برحق صرف وہی ہے، وہی زندگی اور موت عطا کرتا ہے، تو اللہ پر ایمان لے آؤ اور اس کے رسول نبی امی پر بھی، جو اللہ اور اس کے فرامین پر یقین رکھتا ہے اور اس کی پیروی کر لو، تاکہ ہدایت پالو۔“

درج ذیل حدیث نبوی ان آیات کی تفسیر ہے:

((عن جابر بن عبد الله الانصاری رضی اللہ عنہما قال قال النبی ﷺ: كان النبی یبعث إلى قومه خاصة وبعثت إلى الناس عامة)) (اخرجه البخاری فی التیمم، برقم: ۳۳۵)

”ہر نبی کو اسکی قوم کی طرف خاص کر مبعوث کیا جاتا تھا اور مجھے تمام لوگوں کی

طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔“

صحیح مسلم کے الفاظ یوں ہیں:

((بعثت إلى كل أحرر وأسر)) (المساجد، برقم: ۵۲۱)

”اور مجھے ہر سرخ اور کالے کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔“

صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے:

((أرسلت إلى الخلق كافة وختم بي النبيون))

(مسلم: ۵۲۳، عن أبي هريرة)

”مجھے پوری مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہے اور سلسلہ نبوت مجھ پر ختم کر دیا گیا ہے۔“

❶ حضرت محمد ﷺ کی بعثت اور آپ کی نبوت و رسالت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے

ایک طرف دین کی تکمیل فرمائی اور نعمت کو کمال و تمام تک پہنچایا، فرمایا:

﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ أَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾

(المائدة: ۳)

”میں نے آج کے دن تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کی۔“

❷ دوسرے سابقہ شریعتوں اور کتابوں میں جو تحریف اور تبدیلی ہو چکی تھی، اس کی

اصلاح فرمائی، فرمایا:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَ

مُهِمِّنَا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَ لَا تَتَّبِعُ أَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا

جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ﴾ (المائدة: ۴۸)

”اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، اپنے سے پہلی

کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان پر نگران ہے، تو انکے درمیان اس کے

مطابق فیصلہ کرنا، جو اللہ نے نازل کیا ہے، تیرے پاس جو حق آیا ہے، اس کی

بجائے ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا۔“

﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبِيثَاتِ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الأعراف: ۱۵۷)

”اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا اور ان کے بوجھ اور طوق اتارتا ہے۔“

۳۔ تیسرے آپ ﷺ کی ذات گرامی کو سلسلہ نبوت و رسالت کی آخری کڑی اور اس قصر رفیع کی آخری اینٹ قرار دے کر اس سلسلہ کو ختم فرمایا، آپ ﷺ کو خاتم الانبیاء اور آپ ﷺ کی امت کو آخر الامم کے شرف سے سرفراز فرمایا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾ (الأحزاب: ۴۰)

”محمد ﷺ تم سے کسی کے باپ نہیں ہیں اور لیکن اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔“

((عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال مثلي ومثل الأنبياء من قبلي كمثل رجل بنى بنيانا فاحسنه وأجمله إلا موضع لبنة من زاوية من زواياه فجعل الناس يطوفون به ويعجبون له ويقولون هلا وضعت هذه اللبنة قال فأنا اللبنة وأنا خاتم النبيين)) (متفق عليه، بخاری: ۳۵۳۵-مسلم: ۲۱۸۶)

”ابو ہریرہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسے ہے، جیسے کسی شخص نے ایک عمارت بنائی، اس کے حسن و جمال کا پورا اہتمام کیا، مگر اس کے کونوں میں سے کسی ایک کو نے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، لوگ اس عمارت کا چکر لگاتے، اس کے لیے خوشی کا اظہار کرتے اور کہتے کہ یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی؟ آپ نے فرمایا: وہ آخری

ایٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔“

اس آیت اور اس حدیث سے واضح ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں، آپ ﷺ کی بعثت سلسلہ نبوت و رسالت کی تکمیل ہے۔

۴۔ چوتھے اس کی حفاظت کا وعدہ کر کے اسے ہمیشہ کے لیے دوام و ثبات بخشا اور واجب القبول والعمل ٹھہرایا اور بتایا کہ کامیابی کا یہی ایک ذریعہ ہے:

﴿فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (الأعراف: ۱۵۷)

”تو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اسکی رفاقت اختیار کی اور اسکی مدد کی اور اس

نور کی پیروی کی، جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔“

کیا کہیں اشارہ بھی ہے کہ اس ایمان، رفاقت، مدد اور اتباع کی کوئی مدت مقرر ہے؟ یا یہ کسی زمانے تک محدود ہے؟ یا یہ نور ہدایت صرف قرآن کریم تک محدود ہے؟ رسول اللہ ﷺ پر جو کچھ وحی کی صورت میں نازل ہوا، وہ واجب الاتباع اور ذریعہ نجات ہے، وہ کتاب اللہ ہو یا حدیث و سنت۔ رسول اللہ ﷺ۔ کتاب اللہ میں اس کے متعدد واضح دلائل موجود ہیں کہ کتاب اللہ کے علاوہ بھی آپ پر وحی نازل ہوتی تھی، وحی الہی کا یہ مجموعہ ہی انسانی ضروریات کا کفیل ہے، اب انسان علم و فضل، تغیر و ترقی، تہذیب و تمدن، صنعت و تجارت، فہم و فراست اور ادب و ثقافت میں جس قدر بھی وسعت اختیار کر لے، اسکی جسمانی و روحانی تعلیم و ہدایت کی جملہ ضروریات کے لیے اسلام کے دامن وسعت میں کبھی کسی کوتاہی کا احساس نہیں ہوگا، تکمیل دین اور اتمام نعمت کا یہی مفہوم ہے۔

اسلام خاتم الأديان ہے، اس کے بعد کوئی دین نہیں۔

محمد ﷺ خاتم الانبياء ہیں، اسکے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں۔

یہی وہ دینِ کامل ہے، جسے اللہ نے قیامت تک پوری انسانیت کے لیے پسند فرمایا اور تمام اہل ادیان کو حکم دیا کہ وہ اس دین کو قبول کر کے اس میں داخل ہو جائیں، اس لیے کہ اس کے ساتھ اللہ نے سابقہ تمام ادیان منسوخ کر دیئے ہیں، بعثتِ محمدی کے بعد دربارِ الہی میں کوئی دین اسلام کے سوا قابلِ قبول نہیں، فرمایا:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ (آل عمران: ۱۹)

”یقیناً اللہ کے ہاں دین صرف اسلام ہی ہے۔“

دین اسلام کو قبول کیے بغیر انسان کی ہر سعی لا حاصل اور محنت رائیگاں ہے، فرمایا:

﴿وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (آل عمران: ۸۵)

”اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کی جستجو میں رہے، تو اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔“

اسلام میں رسول اللہ ﷺ کی حیثیت، مقام و مرتبہ اجاگر کرنے کے لیے اگلی آیت میں ایسے لوگوں کی ہدایت سے محرومی کا ذکر کیا، جو ایمان لانے اور رسول اللہ ﷺ کی حقانیت و صداقت کی شہادت دینے کے بعد انکار کرتے ہیں اور انہیں اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کے حق دار ٹھہرایا، قرآن کریم نے ایسے لوگوں کی حقیقت واقعہ کی حیرت انگیز تصویر کشی کی ہے، فرمایا:

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ

حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۚ أُولَٰئِكَ

جَزَاءُ هُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾

(آل عمران: ۸۶، ۸۷)

”اللہ ایسے لوگوں کو کیوں کر ہدایت دے، جو اپنے ایمان کے بعد کفر کے مرتکب

ہوئے اور وہ یہ شہادت بھی دے چکے کہ یقیناً رسولِ برحق ہیں اور ان کے پاس روشن دلائل بھی آچکے اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتے، ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ بلاشبہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔“

پیغمبرِ آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کی پیدائش اور بعثت سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء و رسل سے یہ عہد لے لیا تھا کہ اگر وہ آپ ﷺ کے عہد نبوت و رسالت کو پالیں، تو آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور آپ ﷺ کی مدد کریں۔ اس لیے تمام انبیاء کرام اور ان کی امتیں آپ ﷺ کی ذات و صفات سے آگاہ تھے اور ان کی کتابوں میں بھی آپ ﷺ کے اوصاف مذکور تھے، فرمایا:

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّنْ كِتَابٍ وَ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَ لَتَنْصُرُنَّهُ ۚ﴾

(آل عمران: ۸۱)

”اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت دی، پھر تمہارے پاس کوئی ایسا رسول آئے، جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو، تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور اس کی لازماً مدد کرو گے۔“

نیز فرمایا:

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ﴾ (الأعراف: ۱۵۷)

”وہ لوگ اس رسول کی پیروی کرتے ہیں، جو نبی امی ہے، جس کا ذکر وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔“

نبوت و رسالتِ محمدیہ کے اس عموم و شمول، جامعیت و کمال اور دوام و استمرار پر مستزاد اللہ کی طرف سے اس کی حفاظت کا ابدی وعدہ بھی قرآن کریم کی نصِ قطعی سے

ثابت اور ایک حقیقت واقعہ ہے۔

”دوامِ حدیث“ پر ایمان و یقین اور عمل کے بغیر دین اسلام کے یہ وسیع تر محامد و محاسن کیسے صورت گر ہو سکتے ہیں اور رسول کریم ﷺ کے منصب نبوت کی دائمی حیثیت اجاگر ہو سکتی ہے؟ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ایسے دین کامل کا مصدر و مأخذ ہیں، جسے کسی چارہ گر کی ضرورت ہے، نہ کسی رفوگر کی! یہ منزل من اللہ ہے، جسے بھیجنے والا کامل و اکمل، لانے اور پہنچانے والا معصوم عن الخطاء ہے، یہ تو کسی سابقہ آسمانی کتاب اور کسی سابق نبی و رسول کا بھی محتاج نہیں ہے، کسی خود ساختہ مدعی نبوت، مصلح یا شارح کی اسے کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ بعثت محمدی کے بعد سے اسلامی تاریخ کے کسی عہد میں انسانی معاشرے کی ہدایت و راہنمائی کے لیے اسے کبھی کسی مرکز ملت یا کسی ایوان زیریں و بالا کی احتیاج نہیں رہی، یہ تو اصلاح احوال کا نسخہء کیمیا ہے، جب اس میں کسی فساد کا امکان ہی نہیں، تو اسے کسی مصلح کی کیا ضرورت ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے ظہور اسلام کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا یا اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا، اہل نے امت کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا، بلکہ مسائل پیدا کئے ہیں، امت کی فلاح و سلامتی اسی میں ہے کہ وہ کتاب و سنت کو بغیر کسی افراط و تفریط کے بطور دین قبول کرے، اس کے منزل من اللہ اور کامل ہونے پر ایمان لائے، اس پر عمل کرے اور اس کی طرف دعوت دے۔

مگر ختم نبوت، عموم رسالت اور ”دوامِ حدیث“ پر ایمان کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔ جب تک منصب نبوت و رسالت کے دیگر متعدد اوصاف کے ساتھ ان تینوں مذکورہ اوصاف کو غیر مشروط اور عملاً تسلیم نہیں کیا جاتا، امت کی تشکیل مکمل نہیں ہو سکتی، مرکز ملت معرض وجود میں نہیں آ سکتا، اور وحدت امت کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا، جو ہر مخلص اور دردمند مسلمان کی تمنا اور آرزو ہے۔

فرقہ ناجیہ اور طائفہ منصورہ اہل السنۃ والحدیث نبوت و رسالت کے اسی منصب رفیع کو ان وسیع تر معنوں کے ساتھ قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اسکی حفاظت کا علم بردار ہے، یہ دعوت اور حفاظت ان کے اسلاف کی علمی میراث ہے، اللہ کے فضل و کرم سے اسے نصرت الہی بھی حاصل ہے، یقیناً یہ منصب تا قیامت محفوظ بھی رہے گا اور امت کے ہاں مقبول بھی، اِنْ شَاءَ اللہ! رسول اللہ کا فرمان ہے:

((لا تزل طائفة من أمتي ظاهرين على الحق لا يضرهم من حذلهم حتى يأتي أمر الله وهم كذلك)) متفق عليه واللفظ لمسلم

حفاظت دین کے دو طریقے

پہلا طریقہ

دین حق کی حجت، دلیل اور برہان کے غلبے کا سامان اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اس میں کچھ ایسی داخلی شہادتیں رکھ دی ہیں، جن کی صداقت پر کبھی حرف نہیں آیا، وہ متلاشیان حق کو سکون و اطمینان فراہم کرتی ہیں، جس میں قرآن کریم اور حدیث نبوی کا اعجاز سرفہرست ہے، قرآن حکیم میں متعدد ایسی تحدیات ہیں، جن کا جواب کبھی کسی سے نہیں بن پڑا اور نہ کبھی بن پڑے گا، جس میں سب سے اہم اور معروف نظم قرآن کریم کا لفظی اعجاز اور معنوی جامعیت ہے، انہی کے مقابلے کا چیلنج بھی بار بار کیا گیا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے اعجاز حدیث کی ایک دو مثالیں پیش خدمت ہیں

”عن المقدم بن معدي كرب قال قال رسول الله ﷺ ”ألا إني أوتيت القرآن ومثله معه ألا يوشك رجل شبعان على أريكته يقول عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فأحلوه وما وجدتم فيه من حرام فحرموه“ - (رواه أبو داود: ٤٦٠٥)

مقدم بن معدی کرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”خبردار رہو! یقیناً مجھے قرآن بھی عطا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی ہی ایک اور چیز بھی، خبردار رہو! عنقریب ایک شکم سیر شخص اپنے چھپر کھٹ سے یہ دعوت دے گا کہ بس قرآن ہی کو تھامے رکھو، اس میں جو چیز حلال پاؤ، اسے حلال جانو اور جو چیز اس میں حرام پاؤ، اسے حرام جانو۔“ اور ابن ماجہ میں یہ الفاظ بھی ہیں :

”ألا وإن ما حرم رسول الله مثل ما حرم الله“

(ابن ماجہ برقم ۱۲ و ۳۱۹۳)

”خبردار! اللہ کے رسول ﷺ نے جو کچھ حرام قرار دیا ہے، وہ بھی ویسے ہی حرام ہے، جیسے اللہ کا حرام کیا ہوا ہے۔“

”عن أبي رافع قال قال رسول الله ﷺ ”لا ألفين أحدكم متكئاً على أريكته يأتيه الأمر من أمري مما أمرت به أو نهيت عنه فيقول لا أدري ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه“ (أحمد، أبو داود، ترمذی) ابو رافع سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں تم میں ایک شخص کو اس حال میں نہ پاؤں، وہ اپنے چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو، بے را کوئی حکم امر یا نہی کا اس کو پہنچے، تو وہ کہنے لگے کہ میں تو اسے جانتا نہیں ہوں، میں تو بس اسی کی پیروی کروں گا، جو قرآن میں ہم پاتے ہیں۔“

فتنہ انکار حدیث جو مختلف ناموں سے رونما ہوا ہے، اس کا ایک روشن اور واضح عکس اعجاز حدیث کے اس شفاف آئینہ میں نظر آ رہا ہے، کس قدر صاف اور صریح الفاظ میں کا شانہ نبوت سے اس پیش گوئی کے ذریعے سے امت کو آگاہ کیا گیا کہ امت مسلمہ کی طرف نسبت رکھنے والے ہی کچھ شقاوت نصیب افراد اٹھ کھڑے ہوں

گے، جو کہیں گے، ہمیں بس قرآن ہی کافی ہے اور حدیث سے ہم مستغنی ہیں۔

”شعبان“ (شکم سیر) اور ”متکنا علی اریکته“ (چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے ہوئے) کے الفاظ سے جس مزاج اور ذہنیت کا نقشہ رسول اللہ ﷺ نے کھینچا ہے، منکرین حدیث کے سرغٹوں اور اس فتنہ کے بانیوں کو جو اہل علم جانتے ہیں، وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا واقعاتی اور عملی مصداق وہی لوگ ہیں، جو علم ناقص، عقل سقیم، تلاش حق سے بے اعتنائی، خود بینی اور خود پسندی کے مخصوص نشان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ حدیث پر ویزی معیار تحقیق کے مطابق صحیح بھی ہے۔

ان احادیث نبویہ میں اس قدر واضح معجزانہ خبریں ہیں کہ ان کے انکار کی کوئی صورت نہیں ہے، حیرت ہے کہ پھر بھی حراما نصیبوں کو ہدایت میسر نہ آئی! صدق اللہ حیث قال:

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾

(الحج: ۴۶)

”بات یہ ہے کہ چہرے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ دل جو سینوں میں ہیں، وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔“

احادیث مذکورہ میں نبی ﷺ کے مقام و مرتبہ اور امر و نہی اور تحلیل و تحریم کے باب میں آپ کے فرامین کی جیت جس طرح بیان ہوئی ہے، قرآن کریم میں بھی آپ ﷺ کا مقام و مرتبہ اور حیثیت بعینہ اسی طرح بیان ہوئی ہے، فرمایا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾ (التوبة: ۲۹)

”ان لوگوں سے جنگ کرو، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اسے حرام نہیں سمجھتے، جسے اللہ نے حرام کیا ہے اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔“

دوسرے مقام پر آپ ﷺ کے فرائض منصبی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾

(الأعراف : ۱۵۷)

”اور وہ پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔“

عصر حاضر میں ظہور پذیر ہونی والی ایک حقیقت واقعہ کی وضاحت اور صدیوں قبل اس کی خبر کا حدیث میں ذکر ہونا حجیت حدیث کی داخلی شہادت ہے، جو اہل الحدیث کے حق میں اور منکرین حدیث کے خلاف برہان ساطع ہے۔ والحمد للہ علی ذلک

حفاظت دین کا ایک طریقہ تو یہ ہے، جس کا ذکر اوپر ہوا ہے کہ اس میں ذاتی اور داخلی قوت ہی اتنی مستحکم ہے کہ اس کے خلاف کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی اور اس کی طبیعت ہی اپنے اوپر کسی کا غلبہ قبول کرنے والی نہیں ہے۔

حفاظت دین کا دوسرا طریقہ

یہ اختیار فرمایا گیا کہ اس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے کچھ ایسی طاقت ور علمی، فکری اور عملی اعتبار سے مضبوط اور قابل اعتماد محافظ شخصیات پیدا فرمائیں، جن کی زندگی کا مقصد وحید ہی دین کی حفاظت تھا، جن کا طبعی ذوق اور بھنی میلان ہی اس کام کے لئے انتہائی مفید اور مناسب تھا، یوں لگتا ہے کہ وہ لوگ پیدا ہی اس کام کے لئے کئے گئے تھے اور انہوں نے اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ اپنی تمام استعدادات اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر دین کی حفاظت کا ایسا بندوبست کیا اور اپنی بہترین فکری و عملی قوتوں کی بدولت دین کی عقیدہ و عمل کی سرحدوں اور اس کے حقیقی اور اصلی دونوں سرچشموں کتاب و سنت کے الفاظ و مہنوں اور

معانی و مفاہیم کے تحفظ کا ایسا بے نظیر اہتمام کیا کہ ان میں کسی ادنیٰ سے تغیر و تبدل اور غلطی کو برداشت کرنا بھی ان کی طبائع پر گراں گزرتا تھا، اور حفظ دین کا یہ طریق مسلسل و پیہم امت کے اعلیٰ ترین افراد کا ر کے ذریعے ہمیشہ جاری رہا اور اس کے لئے اللہ نے ایسا ظاہر و باہر انتظام فرمایا، جو بذات خود دین کی حقانیت و صداقت کی ایک حجت و دلیل ہے، مثلاً:

الف۔ ائمہ ہدیٰ کی تجدیدی مساعی

امت کو دین کی حفاظت کی نوید رسول اللہ ﷺ نے درج ذیل الفاظ میں دی :

عن أبي هريرة فيما أعلم عن رسول الله ﷺ قال "إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها"۔

(رواہ أبو داود : ۴۲۹۱)

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے شروع میں ایسے لوگ پیدا فرماتا رہے گا، جو اس کے لئے اس کے دین کی تجدید کرتے رہیں گے“۔

یعنی حفاظت دین کے لئے تجدیدی مساعی سرانجام دیتے رہیں گے، اور دین اسلام کے نشانات اور معالم کبھی مٹنے نہیں پائیں گے، نہ ہی لوگوں کے ہاں اس کے احکام و مسائل سے اجنبیت پیدا ہوگی، بلکہ دین ہمیشہ تروتازہ اور روشن رہے گا، کوئی اس کے الفاظ و معانی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر پائے گا، اگر کوئی شکوک و شبہات پیدا کرے گا اور اس کے خلاف دھول اڑانے کی کوشش کرے گا، تو اللہ کا وعدہ ہے کہ اس کی اصل شکل کو پھر سے لوگوں کے سامنے اجاگر کرنے کے لئے ہر صدی میں مجددین میدانِ عمل میں آتے رہیں گے، جن کی تجدیدی مساعی کی بدولت تاقیامت دین اپنی اصل حالت میں محفوظ و مصون رہے گا، الحمد للہ ائمہ ہدیٰ، علماء و فقہاء اور محدثین کرام کی دین کے لئے تجدیدی مساعی کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے، جس کے نتیجے میں

کتاب وسنت کے الفاظ ومعانی بعینہ عہد نبوی کی طرح تروتازہ اور محفوظ ہیں۔

ب۔ محدثین کرام کے کارنامے

اس پر مستزاد دین کے اس مبارک علم کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اہل علم کو توفیق سے نوازنے کا وعدہ بھی اپنے حبیب ﷺ کی زبان مبارک سے فرمایا ہے، حدیث میں ہے :

عن أسامة بن زيد عن النبي ﷺ أنه قال: "يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين"۔ (رواه الدارقطني)

اسامہ بن زید سے مروی ہے، وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہر آنے والی نسل میں سے عادل لوگ اس علم کو حاصل کرتے رہیں گے، جو اس سے غالی لوگوں کی تحریفات کی نفی کرتے رہیں گے، اہل باطل کی خود ساختہ تلیسیات اور جاہلوں کی تاویلات کا ازالہ کرتے رہیں گے۔"

اس پیش گوئی کے عین مطابق پوری اسلامی تاریخ میں کبھی کوئی دور ایسا نہیں گذرا، جب اہل علم کی ایک معقول تعداد ایسی موجود نہ رہی ہو، جو کتاب وسنت کی لفظی ومعنوی حفاظت کا فریضہ ادا کرنے کی اہل ہو، بلکہ ہر دور میں ایسے علماء کی ایک بڑی تعداد اس استعداد کے ساتھ موجود رہی اور اس نے اپنے آپ کو اس مقدس اور مبارک کام کے لئے وقف بھی کیے رکھا، اللہ کے فضل و کرم سے رسالتِ نبوی ﷺ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ایک بھی حدیث امت کے علم سے محو نہیں ہونے پائی اور ذخیرہ حدیث میں ایک بھی موضوع حدیث داخل نہیں کی جاسکی، آپ ﷺ کا کوئی ایک بھی مبارک عمل امت کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو پایا اور نہ ہی ہزار کوششوں

کے باوجود امت کو آپ ﷺ کے اقوال و افعال سے برگشتہ کرنے میں کوئی کامیابی حاصل ہو سکی ہے۔

اسوہ حسنہ کی حفاظت اور اسکی روشنی میں اسلامی تعلیمات اور نظام زندگی کی ترتیب و تدوین محدثین کرام کا ایک بڑا کارنامہ ہے، جو انہوں نے صحاح ستہ کی شکل میں سرانجام دیا اور امت نے اسے قبول کیا، اور اسکے ساتھ منقول علم کلام کی روشنی میں انہوں نے فرق ضالہ کا استیصال بھی کیا، جن کے پیش نظر:

- ① وحی سے اعتماد اٹھانا اور اسے مشکوک بنانا تھا، جیسے روافض کا طرز عمل ہے۔
- ② عقل کی روشنی میں اس کی من مانی تاویل جو انکار کا ایک طریقہ ہے، جیسے جہمیہ و معتزلہ کے افکار ہیں۔

③ نبوت کا مقام کم کر کے احادیث کا جزوی انکار، جیسے خوارج و قدریہ کے نظریات ہیں۔

امام بخاری نے بالخصوص ان سب کا محاسبہ کیا۔ اس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے صرف حدیث ہی نہیں، دین کی علمی و فکری اور عملی حفاظت کا کارنامہ بھی انجام دیا، امت میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔

پھر ابن تیمیہ اور ان کے مدرسہ فکر نے انہی کے منہج اور اصولوں کی روشنی میں انکا ایسا تعاقب کیا کہ اس کے بعد زیر زمین انکا کام اور بوسیدہ کتابوں میں انکا نام تو ملتا ہے، مگر انکا وجود اور انکی شناخت ان کے ناموں سے مسلم معاشروں میں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے، حالانکہ ہمیشہ حکومتوں نے ان کی سرپرستی اور ان کے افکار کی آبیاری بھی کی، مگر اللہ کا فیصلہ ہے:

﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَ أَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ﴾ (الرعد: ١٧)

”پھر جو جھاگ ہے، سو بے کار چلا جاتا ہے اور رہی وہ چیز جو لوگوں کو نفع دیتی ہے، سوزمین میں رہ جاتی ہے، اسی طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے۔“

بعد کی صدیوں میں ان میں کوئی نامور ہوا اور نہ کسی کا کام متعارف ہوا، اگر ان میں سے کسی کی شہرت باقی ہے، تو کتاب وسنت کی خدمت کی بدولت ہے، اپنے باطل افکار کی وجہ سے نہیں اور وہ لوگ مسلم معاشروں سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔

طلبہ علم خاطر جمع رکھیں، دور حاضر کے معتزلہ اور یورپ زدہ مدعیان علم و تحقیق بھی حکومتی حمایت کے بل بوتے پر عوامی سطح پر تو رقص کر سکتے ہیں، بگڑے ہوؤں کو مزید بگاڑ سکتے ہیں، مگر اہل ایمان کے دلوں میں جگہ نہیں بنا سکتے، اللہ کی بجائے چڑھتے سورج کے یہ پجاری غروب آفتاب کے ساتھ ہی غرق آب ہو جائیں گے، پھر ان کے جان لیوا تو بہت ہونگے، مگر نام لیوا کوئی نہیں ہوگا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا

فَإِنَّمَا يَسِرُّهُ بِلِسَانِكَ لَتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لِّدَارِكٍ﴾

”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، عنقریب ان کے

لیے رحمن محبت پیدا کر دے گا۔ سو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم نے اسے تیری

زبان میں آسان کر دیا ہے، تاکہ تو اس کیساتھ متقی لوگوں کو خوشخبری دے اور اس

کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرائے، جو سخت جھگڑا لو ہیں۔“

قطب الرجال کے اس دور میں بھی جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، حدیث سے متعلقہ جملہ علوم و فنون کے ماہرین دنیا بھر میں بمقدار وافر موجود ہیں، بلکہ بمصدق حدیث نبوی ”إِنَّ اللَّهَ يَنْصُرُ هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ“ عصر حاضر میں تو بعض کفار بھی حدیث نبوی کی خدمت میں مسلمانوں کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، خواہ ان کی

نیت فاسد ہی کیوں نہ ہو، یہ بد نصیبی صرف نام نہاد مسلمانوں کے ایک گروہ کے حصہ میں ہی آئی ہے کہ وہ لوگوں کو یہ باور کرانے میں مصروف ہیں کہ ہم کتاب اللہ کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے سنت و حدیث نبوی کے محتاج نہیں ہیں، ان کا اصل مقصد لوگوں کو دین سے برگشتہ کرنا ہے، سچ فرمایا اللہ نے:

﴿فَإِنَّهُمْ لَا يَكْدِبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بَيَّاتٍ اللَّهُ يَجْحَدُونَ﴾

(الأنعام : ۳۳)

”سو یقیناً یہ لوگ تجھے نہیں جھٹلا رہے، لیکن ظالم لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔“

ج۔ حفظ دین کے لئے طائفہ منصورہ کی لازوال خدمات

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے مصادر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی علمی و عملی حفاظت کے لئے ایک ایسی جماعت کے وجود کی خوش خبری بھی اپنے رسول کے ذریعے اپنے بندوں کو دی، جو مسلسل و پیہم با استمرار اس دین پر قائم و دائم اور عمل پیرا رہے گی، انہیں اس پر کار بند رہنے کے لئے نصرت الہی بھی حاصل ہوگی، جس کی بدولت وہ کبھی بے یار و مددگار ہوگی اور نہ ہی اس کے مخالفین انہیں دینی امور میں کوئی نقصان پہنچا سکیں گے۔

حفاظت دین کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کی کس قدر ڈھارس بندھا کی کہ وہ خاطر جمع رکھیں اور کتاب و سنت اور اس پر عمل کی حفاظت کے بارے میں مطمئن رہیں، اس میں کبھی خلل نہیں آئے گا، جہاں افراد و افراد اس کی حمایت و تائید کے لئے کمر بستہ رہیں گے، وہاں ایسے افراد سے ایک جماعت بھی تشکیل پائے گی اور ہمیشہ برسر کار رہے گی، فرمایا:

عن معاوية قال سمعت النبي ﷺ يقول: "لا تزال طائفة من أمتي

قائمة بأمر الله لا يضرهم من خذلهم أو خالفهم حتى يأتي أمر الله

وهم ظاهرون على الناس“۔ (بخاری: ۳۶۴۱، مسلم: ۱۰۳۷)

حضرت معاویہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ ”میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم رہے گی، نہ انہیں اکیلا چھوڑ کر کوئی ان کا نقصان کر سکے گا اور نہ ان کی مخالفت کر کے ان کا کچھ بگاڑ سکے گا، حتیٰ کہ قیامت آجائے گی اور انہیں لوگوں پر غلبہ حاصل رہے گا“

اسی جماعت کے منج کو اللہ تعالیٰ نے ”سبیل المؤمنین“ کہا ہے، اور اس کی مخالفت کو اپنے عذاب کا موجب ٹھہرایا ہے۔ (النساء: ۱۱۵)

امام بخاری رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق یہ طائفہ منصورہ ”اہل العلم“ کی جماعت ہے، یہ پیش گوئی بھی نبی ﷺ کے دلائل نبوت میں سے ہے، جو من وعین پوری ہو رہی ہے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی ان داخلی شہادتوں سے یہ امر واضح ہے کہ حدیث و سنت مکمل طور پر محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی، یہ اللہ کی حفاظت میں ہیں اور اللہ نے ان کی حفاظت اور دوام کا وعدہ اپنے بندوں سے کیا ہوا ہے اور اللہ سے بڑھ کر وعدے پورے کرنے والا کوئی نہیں ہے :

﴿وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ﴾ (التوبة: ۱۱۱)

اہل علم کی جدوجہد تو محض ایک شرف ہے، جو اللہ نے انہیں بخشا ہے، جس کے نتیجے میں دنیا میں انہیں نصارت اور تر و تازگی حاصل ہوگی اور آخرت میں اپنی منزل جنت تک رسائی آسان ہوگی، إن شاء اللہ!

ایسے ہی اہل جہل و عناد کی سعی نامشکور قطعاً بے سود اور ان کے خلاف ایک حجت ہے، جس کے نتیجے میں وہ دنیا میں ذلت و رسوائی کا شکار ہو گئے اور آخرت میں مبتلا عذاب ہو گئے۔

دوامِ حدیث

زیر نظر کتاب ”دوامِ حدیث“ ان مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے، جو طویل مدت تک حضرت العلام حافظ محمد محدث گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم معجزِ رقم سے نکلتے رہے، اس کا آغاز انہوں نے غالباً سب سے پہلے مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے ہفت روزہ جریدہ ”الاعتصام“ میں اپنے ان وقیع مقالات کی اشاعت سے کیا تھا، اس کے بعد یہ سلسلہ ایک مختصر مدت کے لیے برصغیر کی علمی، ادبی، تحقیقی تاریخ کے مایہ ناز اور یادگار ماہنامہ ”حقیق“ لاہور میں اشاعت پذیر ہوتا رہا، جو موصوف کے تلمیذ رشید محدث ابوالطیب محمد عطاء اللہ حنیف رحمۃ اللہ علیہ کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا، پھر جب علامہ احسان الہی ظہیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ماہنامہ موقر مجلہ ”ترجمان الحدیث“ لاہور کا آغاز فرمایا، تو طویل مدت تک یہ مقالات مسلسل اس کی زینت بنتے رہے۔

دفاع عن السنۃ کے باب میں یہ ایک انتہائی قابلِ قدر دستاویز ہے، اس کے مولف و مرتب جہاں اپنے عہد میں طائفہ منصورہ کے سرخیل تھے، وہاں حدیث اور علومِ حدیث میں انہیں بلا شک مجدد کا مقام بھی حاصل تھا، کتاب و سنت کی نشر و اشاعت، تعلیم و تدریس اور فہم و معرفت، بدعات کی اصلاح اور حدیث و سنت کے دفاع کے اعتبار سے وہ نادر روزگار اور تابعدارِ عصر شخصیت تھے، ان کے عہد میں ان جیسا کسی نے کوئی دوسرا دیکھا ہوگا اور نہ ہی انہوں نے خود اپنے جیسا کوئی دیکھا ہوگا، انہیں بیہقی زماں مولانا ابوسعید محمد شرف الدین محدث دہلوی (متوفی ۱۳۸۱ھ، ۱۹۶۱م)، مجتہد العصر، فقیہ دوراں مولانا حافظ عبد اللہ محدث روپڑی (متوفی ۱۳۸۴ھ، ۱۹۶۴م)، محدث القرون الاخیرہ علامہ محمد ناصر الدین البانی (متوفی ۱۳۲۰ھ، ۱۹۹۹م)، مفتی اسلام مسماحہ الشیخ عبد العزیز بن باز (متوفی ۱۴۲۰ھ، ۱۹۹۹م) جیسے ائمہ ہدی کی محاصرت کا شرف حاصل ہے، جن میں سے ہر ایک بڑے علمی

مقام پر فائز تھا اور ان سب نے ہی دفاعِ سنت کے لئے خدمات سر انجام دیں۔ جزاہم اللہ خیراً!

ایسے عظیم لوگوں کے عہد میں علوم و فنون کی ریاست کا شرف کوئی معمولی بات نہیں، وہ حجة الاسلام اور آية من آیات اللہ تھے، بالخصوص ہر چیز میں اپنی مثال آپ تھے۔

شیخ الكل في الكل میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) کے بعد حافظ صاحب مرحوم سے بڑھ کر طلبہ علم حدیث کسی کو میسر نہیں آئے، ان کا حلقہ درس پورے عالم اسلام میں پھیلا ہوا تھا، ان کے تلامذہ میں علم و فضل، زہد و تقویٰ اور علمی ثقاہت و فقاہت کے اعلیٰ پایہ کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

حفاظت حدیث کے لیے قدرت الہی کا حسن انتظام دیکھئے کہ مجدد العلوم الاسلامیہ نواب سید صدیق حسن خان قنوجی نے ۱۳۰۷ھ میں انتقال کیا، ناشر الوحیین شیخ الكل میاں نذیر حسین محدث دہلوی نے ۱۳۲۰ھ میں وفات پائی، اور حضرت العلام امام العصر حافظ محمد محدث گوندلوی کی ولادت باسعادت ۱۳۱۵ھ میں ہوئی اور انہوں نے ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں وفات پائی۔

ہر صدی اور ہر علاقہ میں ایسی شخصیات کا وجود طائفہ منصورہ پر اللہ کا خاص الخاص فضل و احسان اور رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ بالا پیش گوئی کا صحیح ترین مصداق ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذلک!

مختصر حالات زندگی

ابو عبد اللہ حافظ محمد اعظم بن فضل الدین گوجرانوالہ کے قریب موضع گوندلانوالہ میں ۱۳۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں مکتب کی تعلیم کے ساتھ ہی قرآن کریم حفظ کر لیا تھا، نو برس کی عمر میں والد گرامی کے سایہ سے محروم ہو گئے، جو طاعون کی بیماری میں

شہید ہو گئے تھے، تیرہ برس کی عمر میں تحصیل علوم کے لئے سفر کیا اور امرتسر چلے گئے، وہاں انہوں نے امام عبد الجبار غزنوی رحمہ اللہ کے علاوہ مولانا عبد الاول غزنوی اور مولانا عبد الغفور غزنوی سے بھی حدیث و تفسیر کے علوم حاصل کئے۔ دیگر علوم و فنون کی کتابیں مولانا محمد حسین ہزاروی سے پڑھیں، امرتسر میں مشائخ غزنویہ سے کسب فیض کے بعد وزیر آباد میں استاذ پنجاب حضرت حافظ عبد المنان رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۳۲ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے، درس حدیث لیا اور سند و اجازت روایت حاصل کی، جو اپنے دور کی سب سے عالی سند تھی، جس کے ذریعے مرحوم دو واسطوں سے امام شوکانی کے شاگرد ہیں۔ اس پر علمی تشنگی باقی رہی، تو مرکز علوم دہلی کا سفر اختیار کیا، وہاں مولانا احمد اللہ محدث دہلوی، مولانا عبد الرحمن پنجابی اور مولانا عبد الرزاق پشاوروی سے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کی اور طبیہ کالج دہلی سے طب و حکمت کی تعلیم حاصل کی اور مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

صرف ۲۲ برس کی عمر میں جملہ علوم و فنون متداولہ سے فراغت حاصل کر کے واپس اپنے گاؤں گوندل انوالہ ضلع گوجرانوالہ تشریف لائے اور تدریس کے ساتھ ساتھ ائمہ اسلام ابن تیمیہ، ابن قیم، شاطبی، احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل جیسے لوگوں کی کتب کے مطالعہ میں مشغول رہے، جس کی بدولت جلد ہی وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، ۳۰ برس کی عمر میں ان کا شہرہ پورے عالم اسلام میں ہو چکا تھا۔

حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف، حضرت مولانا حافظ ابوالحسن عبد اللہ بڑھیمالوی، حضرت مولانا حافظ عبد الرحمن صافوی، حضرت مولانا حافظ اسحاق لاہوری، حضرت مولانا حافظ محمد بھٹوی ان سے کسب فیض کر چکے تھے، حضرت مولانا عبید اللہ رحمانی، مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی، حافظ محمد تنخی عزیز میر محمدی، مولانا محمد تنخی شرقپوری، حافظ

عبد المنان نور پوری اور حافظ ثناء اللہ مدنی جیسے مؤلفین، مدرسین اور دعاۃ ان کے حلقہ درس سے مستفید ہوئے۔

عالم اسلام کی سب سے بڑی دانش گاہ مرکز اسلام مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کے استاذ حدیث بھی رہے، اس کے ساتھ متعدد دقیع علمی اور بلند پایہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جن میں درج ذیل بالخصوص قابل ذکر ہیں:

۱۔ الإصلاح (۳ اجزاء، رد بدعات)

۲۔ تحفة الاخوان (علم الکلام)

۳۔ تنقید المسائل (بعض معاصرین کے فکری انحراف کا ناقدانہ جائزہ)

۴۔ خیر الکلام فی وجوب الفاتحة خلف الإمام

۵۔ التحقيق الراسخ فی أن أحادیث الرفع ليس لها ناسخ

۶۔ إثبات التوحيد (رؤیسمائیت)

۷۔ بغية الفحول فی شرح مختصر الأصول (شلہ اسماعیل شہید کے رسالہ کی شرح ہے)

مرحوم کی مطبوعہ و مخطوطہ مولفات کی تعداد ۱۸ کے قریب ہے۔ حضرت حافظ

صاحب نے ۱۴ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ۴ جون ۱۹۸۵ء میں ۹۰ برس کی عمر

میں وفات پائی۔ بروایت حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ حضرت حافظ صاحب

سے پچاس برس تک کبھی تکبیر تحریر نہ فرماتے تھے، مرحوم نماز باجماعت کا ایسا اہتمام

کرتے کہ اس کی مثال ملنا دشوار ہے، ان جیسا صافی القلب اور عقیف اللسان کم ہی

کسی نے دیکھا ہوگا، اللہم اغفر له وارحمه

”دوامِ حدیث“

مرحوم حافظ صاحب کی نہایت معرکتہ الآراء علمی خدمت ہے، جو اپنے باب میں

اپنی مثال آپ ہے، جو لوگ آپ کو علم کا کباڑ خانہ اور غیر مرتب خزانہ کہتے ہیں، یہ

انتہائی مرتب کتاب ان کے منہ پر طمانچہ ہے، یہ اہل علم کے لئے بیش قیمت علمی تحفہ اور اہل ایمان کے لئے شفاء الصدور ہے، حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا ہر صفحہ علم کا بحرِ خار ہے۔

بارگاہِ الہی میں التجا ہے کہ جیسے اس نے مؤلف کی شخصیت کا فیضانِ علم عام کیا ہے، ویسے ہی ان کی اس کتاب کو بھی شرفِ قبولیت سے نوازے اور ان کی درجات کی بلندی کا باعث بنائے، اس کی بدولت امت کے دین کے بارے میں فہم و شعور میں استقامت پیدا فرمائے، اہل ایمان کے یقین میں اضافہ کا ذریعہ بنائے اور اہل تشکیک کی ہدایت کا سامان بنائے۔ مصنف کے اخلاص و للہیت اور حسنِ عمل کے پیشِ نظر دربارِ الہی سے یہ امید بر آنے کی توقع رکھی جاسکتی ہے، و ما ذلک علی اللہ عزیز عزیز گرامی قدر حافظ شاہد محمود سلّمہ اللہ نے اسے جمع کیا، احادیث کی تخریج کی، حسبِ ضرورت حواشی لکھے، ترتیب دی اور جو کچھ کیا خوب سلیقے سے کیا، حق یہ ہے کہ انہوں نے طلبہِ علم پر بڑا احسان کیا، جو ان کے لئے اتنا عظیم الشان علمی تحفہ کتابی شکل میں پیش کر دیا اور مرحوم حافظ صاحب کے تلامذہ اور ان کے علوم کے خوشہ چینوں کے لئے یہ دستاویز مرتب کر دی، جس سے منکرینِ حدیث اور ملحدین کے پیدا کردہ قمامِ شکوک و شبہات کا ازالہ ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ وہ عزیز گرامی کو اخلاص کی دولت سے نوازے اور ایسے مزید علمی کارنامے سرانجام دینے کی توفیق بخشے اور انہیں اجرِ جزیل عطاء فرمائے۔

موصوف جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فاضل، علم و دوست، سلجھے ہوئے تجوالِ سال صاحبِ علم ہیں، ہمارے نہایت محبوب و محترم اور ہر ذلِ عزیز مرحوم دوست، معروف شاعر و اہل قلم اور مربی و مصلح حافظ وقاری نعیم الحق نعیم (متوفی ۱۹۹۹ م) سابق مدیر ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، کے عزیز و قرابت دار، ان کی عزت

ووقار کے امین و پاسدار ہیں اور سیرت و صورت میں بھی بڑی حد تک ان کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، ہر اعتبار سے ان کی بہترین یادگار ہیں، ہماری اور مرحوم کے ہم جیسے بے شمار ارادت مندوں اور دوستوں کی امیدوں کا مرکز ہیں۔

جہاں ہماری ڈھیروں مخلصانہ وعائیں ان کے ساتھ ہیں، وہاں بے شمار علمی تمنائیں بھی ان سے وابستہ ہیں، امید ہے کہ وہ ان کی پاسداری اور اپنے ”عہدِ الفت“ سے وفاداری کریں گے۔ **إِنْ شَاءَ اللّٰهُ وَفَّقَهُ اللّٰهُ لِمَا يَخْبَهُ وَيَرْضَاهُ**

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر رحمۃ اللہ علیہ

اسلام آباد

۶ شعبان ۱۴۲۸ھ، ۲۰/ اگست ۲۰۰۷

تقریظ

حافظ عبدالحمد ازہر رحمۃ اللہ علیہ

الحمد لله رب العلمين، أنزل على عبده الكتاب ليبين للناس ما
نزل إليهم ولعلهم يتفكرون، والصلاة والسلام على البشير
النذير سيد الأنبياء وخاتم المرسلين نبينا محمد وعلى آله الطيبين
الطاهرين وأزواجه أمهات المؤمنين وصحبه أجمعين ومن تبعهم
بإحسان إلى يوم الدين -

وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمدا
عبده ورسوله -

اللَّهُم صل على محمد النبي الأُمِّي وأزواجه أمهات المؤمنين
وذريته وأهل بيته كما صليت على آل إبراهيم إنك حميد
مجيد، أما بعد :

اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ اور مقبول دین صرف اسلام ہے۔ اور اسلام کا قصر
بریع و جمیل اللہ رب العزت کی نازل کردہ کتاب ہدی اور حدیث و سنت مطہطی علیہ السلام کی
اساس محکم اور اصل ثابت پر استوار ہے۔ کتاب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم ترین
بندے اور آخری رسول حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل فرمایا اور اس کا
سلسلہ اسناد یوں بیان فرمایا:

﴿وَإِنَّهُ لَكَنَزُّرِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى

قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ﴿١﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ﴿٢﴾

(الشعراء: ۱۹۳-۱۹۵)

”اور یہ کتاب پروردگار عالم کی نازل کردہ ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترتا ہے، یعنی اس نے اسے تمہارے دل پر رالقاء کیا، تاکہ تم (منصب رسالت کے عالی مقام حاملین) ڈر سنانے والوں میں سے ہو جاؤ۔“

اللہ تعالیٰ کی آخری اور افضل ترین کتاب بھی کتب سابقہ کی طرح عوام الناس پر براہ راست نازل نہیں ہوئی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور سنت محکمہ کے مطابق حضور ختمی مرتبت، رسول امی ﷺ پر نازل ہوئی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ اس عالم اسباب میں انسانیت کو لاحق امراض مزمنہ کا علاج شافی اس کے سوا نہ تھا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُولٌ مِنَ اللَّهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُطَهَّرَةً فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ﴾

(البینۃ: ۱-۳)

”کافر یعنی کتابی اور مشرک کفر سے باز آنے والے نہ تھے، جب تک کہ ان کے پاس واضح دلیل نہ آجاتی، یعنی اللہ کی طرف سے رسول جو پاک اوراق کی تلاوت کرتا ہے، جن میں محکم فرائض ہیں۔“

جناب رسول اللہ ﷺ کا وظیفہ صرف تلاوت آیات تک محدود و منحصر نہیں، بلکہ ان کی تعلیم و توضیح اور ان پر عمل کی صورت بیان کرنا بھی ان کے فرائض میں شامل ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَمَيِّ ضَلَالٍ﴾

﴿مُبِينٍ﴾ (الجمعة: ۲)

”وہی ہے جس نے امتوں میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمایا، جو ان کے سامنے اس کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تذکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔“
 بلکہ جناب رسالت مآب ﷺ پر کتاب نازل کرنے سے مطلوب و مقصود بھی یہی تھا کہ آپ قرآن کی علمی تفسیر اور عملی تعبیر بیان کریں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (النحل: ۴۴)

”اور ہم نے تم پر یہ کتاب اس لئے نازل کی کہ جو ارشادات لوگوں کیلئے نازل ہوئے ہیں، تم انہیں کھول کر بیان کر دو، تاکہ وہ غور کریں۔“
 اور یہ حقیقت بھی قرآن مبین نے مکمل وضاحت کے ساتھ بیان فرمادی ہے کہ قرآن ہی کی طرح اس کا بیان و تفسیر اور حکمت یعنی اس کی صورت ثقیل بھی بذریعہ وحی نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے اس کی بھی تلاوت و تبلیغ فرمائی، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ (القیمة: ۱۶-۱۹)

”تو (دورانِ وحی) اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دے کہ اس کو جلدی حاصل کر لے، بلکہ بلاشبہ اس کو جمع کرنا اور اسے آپ سے پڑھوانا ہمارے ذمے ہے، اس لئے جب ہم وحی پڑھا کریں، تو تم اس کو سنا کرو، پھر اس کا بیان اور تشریح بھی ہمارے ذمے ہے۔“
 نیز فرمایا :

﴿وَأَنْزَلْنَا اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ

كَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ﴿النساء: ۱۱۳﴾

”اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ کچھ سکھایا، جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔“

قرآن نے یہ شہادت بھی دی کہ جناب رسول اللہ ﷺ دین کے بارے میں جو بھی کلام کرتے ہیں، وحی کی ترجمانی کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم: ۴، ۳)

”اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، وہ تو صرف وحی ہے، جو اس پر نازل ہوتی ہے۔“

اسی طرح آپ ﷺ دین سے متعلق جو بھی کام کرتے ہیں، اس میں بھی وحی کار فرما ہوتی ہے اور وہ صرف تعمیل کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿قُلْ إِنَّمَا آتَيْعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي﴾ (الأعراف: ۲۰۳)

”کہہ دو کہ میں تو صرف اسی حکم کی پیروی کرتا ہوں، جو میرے پروردگار کی طرف سے بذریعہ وحی میرے پاس آتا ہے۔“

اسی طرح آپ ﷺ کی ”تقریر“ کو مبنی بروحی قرار دیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ

مِنَ الطَّيِّبِ ۚ وَ مَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَحْتَسِبُ

مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَ رُسُلِهِ وَ إِنْ تَوَمَّنُوا وَ تَتَّقُوا فَلَكُمْ

أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ (ال عمران: ۱۷۹)

”اللہ مومنوں کو اس حال میں ہرگز چھوڑے گا نہیں، تا آنکہ پاک کو ناپاک سے

الگ نہ کر دے اور اللہ کا یہ بھی قانون نہیں کہ تم سب کو غیب پر مطلع کر دے، البتہ

اللہ (اس کام کے لیے) اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا انتخاب کر لیتا ہے، تو تم

اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اگر ایمان لاؤ گے اور پرہیز گاری کرتے ہوئے اس کی نافرمانی سے بچو گے، تو تم کو اجر عظیم ملے گا۔“

یہی وجہ ہے کہ ان کی جملہ تعلیمات وہ کتاب کی صورت میں ہوں یا حکمت کی شکل میں ان پر عمل لازم ہے اور اس کی سخت تاکید اور ایسا نہ کرنے پر وعید شدید کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِظًا﴾ (النساء : ۸۰)

”جس شخص نے رسول کی فرماں برداری کی، تو اس نے درحقیقت اللہ کی فرماں برداری کی اور اگر کسی نے نافرمانی کی، تو اے رسول! ہم نے تمہیں ان کا نگہبان نہیں بنا کر بھیجا۔“

اور آپ ﷺ کے جملہ اقوال، افعال اور تقریرات کو حجت قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا أَنْتُمْ بِالرَّسُولِ فَخْذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (الحشر : ۷)

”سو پیغمبر تمہیں جو چیز دیں، وہ لے لو، اور جس سے منع کریں، اس سے باز رہو، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔“

اس لئے اہل ایمان کا خاصہ اور طرہ امتیاز یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے جملہ احکامات کی بلا چون و چرا تعمیل کرتے ہیں اور سمع و طاعت کو اپنا شعار بناتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (النور : ۵۱، ۵۲)

”مومنوں کی تو یہ بات ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، تاکہ وہ ان میں فیصلہ کریں، تو کہیں کہ ہم نے حکم سن لیا اور مان لیا اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا اور اس سے ڈرے گا، تو ایسے لوگ ہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔“

معاندین کی اسلام سے برہنہ کی گئی کہ وہ جانتے تھے کہ ایمان لانے اور حلقہٴ بگوش اسلام ہونے کی صورت میں انہیں رسول ﷺ کی غیر مشروط اطاعت کا پابند ہونا ہوگا، اور ان کی جاہ پسند طبیعتیں اس سے ربا کرتی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿كَذَبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ فَقَالُوا ابْنُوا مِنَّا وَاِحْدًا تَتَّبِعُهُ اِنَّا اِذَا لَفِئْ
ضَلَّلٍ وَ سُعُرٍ ؕ اَلْقَى الَّذِ كُرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ﴾

(القمر : ۲۴، ۲۵)

”ثمود نے ہدایت دینے والوں کو جھٹلایا اور کہا بھلا ایک آدمی جو ہمیں میں سے ہے، ہم اس کی پیروی کریں؟ یوں ہو تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں پڑ گئے، کیا ہم سب میں سے اسی پر وحی نازل ہوئی، (نہیں) بلکہ یہ جھوٹا اور خود پسند ہے۔“
گویا وہ اس سنت الہیہ پر معترض تھے، جو کتاب و حکمت کے نزول و تبلیغ کے لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے اختیار کی تھی، اور ان کی خواہش تھی کہ ان میں سے ہر ایک صاحب کتاب ہو، تاکہ کسی کی اطاعت کا ذمہ دار نہ ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿وَ اِذَا جَاءَ تَهُمْ اٰیَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰی تَاْتٰنَا بِاٰیٰتٍ مُّثْلَ مَا اُوْتِیَ رُسُلُ
اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ یَجْعَلُ رِسٰلَتَهُ ۚ سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ اٰجَرَمُوْا صَغَارٌ
عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا كَانُوْا یَمْکُرُوْنَ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

”اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے، تو کہتے ہیں کہ جس طرح کی

رسالت اللہ کے پیغمبروں کو ملی ہے، جب تک اسی طرح کی رسالت ہم کو نہ ملے، ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، اللہ خوب جانتا ہے کہ اس نے اپنی رسالت کہاں رکھنی ہے، عنقریب ان مجرموں کو اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب پہنچے گا، اس لئے کہ مکاریاں کرتے تھے۔

قرآن حکیم نے بصراحت تمام واضح کیا ہے کہ ان کے اس ترمرد اور استکبار کا سبب اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان کا فقدان ہے، چنانچہ فرمایا :

﴿بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنشَرَةً كَلَّا بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ﴾ (المدثر: ۵۲، ۵۳)

”اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے پاس کھلی ہوئی کتاب آئے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، حقیقت یہ ہے کہ انہیں آخرت کا خوف نہیں۔“

کچھ لوگوں نے ”مسلك اعتدال“ کے نام پر یہ چاہا کہ ہم اللہ کی کتاب کو تو مان لیں گے، لیکن رسول کے احکام نہیں مانیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پکے کافر قرار دیا اور ان کے دلوں کا بھید کھول کر رکھ دیا :

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَ يُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُوا نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَ أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا﴾ (النساء: ۱۵۰-۱۵۱)

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کریں، یہی لوگ

حقیقی کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لئے ایک رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔
جب کہ ایک سچا مومن جو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر یقین رکھتا ہے، اسوۂ
رسول کی پیروی کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے، وہ اللہ اور اس کے
رسول ﷺ کے حکم سے سرتابی تو کجا ان کی اطاعت میں تامل بھی نہیں کر سکتا۔

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُمْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا﴾ (الأحزاب : ۳۶)

”اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کا کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی
امر مقرر کر دیں، تو اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں، اور جو کوئی اللہ اور اس
کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے، وہ صریح گمراہ ہو گیا۔“

نیز اطاعت رسول سے سرتابی کو بصراحت تمام کفر قرار دیا اور فرمایا :

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ﴾

(آل عمران : ۳۲)

”کہہ دو! اللہ اور رسول کا حکم مانو، پھر اگر وہ منہ موڑیں، تو بے شک اللہ کافروں
سے محبت نہیں رکھتا۔“

نیز فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (النساء : ۵۹)

”اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا
بھی جو تم میں سے حکم دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں (یعنی علماء و حکام) پھر اگر

کسی بات پر تم میں اختلاف واقع ہو، تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی زیادہ اچھا ہے۔“

اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر یقین والا شخص تو ہر لحظہ فکر مند ہوگا کہ اللہ کے حضور ایسے اعمال لے کر حاضر ہو، جو صالح ہوں اور اس کے مالک و مولیٰ کو پسند ہو اور روزِ محشر ندامت سے بچ سکے، تو ایسے شخص کے لئے نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور کاملہ کی اتباع سے بڑھ کر کوئی نعت نہیں، چنانچہ فرمایا :

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ
وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾ (الأحزاب: ۲۱)

”بلاشبہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخری امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہو۔“

یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ ﷺ کے سلف و خلف میں قرآن کے ساتھ ساتھ اس کے بیان یعنی سنتِ مطہرہ کو ہمیشہ حجت مانا گیا۔ صحابہ کرام نے اسی اتباعِ سنت کی بدولت اللہ کی جانب سے ﴿السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ﴾ کا لقب پایا اور فلاحِ کامل کی سند پائی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (الأعراف: ۱۵۷)

”وہ جو محمد رسول اللہ ﷺ کی، جو نبی امی ہیں، پیروی کرتے ہیں، جن کے

اوصاف کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انہیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں اور ان پر سے بوجھ اور طوق، جو ان کے سر پر اور گلے میں تھے، اتارتے ہیں، تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی رفاقت کی اور انہیں مدد دی اور جو نور ان کے ساتھ نازل ہوا، اس کی پیروی کی، وہی مراد پانے والے ہیں۔“

نبی اکرم ﷺ کے الوفیق الاعلیٰ سے جا ملنے کے بعد صحابہ کرام، خلفاء راشدین کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ سنت مصطفیٰ کی پیروی کرتے رہے، چنانچہ مشہور تابعی حضرت میمون بن مہران رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا، تو وہ کتاب اللہ میں دیکھتے، اس میں مل جاتا، تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر کتاب اللہ میں نہ پاتے اور اس معاملہ میں انہیں رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم ہوتا، تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اگر ایسا نہ کر پاتے، تو مسلمانوں سے کہتے: میرے پاس یہ مسئلہ پیش ہوا ہے، تو کیا تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں کیا فیصلہ فرمایا؟ بسا اوقات یوں ہوتا کہ بہت سے لوگ اس مسئلہ میں نبی اکرم ﷺ کا فیصلہ ذکر کرتے، تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کہتے:

”اللہ کا شکر ہے جس نے ہم میں ایسے لوگ پیدا کیے، جو ہمارے لئے ہمارا دین محفوظ کیے ہوئے ہیں۔“ (سنن دارمی)

اور اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین بالإحسان رحمہم اللہ کے آثار کا استقصاء کرنے کے لئے دفتروں کے دفتر درکار ہیں۔

ائمہ مجتہدین میں سے ہر ایک سے سنت مشرفہ پر عمل کا وجوب تواتر سے ثابت ہے، امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا قول: ”إذا صح الحديث فهو مذهبي“ زبان زد

خاص وعام ہے، امام مالک رحمہ اللہ تو اپنے درس کا آغاز ہی یہ کہہ کر کرتے:

”ما من أحد إلا ويؤخذ من قوله ويرد عليه إلا صاحب هذا القبر“

”ہر ایک کی بات مانی بھی جاسکتی ہے اور رد بھی کی جاسکتی ہے، سوائے اس قبر والے کے“، اور قبر شریف کی طرف اشارہ کرتے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی تصنیف لطیف ”الرسالۃ“ تو سنت کے مقام اور اس سے استفادہ کی صورتوں کے بیان نیز اخبار آحاد کے نام پر احادیث صحیحہ کا اجمال کرنے والوں کے شبہات کے ازالے میں الہامی تحریر ہے۔

بیان قرآن کی کیفیات کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”ومنہ ما أحکم فرضہ بکتابہ و بین کیف ہو علی لسان نبیہ مثل عدد الصلاة والزكاة وقتها وغير ذلك من فرائضه التي أنزل من كتابه“۔

”ومنہ ما سنّ رسول اللہ ﷺ مما ليس لله فيه نص حکم وقد فرض الله في كتابه طاعة رسولہ ﷺ والإنتهاء إلى حکمہ فمن قبل عن رسول اللہ بفرض اللہ قبل“۔ (الرسالۃ : ۲۲)

”بیان احکام کی ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کسی امر کی فرضیت تو صراحت سے ذکر فرمادی، تاہم اس کی ادائیگی کی کیفیت اپنے نبی کی زبان سے کرائی، مثلاً نمازوں کی تعداد، زکاۃ کے (احکام) اور اس کی مقدار اور اسی طرح کے دیگر فرائض جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل فرمائے۔“

”اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک طریقہ مقرر فرمایا، اس امر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نص تو وارد نہیں، تاہم معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے رسول ﷺ کی اطاعت

فرض کی ہے، تو جس نے جناب رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کی، اس نے اللہ تعالیٰ کا عائد کردہ فرض ادا کیا۔

رہے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تو ان کا تو لقب ہی ”إمام أهل السنة والجماعة“ ہے۔ قرون مفضلہ و مشہود لہا بالخیر کے بعد کی تاریخ تفتت و افتراق کی تاریخ ہے۔ اہل حدیث و اہل الرأی کا اختلاف سامنے آیا، فقہی مکاتب فکر و جود میں آئے، سیاسی دھڑے بندی ہوئی، شریعت و طریقت کی تقسیم اس پر مستزاد ہوئی، لیکن اس تمام ہنگامہ آرائی اور سرو و گرم جنگوں کے ماحول میں بھی سنت کی تشریحی حیثیت کبھی متنازعہ نہیں ہوئی۔

اہل سنت و الحدیث تو اس کے ہمیشہ علمبردار رہے ”وكانوا أحق بها وأهلها“ شیعہ، خوارج، معتزلہ، متکلمین، متصوفین کسی نے بھی اس کی حجیت میں کلام نہیں کیا، بلکہ سب اپنے اپنے موقف کی تائید میں کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ احادیث سے استدلال کرتے رہے اور ان میں سے ہر گروہ کی مؤلفات اس امر کا بین ثبوت ہیں۔ بعض احادیث کی تصحیح و تضعیف پر تو اختلاف ہوا، لیکن فی الجملہ حدیث و سنت کی حجیت اور اس کی تشریحی حیثیت کبھی متنازعہ فیہ نہیں ہوئی۔

یہاں تک کہ علم کلام کی چھاپ رکھنے والی کتب اصول فقہ میں بھی سنت مطہرہ کو کتاب اللہ کا قرین اور مسائل شرعیہ میں غیر متنازعہ طور پر حجت ہونا تسلیم کیا گیا ہے، سعد الدین تفتازانی متاخرین میں بہت بڑا نام ہے، رقمطراز ہیں :

”فإن قلت فما بالهم يجعلون من مسائل الأصول إثبات الإجماع والقياس للأحكام ولا يجعلون منها إثبات الكتاب والسنة لذلك ؟ قلت : لأن المقصود بالنظر في الفن هي الكسبيات المفتقرة إلى الدليل وكون الكتاب والسنة حجة بمنزلة البديهي في نظر

الأصولی لتقرره فی الکلام وشهرته بین الأنام بخلاف الإجماع والقیاس۔ (التلویح علی التوضیح : ص ۲۳)

”اگر تم سوال کرو کہ کیا وجہ ہے کہ علماء اصول اجماع اور قیاس کی حجیت کے اثبات کو مسائل اصول میں سے گردانتے ہیں، لیکن کتاب اور سنت کی حجیت کے اثبات سے تعرض نہیں کرتے اور نہ انہیں مسائل اصول میں سے باور کرتے ہیں؟ تو اس کے جواب میں کہوں گا: اس فن میں غور و فکر کا موضوع وہ امور ہیں، جن کا تعلق استنباط و استخراج سے، جو دلیل کے محتاج ہوتے ہیں، جب کہ کتاب و سنت کا حجت ہونا تو ایک اصولی کے نزدیک بدیہی امر ہے، جو علم کلام میں مسلم ہے اور تمام لوگوں میں مشہور ہے، جب کہ اجماع اور قیاس کا یہ معاملہ نہیں ہے۔“

اسی طرح مسلم الثبوت اور اس کی شرح فواتح الرحموت میں ہے :
”إن حجية الكتاب والسنة والإجماع والقیاس من علم الکلام لكن تعرض الأصولی لحجية الإجماع والقیاس لإنهما کثر فیهما الشغب من الخوارج و الروافض، (خذلهم الله)، أما حجية الكتاب والسنة فمتفق علیها عند الأمة ممن يدعی التدين كافة فلا حاجة للذكر۔“ (۱/۱۷ ط حلبي)

”کتاب، سنت، اجماع اور قیاس کی حجیت علم کلام کا موضوع ہیں، تاہم علماء اصول صرف اجماع اور قیاس کی حجیت سے تعرض کرتے ہیں، اس لیے یہی وہ اصول ہیں، جن کے بارے میں خوارج اور روافض وغیرہ اہمقوں کی طرف سے شور و شغب کیا گیا ہے، جہاں تک کتاب اور سنت کا تعلق ہے، تو ان کی حجیت ساری امت کے ہاں متفق علیہ مسئلہ ہے، بشرطیکہ وہ دین کے ساتھ نسبت رکھتے ہوں، اس لیے ان کی حجیت سے تعرض کی ضرورت نہیں۔“

کتاب اللہ کی قرین ہونے کے اعتبار سے سنت مطہرہ اسلام کے معاندین کے حملوں کا نشانہ بنی، اس پر داخلی حملے بھی ہوئے اور خارجی بھی، وضعی احادیث کی اشاعت کے ذریعے اس کو مشکوک بنانے کی کوشش بھی کی گئی اور امت محمدیہ علیہا السلام کے طرہ امتیاز اور سرمایہ افتخار اصولِ نقدِ حدیث کے بارے میں عدم اعتماد کی فضا پیدا کرنے کی سعی نامشکور بھی ہوئی۔ کلامی اور درآمدی نظریات سے متاثرہ عقول کا ایتقان بھی متزلزل ہوا، جس کے اثرات اصولِ فقہ کے توسط سے بعض فقہی مکاتب فکر کے فروغ تک بھی پہنچے، تاہم اللہ تعالیٰ کا فرمان واجب الإذعان:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر: ۹)

”بلاشبہ یہ کتاب نصیحت ہمیں نے نازل کی اور ہمیں اس کے محافظ ہیں۔“

ہر زمانے میں اپنی صداقت کا اعلان کرتا رہا اور ہر عہد میں ایسے جہاں بذرہ و عباقرہ پیدا ہوئے، جنہوں نے شکوک و شبہات اور سازشوں کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا اور قرآن کے ساتھ ساتھ سنت پر بھی اہل ایمان کا ایمان روز افزوں رہا:

﴿وَلْيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (الحج: ۵۴)

”اور یہ بھی مقصود تھا کہ جن لوگوں کو علم عطا ہوا ہے، وہ جان لیں کہ یہ یعنی وحی تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے، تو وہ اس پر ایمان لائیں اور ان کے دل اللہ کے حضور جھک جائیں اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، اللہ ان کو سیدھے رستے کی ہدایت کرتا ہے۔“

چنانچہ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام محمد بن اسماعیل البخاری، امام یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، امام ابن قتیبہ، امام محی السنۃ البغوی، حافظ ابن حزم الأندلسی، شیخ الإسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن القیم، علامہ محمد بن ابراہیم

الوزير، رحمهم الله وغيرهم وكتير ما هم، سب نے اپنے اپنے ادوار میں اس زمانے کی ضرورت کے مطابق سنت مطہرہ کے حظیرہ قدس کا دفاع کیا، جزاھم اللہ عن الإسلام والسنة خير الجزاء۔

بلاشبہ یہی وہ مقدس گروہ ہے، جس کی نسبت امام اہل السنة والجماعة احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہا :

”اللہ کا شکر ہے جس نے انقطاع نبوت و رسالت کے زمانے میں اہل علم میں سے ایسے افراد پیدا فرمائے کہ جو گمراہی میں گرفتار افراد کو راہ ہدایت کی طرف بلاتے ہیں، اور لوگوں کی جانب سے پہنچائی جانے والی تکلیف اور اذیت پر صبر کرتے ہیں اور اللہ کی کتاب کے ذریعے مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور بصیرت سے محروم لوگوں کو اللہ کے نور کی بدولت بصیرت سے بہرہ مند کرتے ہیں۔ چنانچہ اس گروہ نے کتنے ہی کشتگان ابلیس کو زندہ کیا اور بھٹکتے ہوئے کتنے ہی گم کردہ راہوں کو صراط مستقیم پر گامزن کیا، ان حضرات نے انسانوں کو کس قدر فیض یاب کیا اور اس کے بدلے میں لوگوں کا ان سے سلوک کس قدر برا ہے۔

یہی جماعت ہے جو غلو پسندوں کی تحریف، باطل پرستوں کی دروغ بانی اور جاہلوں کے لفظی بہیر پھیر کو کتاب اللہ سے دور رکھتے ہیں۔“ (مقدمة الرد علی الجہمیة)

اور ان حضرات کے وجود مسعود کے توسط سے حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان

ذیشان حرف بحرف پورا ہوا کہ :

”إن الله تعالى يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها“۔ (أبوداود)

”اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے افراد پیدا فرماتا رہے گا، جو ان کے لیے ان کے دین کی تجدید و احیاء کرتے رہیں۔“

اور اللہ تعالیٰ کے فرمان عالی شان ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْآخَرِينَ﴾ (الواقعة: ۴۰)

اور بفتحوائے فرمان نبوی ”یحمل هذا العلم من كل حلف عدوله“

یہ سلسلہ آج بھی پوری آب و تاب سے جاری ہے اور ذہبی عصر امام عبد الرحمن بن یحییٰ المعلمی کی تالیفات بالخصوص ”الأنوار الكاشفة“ اور ”التنکیل“، علامہ محمد عبدالرزاق حمزہ کی تصنیف لطیف ”ظلمات أبی ربه، مولانا شرف الدین محدث دہلوی کی تالیف ”ایک اسلام“، محدث عصر شیخ محمد ناصر الدین البانی کی جملہ مؤلفات، حجتہ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی کے رسائل، اس زمانہ میں طراز اول کے نمونہ صادق شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کے مقالات اور بیہقی زماں، غزالی دوراں، محدث عصر، مسند پنجاب، استاذ الأساتذہ، العالم الألمعی، الفقیہ العبقری، حافظ محمد گوندلوی کی تصنیف ”دوام حدیث“، ان مجددین علوم نبوت کی مسیحا نفسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ رحمہ اللہ رحمة واسعة

ان میں سے ہر کتاب، مستطاب اور لا جواب ہے، تاہم بلا خوف تردید اور ادنی تاہل کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ ”دوام حدیث“ اس سلسلۃ الذہب میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کی حامل کتاب ہے۔

اس تصنیف لطیف میں حضرتہ العلام محدث گوندلوی رحمہ اللہ نے ہمارے زمانے کے عجوبہ روزگار گروہ کی حقیقت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے، جو پوری امت کے متفق علیہ اور اجماعی موقف سے انحراف ہی نہیں بغاوت کر کے صرف یہی نہیں کہ سنت مطہرہ کو حجت نہیں سمجھتا، بلکہ خاش بدہن اسے دین کے خلاف سازش قرار دیتا ہے اور اس کے باوصف اسے یہ اصرار بھی ہے کہ وہ قرآن پر ایمان رکھتا ہے! ﴿وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾

جو حضرت ”رواروی“ منکرین حدیث و سنت کو معتزلہ کا جدید ایڈیشن قرار دیتے ہیں، انہوں نے ”علماء و فضلاء“ کے اس غریب خوردہ گروہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا

اور نہ اس طائفہ فارقہ (مکرین سنت) کے اصول پر غائر نظر ڈالی، وگرنہ ان پر غصی نہ رہتا، وہ صرف مکرین سنت نہیں، بلکہ واضح طور پر مکرین دین ہیں اور ان کے رؤساء و کبراء کے مسئلہ قرآنی نصوص سے ناواقفی، قرآن میں اطاعت رسول ﷺ کی تاکید سے لاعلمی یا ان کے معافی تک نارسائی نہیں ہے، بلکہ حضرت حافظ صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ فتنہ خالصۃً باطنیت ہے، جس کا خمیر اسلام دشمنی سے اٹھا ہے اور جس کے یہ منظر میں وہی نخوت اور استکبار کا رفرما ہے، جس کے زیر اثر ان کے اسلاف نے کہا تھا کہ:

﴿لَوْ لَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا الْمَلَائِكُ أَوْ نَرَى رَبَّنَا﴾ (الفرقان: ۲۱)

اور جن کے ہوا جس اور خواہشات نفس کو قرآن حکیم نے یہ کہہ کر بیان فرمایا :

﴿بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنشَرَةً﴾ (المدثر: ۵۲)

اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان نہ لانے کی پاداش ہے کہ اس گروہ کے متعین جناب رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل کو سعادت اور ذریعہ نجات باور کرنے کی بجائے اس سے بدکتے ہیں :

﴿كَانَتْهُمْ حُمْرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾

حضرت نے ان کے مرض کی بالکل درست تشخیص فرمائی کہ یہ لوگ بظاہر ختم نبوت پر ایمان کا دم بھرتے ہیں، لیکن درحقیقت خود مقام نبوت پر براجمان ہونا چاہتے ہیں۔ ان کا مذموم و مشنوم مقصد صرف یہ ہے کہ امت محمدیہ ﷺ کو سرمایہ یقین سے محروم کر کے اس کے بدن سے روح محمد نکال سکیں۔ خبیہم اللہ وخذلہم وقد فعل!

اس مذموم مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے لغوی مغالطوں کا سہارا لیا ہے، حضرت حافظ صاحب نے ان مغالطوں کو ہباءً منشور کر دیا اور ظن کے مختلف معانی

بیان کرنے کے ساتھ مدارج علم اور ذرائع علم کا تفصیلی جائزہ پیش کر دیا ہے اور ایمان افروز دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ حدیث نبوی کا معظم حصہ علم قطعی اور یقینی کا سرمایہ ہے۔ واللہ درہ!

”دوام حدیث“ صرف بیان حجیت حدیث ہی نہیں، بلکہ بیان عظمت حدیث اور بیان ضرورت حدیث بھی ہے۔ ”دوام حدیث“ حدیث کے وجوہ اعجاز کا بیان ہے اس لیے کہ حدیث بیان ہے قرآن کا، جس کا امتیازی وصف ہے کہ وہ ایسا آفتاب ہے جو خود ہی دلیل آفتاب ہے ﴿وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ﴾ (ہود: ۱۷)

اس کی صداقت اور اس کے کلام اللہ ہونے کی شہادت اس کے اندر موجود ہے، اور وہ اس نبی اُمّی لقب کا کلام اور بیان ہے، جن کے بارے میں کہا گیا، وصدق من قال:

لَوْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ آيَاتٌ مُّبِينَةٌ

كَانَتْ بِدِيهِتِهِ تَاتِيكَ بِالْخَبِيرِ

”اگر ان میں واضح معجزات نہ بھی ہوں، تو بھی ان کی پہلی جھلک ہی تمہیں ان

کی صداقت بتانے کے لیے کافی ہے۔“

اسی طرح حدیث بذات خود دلیل ہے کہ یہ اسی کا کلام ہے اور اسی کی تعلیم ہے، جس کا وصف یہ ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم: ۴۰۳)

چنانچہ احادیث میں بیان شدہ عبادات و فرائض کا طریق پر وقار، اذکار مسنونہ میں مضمحل گنجائے معرفت اور ادعیہ مسنونہ کا سوز و گداز، کیا یہ دلیل نہیں ہے کہ یہ اسی قلب اطہر سے صادر ہوئے ہیں، جو مہبط وحی اور مطلع انوار تنزیل ہے؟

غرضیکہ یہ سفر جلیل علوم و معارف حدیث کا خزانہ ہے اور ایک صاحب نظر اسے دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے گا:

زفرق تاپہ قدم ہر کجا کہ می نگریم

کہ شمشہ دامن دل می کشد کہ جان بچاست

علامہ زمان کی اس عظیم الشان تالیف جس کی نظیر اس کے نظائر میں نہیں، اس کے متعلق ایک ہچمدان کا کچھ کہنا، جسارت کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن وقت کے سلطانِ علم کی درباری اور علوم و معارف کے اس کاروان کی حدی خوانی بھی ایک اعزاز ہے، جس کے لیے اللہ کا شکر گزار اور عزیزِ مکرم، فاضلِ جلیل اور عالمِ نبیل حافظ شاہد محمود وفقہ اللہ کا ممنون ہوں، جن کی وساطت سے یہ اعزاز نصیب ہوا۔

حافظ شاہد محمود صاحب تمام طلابِ علم خصوصاً حضرة العلام محدثِ گوندلوی کے معارف کے شائقین کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس گنجینہ معارف کو منصہ شہود پر لانے کے لیے سعی مشکور فرمائی اور اس پر مفید حواشی لکھ کر اس کی افادیت کو آسان اور کئی چند کر دیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حضرت العالم الربانی والفقہ اللوذعی والفاضل الألمعی حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کی جملہ تالیفات کو جو زبانِ اردو میں ہے، عربی زبان میں منتقل کیا جاسکے۔ کیوں کہ جب سے انہوں نے کتب تراجم میں حافظ صاحب کے بارے میں پڑھا ہے، وہ زبانِ حال سے ہی نہیں زبانِ قال سے کہہ رہے ہیں :

مشاطہ راگو کہ بر اسباب حسن بار

چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد

مجھے یقین ہے کہ دین سے تعلق رکھنے والا جو شخص بھی حضرة العلام کی اس تصنیفِ لطیف کا مطالعہ کرے گا، میری اس دعا پر آمین ثم آمین کہے گا کہ اللہ تعالیٰ مؤلفِ علام کو سلفِ امت کے ساتھ اعلیٰ علیین میں مقامِ عطا فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے۔ اور پوری لگن کے ساتھ اس سفرِ جلیل کی خدمت کرنے اور طلابِ علم تک اسے

پہنچانے پر اللہ تعالیٰ حافظ شاہد محمود صاحب اور ان کے جملہ رفقاء کی اس خدمت کو شرف قبول بخشے، ان کے علم و عمل میں برکت فرمائے اور اسلام اور علوم حدیث کی طرف سے انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ أجمعین

خادم العلم والعلماء

حافظ عبد الحمید ازہرؒ

محمدی مسجد، راولپنڈی

۲۴ شعبان ۱۴۲۸ھ، ۸ ستمبر ۲۰۰۷ء

دیباچہ

”دو اسلام“ کا دیباچہ پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی تربیت شروع سے ایسے ماحول میں ہوئی ہے، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ حقیقی اسلام سے بالکل نا آشنا رہے اور مجموعہ رسوم کو اسلام سمجھ کر اس کا ذمہ دار حدیث کو ٹھہرائے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

”میں مسلسل چودہ برس تک حصول علم کیلئے مختلف علماء و صوفیاء کے ہاں رہا، درس نظامی کی تکمیل کی، سینکڑوں واعظین کے وعظ سنے، بیسیوں دینی کتابیں پڑھیں، اور بالآخر مجھے یقین ہو گیا کہ اسلامی تعلیمات کا ماحصل یہ ہے:

❶ فرائض خمسہ یعنی توحید کا اقرار اور صلوٰۃ، زکوٰۃ و صوم اور حج کی بجا آوری۔

❷ اذان کے بعد درود شریف پڑھنا۔

❸ مختلف رسومات مثلاً جمعرات، ختم، چہلم، گیارہویں وغیرہ کو باقاعدگی سے ادا کرنا۔

❹ قرآن کی عبارت پڑھنا۔

❺ اللہ کے ذکر کو سب سے بڑا عمل سمجھنا۔

❻ اچھل اچھل کر بوحق کا ورد کرنا۔

❼ قرآن اور درود کے ختم کرنا۔

❽ نجات کیلئے کسی مرشد کی بیعت کرنا۔

❾ مُردوں سے مرادیں مانگنا۔

❿ مزاروں پر سجدے کرنا۔

۱۱ تعویذوں اور گنڈوں کو مشکل کشا سمجھنا۔

۱۲ غلیظ لباس کو پیغمبری لباس سمجھنا۔

۱۳ سڑکوں پر اور بازاروں میں سب کے سامنے ڈھیلا کرنا۔

۱۴ آنحضرت ﷺ کو عالم الغیب، نیز حاضر و ناظر سمجھنا۔

۱۵ کسی بیماری یا مصیبت سے نجات حاصل کرنے کیلئے ملا جی کی ضیافت کرنا۔

۱۶ گناہ بخشوانے کیلئے قوالی سننا۔

۱۷ غیر مسلم کو ناپاک و نجس سمجھنا۔

۱۸ امام ابوحنیفہ کی فقہ پر ایمان لانا۔

۱۹ صحاح ستہ کو وحی سمجھنا۔

۲۰ تمام علوم جدیدہ مثلاً طبیعیات، ریاضیات، اقتصادیات اور تعمیرات وغیرہ کو کفر خیال کرنا۔

۲۱ غور و فکر اور اجتہاد و استنباط کو گناہ قرار دینا۔

۲۲ صرف کلمہ پڑھ کر بہشت میں پہنچ جانا۔

۲۳ ہر مشکل کا علاج عمل اور محنت سے نہیں، بلکہ دعاؤں سے کرنا۔ مثلاً سوتے وقت

یہ دعا پڑھنا..... اللھم باسمک أموت وأحیی..... خواب میں خواجہ خضر کی

زیارت ہوگی۔ اور جاگو تو یہ دعا پڑھو..... بسم اللہ الذی أحيانی بعد ما

أمتانی..... تاکہ حوریں تمہارا منہ چائیں۔ (الخ) ①

افسوس! مصنف نے عمر عزیز کے چودہ برس فضول ضائع کر دیئے۔ ہمیں واقعی

دکھ ہو رہا ہے کہ انہوں نے درس نظامی کی تکمیل کر کے اسلام کو اگر بھی کچھ سمجھا ہے،

جو انہوں نے بیان فرمایا ہے، تو اس سے یہی بہتر تھا کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے کی

بجائے کوئی اور چھوٹا موٹا کام کر لیتے!

ہاں تو جناب! درس نظامی کی کتابوں میں آپ نے کہیں بھی جہاد کا ذکر نہیں پڑھا؟ جبکہ درس نظامی کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ فقہ و حدیث میں جہاد کے احکام و مسائل کثرت سے موجود ہیں۔ اور یہ گناہ بخشوانے کیلئے تو الیاں سننا، مزاروں پر سجدے کرنا، اچھل کر ہُو حق کرنا، مُردوں سے مرادیں مانگنا وغیرہ وغیرہ، درس نظامی کی کون سی کتاب میں آپ نے پڑھا ہے؟

حدیث تو ان تمام لغویات کی تردید سے پُر ہے اور آپ یہی باتیں حدیث سے منسوب فرما رہے ہیں!!

اور اس چودہ سالہ طویل مدت میں کیا آپ کی نظر سے ایک رسالہ بھی ایسا نہیں گذرا، جس میں امور متذکرہ کے خلاف مدلل طور پر کچھ لکھا گیا ہے؟ مصنف نے یہاں تو صرف اسی قدر لکھا ہے کہ درس نظامی کی تکمیل کی، لیکن آگے چل کر ”پانچویں باب“ میں لکھتے ہیں:

”میرا کوئی شیخ الحدیث نہیں، اگر میں کسی شیخ الحدیث کے اڑنگے پر چڑھ جاتا، تو وہ مجھے اقلیم حقائق سے بہت دور اوہام و ظنون کی دنیا میں لے جا کر وہ پٹخنی دیتا کہ میرا سر اور نظریہ دو آب کی طرح چکرا جاتے۔“ (ص: ۱۲۰)

مصنف کا مبلغ علم!

اور مصنف کے استدلال کو دیکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مصنف نے قرآن کی آیات اور احادیث کو لکھتے وقت اچھی طرح ان کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ یا ممکن ہے یہ ان کی درس نظامی میں چودہ سالہ محنت کا نتیجہ ہو۔!

چنانچہ ”پانچویں باب“ کے (صفحہ: ۱۱۰) پر قرآن مجید کی ایک آیت اس طرح لکھی ہے:

”إنما أوحى إلي هذا القرآن لأنذركم به“

اور ”بیسویں باب“ (ص: ۳۴۶) میں پھر اس آیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں کسی مقام پر ان الفاظ کے ساتھ یہ جملہ نہیں آیا۔ اسی طرح احادیث لکھتے وقت بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ چنانچہ ”دسویں باب“ میں لکھتے ہیں کہ:

”فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے کہ حائضہ روزہ رکھے اور نماز نہ پڑھے۔ ”إن

الحائض تقضي الصيام ولا تقضي الصلوة“..... کہ حائضہ روزے

رکھے اور نماز نہ پڑھے..... لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ

حضور ﷺ کی ایک زوجہ حضور ﷺ کے ہمراہ معتكف ہو گئیں۔ اس دوران

میں انہیں حیض شروع ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ جب وہ نماز پڑھتی تھیں، تو

ہم ان کے نیچے برتن رکھ دیتے تھے، تاکہ خون مسجد میں نہ گرنے پائے۔

(بخاری: ۱/۲۲۹، ۲۴۲)

اس عبارت میں مصنف نے تین جگہ غلطی کی ہے:

① فقہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حائضہ روزہ رکھے، حالانکہ ایک ادنیٰ طابعام بھی

جانتا ہے کہ حائضہ کو نہ نماز پڑھنے کی اجازت ہے، نہ روزہ رکھنے کی۔ بلکہ روزہ

کی قضا کا اس میں حکم ہے، نہ کہ نماز کی قضا کا!!

② عربی عبارت ”إن الحائض تقضي الصيام ولا تقضي الصلوة“ کا

ترجمہ بھی غلط کیا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”حائضہ روزے کی قضا دے اور نماز

① ویکھیں: الهدایة: کتاب الطہارۃ، باب الحيض والاستحاضة، (ص: ۳۲)

کی قضا نہ دے۔“..... آپ کہتے ہیں کہ ”روزہ رکھے اور نماز نہ پڑھے!“
 (۲) حدیث ^۱ میں مستحاضہ کا ذکر ہے، نہ کہ حائضہ کا، مستحاضہ اس عورت کو کہتے ہیں، جس کو ایام حیض کے علاوہ خون آتا ہو۔ یعنی بیماری کی وجہ سے خون آتا ہو۔ ایسی عورت پر نماز اور روزہ فرض ہوتا ہے۔ آپ غلطی سے حائضہ سمجھ رہے ہیں۔

احادیث میں تناقض یا.....!!

اسی صفحہ میں دو حدیثوں میں تناقض ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”حضور فرماتے ہیں: ”مجھے رکوع اور سجود میں قرآن پڑھنے سے روک دیا گیا ہے۔“ (مسلم) لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور رکوع و سجود میں قرآن کی آیت ”سبح قدوس ربنا ورب الملائکة والروح“ پڑھا کرتے تھے۔^۱

غور فرمائیے! یہ حضرت حدیث پر اور اصحاب حدیث پر تنقید کرنے چلے ہیں، جن کو یہ بھی علم نہیں کہ یہ جملہ قرآن کی آیت نہیں، اور آپ نہ صرف اسے قرآنی آیت سمجھ رہے ہیں، بلکہ اس کی بنیاد پر دو حدیثوں میں تناقض ثابت کرنے کی کوشش بھی فرمائی جا رہی ہے!!

- ① صحیح البخاری: کتاب الاعتکاف، باب اعتکاف المستحاضة، رقم الحدیث (۱۹۳۲)، حدیث کے الفاظ یہ ہیں ”اعتکفت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرأة من أزواجه مستحاضة، فكانت ترى الحمرة والصفرة، فربما وضعنا الطست تحتها وهي تصلي“
- ② صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب النهي عن قراءة القرآن في الركوع والسجود، رقم الحدیث (۴۷۹)

① یہ الفاظ حدیث میں وارد دعائیہ کلمات ہیں، نہ کہ قرآنی کلمات! چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں: عن عائشة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول في ركوعه وسجوده ”سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ“ (صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود، رقم الحدیث (۴۸۷))

تیرہویں باب میں لفظ ”مغفرت“ کی تحقیق ہے۔ چودھویں باب میں مسئلہ شفاعت..... پندرہویں باب میں قرآن سے متضاد احادیث، سولہویں باب میں غلامی اور اسلام، سترہویں باب میں تقدیر، اٹھارہویں باب میں متضاد احادیث انیسویں باب میں چند دلچسپ احادیث اور بیسواں باب ”صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا.....“ کے بیان میں ہے۔



پہلا باب

حدیث میں تحریف

اس میں مندرجہ ذیل باتوں کا ذکر ہے:

① ”وہ اقوال جو جاہ طلب، خود بین اور شکم پرست لوگوں نے تراش کر آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر دیئے تھے، آج وہ اقوال رسول کے قول میں اس طرح خلط ملط ہو چکے ہیں کہ حق کو باطل سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو رہا ہے۔“

② بعض علماء نے سچ کو جھوٹ سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی، لیکن معاملہ اس قدر الجھ چکا تھا کہ اسے سلجھانا انسان کی دسترس سے باہر تھا جس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

ا: علم کم تھا۔

ب: لکھنے والے محدود تھے۔

ج: ذخائر علم محدود تھے۔

د: صحابہ کی تمام توجہ قیامِ سلطنت، نشر و اشاعتِ اسلام اور تعمیرِ سلطنت پر صرف ہو رہی تھی۔

③ ان کے پاس خود رسول موجود تھا، اور رسول کے بعد آپ کا دیا ہوا مکمل اور اتم ضابطہ حیات یعنی قرآن۔

④ صحابہ نے اقوالِ رسول کو مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر نہیں لکھا:

ا: قرآن کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے، جب آنحضرت ﷺ نے کتاب و کاغذ کو طلب کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔“^①
 قرآن میں ہے کہ دین کامل کر دیا گیا ہے۔^②
 ب: ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قرآن کے سوا میرا اور کوئی قول نہ لکھو، اگر کوئی شخص ایسا قول لکھ چکا ہو، تو اسے مٹا دے۔“ (مسلم)^③
 اس فرمان کی دو وجہیں تھیں:

(۱): کہیں غلطی سے احادیث قرآن کے متن میں شامل نہ ہو جائیں۔

(۲): آدمی کو اپنی کہی ہوئی بات یاد نہیں رہتی، وہ دوسرے کی کیا یاد رکھے گا۔ حضور کو انسان کی اس فطری کمزوری کا علم تھا، اس لئے آپ ﷺ نے لکھنے سے منع کر دیا۔

① صحیح البخاری: کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم و وفاته، رقم الحدیث (۴۱۶۹)، صحیح مسلم: کتاب الوصیۃ، باب ترک الوصیۃ لمن لیس له شیء یوصی فیہ، رقم الحدیث (۱۶۳۷)، کتاب اللہ کا اطلاق صرف قرآن مجید پر نہیں، بلکہ احادیث نبویہ پر بھی کیا جاتا ہے۔ دیکھیں: صحیح البخاری: کتاب الصلح، باب إذا اصطلحو علی صلح جور فالصلح مردود، رقم الحدیث (۲۵۴۹)، صحیح مسلم: کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه بالزنا، رقم الحدیث (۱۶۹۷)، صحیح البخاری: کتاب البیوع، باب إذا اشترط شروطاً فی البیع لا تحل، رقم الحدیث (۲۰۶۰)، صحیح مسلم: کتاب العتق، باب إنما الولاء لمن أعتق، رقم الحدیث (۱۵۰۴) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اپنے اس قول: ”حسبنا کتاب اللہ“ سے یہی مراد تھی کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر مبنی جو احکام ہمارے پاس موجود ہیں، وہ ہماری رشد و ہدایت کے لیے کافی ہیں۔

② المائدة: ۳

③ صحیح مسلم: کتاب الزہد، والرقائق باب التثبت فی الحدیث و حکم کتابۃ العلم رقم الحدیث (۳۰۰۴) حدیث کے الفاظ ہیں: ”لا تکتبوا عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحه و حدثوا عنی ولا حرج و من کذب علی متعمدا فلیتوا مقعده من النار“

- ⑤ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عراق کا قرآن مجازی قرآن سے مختلف تھا۔
- ⑥ جو چیز لکھی نہ جائے، وہ لازماً پہلے بڑتی اور بالآخر مٹ جاتی ہے۔ حضور کا مقصد یہی تھا، جو عمر (رضی اللہ عنہ) قرآن کا ایک لاکھ نسخہ لکھوا سکتا تھا، وہ پانچ چھ ہزار حدیث کا مجموعہ بھی تیار کر سکتا تھا، کیا انہیں اقوال رسول سے معاندت تھی؟
- ⑦ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ ایک صبح اٹھے، اسے جلا دیا۔ (تذکرۃ الحفاظ ذہبی)
- ⑧ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے احادیث کے لکھنے کا ارادہ کیا۔ مہینہ بھر استخارہ کیا پھر ارادہ ترک کر دیا اور کتاب اللہ سے لوگوں کے منحرف ہونے سے ڈر گئے۔
- (جامع بیان العلم)
- ⑨ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ”تم لوگ آج احادیث میں اختلاف رکھتے ہو۔ آئندہ یہ اختلاف بڑھتا چلا جائے گا، اس لیے تم آنحضرت سے کوئی حدیث بیان نہ کرو، اگر کوئی پوچھے، تو کہو: ہمارے پاس قرآن موجود ہے۔ جو اس نے جائز قرار دیا ہے، اسے جائز سمجھو، اور جو اس نے ناجائز قرار دیا ہے، اسے ناجائز سمجھو!“ (تذکرۃ الحفاظ ذہبی)
- ⑩ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا: ”گھر جاؤ اور تمام ذخیرہ احادیث اٹھا لاؤ“ آپ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے جلا دیا۔ (طبقات ابن سعد: ۵/ ۱۴۰)
- اس کی وجہ یہی تھی کہ اقوال رسول میں تحریف ہو چکی تھی۔
- ⑪ مقام حیرت ہے، پھر وہی احادیث جن کو ضائع کر دیا گیا، اڑھائی سو سال بعد امام بخاری، امام مسلم وغیرہ نے ان کو جمع کیا اور ہم سب نے مل کر نعرہ لگایا.....
- ”هذا أصح الكتب بعد كتاب الله“
- ⑫ چند ایک احادیث جو جمع تھیں، جلا دی گئیں، جو زبانوں پر جاری تھیں، ان میں

ہر لمحہ رد و بدل ہو رہا تھا، بات ایک دن میں کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور ان اقوال پر تو اڑھائی سو برس گزر چکے تھے۔ صحابہ فوت ہو چکے تھے اور بعد میں بچے وہ لوگ جو کہ امام حسین کے قاتل، حضرت علی کے باغی، کعبے کے ڈھانے والے تھے۔ حاکم شراہی، امراء راشی، فقیر پست کردار لوگ، کیا ایسے ماحول (امیہ کا دور) میں کسی حدیث کا اصلی حالت پر رہنا ممکن تھا؟ بعض صحابہ سے لغزشیں سرزد ہوتی رہتی تھیں۔

(13) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جنگ میں دونوں طرف صحابہ کی ایک بڑی تعداد تھی اور ظاہر ہے کہ دونوں راستی پر نہ تھے، پھر رحلتِ رسول کے بعد بعض مرتد ہو گئے تھے اور بعض نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان حالات میں ممکن ہے کہ کسی صحابی نے عمداً کسی حدیث کے الفاظ بدل دیئے ہوں اور سہو و نسیان کا خطرہ تو ہر وقت تعاقب میں رہتا تھا۔ دو سو پچاس برس تک یہ حدیثیں کروڑوں زبانوں پہ جاری رہیں، ہر نیک و بد کے پاس پہنچیں، الفاظ بدلے، مفہوم بدلا، اضافے ہوئے، لاکھوں نئی حدیثیں وضع کی گئیں۔ امام بخاری نے چھ لاکھ سے صرف ”۷۲۷۵“ کا انتخاب کیا اور باقی کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ آپ نے انتخاب کا معیار راویوں کی صداقت کو قرار دیا، امام بخاری کو کیسے پتہ چل گیا کہ اس کے تمام راوی سچے تھے؟

(14) ہمارے سوانح نگاروں میں ایک خاص نقص تھا، حسن ظن سے کام لیتے تھے اور مبالغہ و مدح سرائی پر اتر آتے تھے۔

ایک ہی دور کے چند راوی لیکر ذہبی کی زبانی ان کی کہانی سناتا ہوں:

❖ ”علی بن حسین“ کے متعلق لکھا ہے:

”كان يصلي في اليوم واللييلة ألف ركعة“ (تذکرہ ۷۶)

کھانے پینے کے آٹھ گھنٹوں کے علاوہ باقی سولہ گھنٹوں میں اتنی رکعات کا پڑھنا محال ہے۔

❖ ”مطرف بن عبد اللہ“ (وفات ۹۵ھ) کے متعلق لکھا ہے:

”کان رأسا فی العلم“ (تذکرہ: ۵۵)

❖ ”محمد بن سیرین“ (وفات ۱۱۰ھ) کے متعلق لکھا ہے کہ:

”عزیز العلم ثقة رأس فی الورع“ (تذکرہ: ۶۷) ^۱

دونوں ہم عصر اور دونوں علم میں سردار!

❖ ”طاؤس بن کیسان“ کے متعلق لکھا ہے:

”کان رأسا فی العلم والورع“ ^۲

❖ ”أبو صالح“ (وفات ۱۱۰ھ) کے متعلق لکھا ہے:

”من أجل الناس وأوثقهم.....“ (تذکرہ: ۷۸)

❖ ”شعبي“ کے متعلق لکھا ہے کہ:

”ما رأيت أعلم وأفقه منه“ (تذکرہ: ۷۰)

❖ ”عكرمة“ (وفات ۱۰۶ھ) کے متعلق لکھا ہے:

”أعلم بكتاب الله“ (تذکرہ: ۸۴)

❖ ”قاسم بن محمد“ (وفات ۱۰۶ھ) کے متعلق لکھا ہے:

”ما رأيت فقيها أعلم من القاسم“ (تذکرہ: ۸۴)

❖ ”عطاء بن أبي رباح“ (وفات ۱۱۴ھ) کے متعلق لکھا ہے:

”ما رأيت أفضل من عطاء.....“ (تذکرہ: ۸۴)

۱ اصل الفاظ ہیں: ”عزیز العلم.....“ (تذکرہ الحفاظ: ۷۸/۱) (۷۴)

۲ اصل الفاظ ہیں: ”کان رأسا فی العلم والعمل“ (تذکرہ الحفاظ: ۱/۹۰) (۷۹)

ظاہر ہے کہ ایک ہی زمانہ کے سب لوگ بے نظیر اور بے مثال نہیں ہو سکتے۔
آگے چل کر مصنف نے لکھا ہے:

① ”امام مالک کا بچھو کاٹنے کا واقعہ اور نو سوا ساتذہ سے تعلیم حاصل کرنا، ہر فقرہ اپنی تردید کر رہا ہے۔ نو سوا ساتذہ سے پڑھا بھی، پھر سترہ برس میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ نو سوا ساتذہ کہاں جمع تھے؟ اگر ایک استاد کے ہاں کم از کم ایک ماہ بھی بسر کیا تھا، تو بھی ان کا زمانہ تعلیم مکھتر برس بنتا ہے۔“

② ”ایک دن حضرت علی نے تمام صحابہ کو جمع کر کے حکم دیا کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد ہر شخص پہلا کام یہ کرے کہ اپنے ذخیرہ احادیث کو جلا ڈالے۔“

(مختصر جامع بیان العلم: ۳۳)

③ علامہ ذہبی کہتے ہیں: ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب کو روایت احادیث پر پٹا^۱ اور اسی جرم میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوذر اور حضرت ابوالدرداء جیسے عظیم المرتبت اصحاب کو قید کر دیا تھا۔

(تذکرۃ الحفاظ: ۱/۷)

ان صحابہ کو سزا اس لئے ملی ہوگی کہ وہ صحیح اور غلط میں امتیاز نہیں کر سکتے ہو گئے۔
④ ”آج عبداللہ بن مسعود کی طرف سے کئی احادیث منسوب ہیں۔ لیکن ابو عمرو شیبانی بیان کرتے ہیں: میں ان کی خدمت میں برسوں رہا، مگر ان سے کوئی

⑤ مقرر نے ان الفاظ کو نقل کرنے میں صریح بیانی کا مظاہرہ کیا ہے، مذکورہ بالا مصدر میں کہیں بھی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو روایت حدیث پر پٹنے کا ذکر نہیں۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ”أما إني لم أتهمك ولكني أحسب أن أتيت“ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۸) حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وقد كان عمر بن الخطاب رضي الله عنه يكرم أبينا ويحباه ويستغفبه ولما توفي قال عمر اليوم مات سيد المسلمين“ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۷)

حدیث نہیں سنی۔“ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۴)

④ ”ابو اسحاق، مرہ سے اور وہ عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب تمہیں حصول علم کی ضرورت ہو، تو قرآن پڑھو، اس لئے کہ اس میں اولین و آخرین کا علم موجود ہے۔“ (تذکرۃ: ۱/ ۱۱۴)

⑤ ”ایک شخص نے ابی بن کعب سے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے، فرمایا: ”اتخذ کتاب اللہ وارض بہ حکما“ (تذکرۃ: ۱/ ۱۵)

⑥ ”عبداللہ بن عباس سینکڑوں احادیث کے راوی ہیں، مگر آپ کی عمر نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت ۴۳ برس تھی۔“ (تذکرۃ: ۱/ ۳۴)

⑦ ”ایک مرتبہ کاتب وحی زید بن ثابت نے امیر معاویہ کو چند احادیث لکھائیں، منشی لکھتا گیا، آپ نے کاغذ لے کر چیر ڈالا اور کہا: رسول اللہ ﷺ نے احادیث کے لکھنے سے منع فرمایا ہے۔“ (جامع بیان العلم: ۳۲)

⑧ ”ابوموسیٰ اشعری کے استئذان کے واقعہ کے بعد لکھتے ہیں: ”خوش قسمتی سے انہیں شہادت مل گئی، ورنہ پٹ جاتے۔“ (تذکرۃ: ۱/ ۶۷)

⑨ حضرت عبداللہ بن مسعود نے پانی منگوا یا اور اس کتاب کو جسے مسود بن ہلال لے کر گیا اور جس میں احادیث درج تھیں، دھو ڈالا، پھر جلا ڈالا۔“ (جامع: ۳۳)

⑩ ”ضحاک بن مزاحم (وفات ۱۰۵ھ) فرمایا کرتے تھے:

”وہ زمانہ جلد آرہا ہے جب احادیث بکثرت ہو جائیں گی۔ لوگ کتاب الہی کو ترک کر دیں گے۔ مڑیاں اس پر جالے تنیں گی اور وہ گرد و غبار کے نیچے یوں دب جائے گی کہ نظر تک نہیں آئے گی۔“ (جامع: ۳۳)

⑪ عبداللہ بن مسعود کے پاس اسود نے ایک مجموعہ احادیث پیش کیا۔ آپ نے خادمہ سے پانی منگوا کر اس کو دھو ڈالا، پھر فرمایا:

”إن هذه القلوب أوعية فاشتغلوها بالقرآن ولا تشتغلوها

بغيره“ (جامع: ۳۳)

﴿۱۳﴾ ”منصور، مغیرہ اور اعمش کتابِ حدیث کو گناہ سمجھتے تھے۔“ (جامع: ۳۴)

﴿۱۴﴾ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی طرف جانے والوں کو الوداع کہتے ہوئے فرمایا:

”عراق والوں کو احادیث میں پھنسا کر قرآن سے دور نہ پھینکنا۔“

(تذکرۃ الحفاظ: ۶، جامع بیان العلم: ۱۷۴)

﴿۱۵﴾ ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رحلت سے صرف تین برس قبل مشرف بہ اسلام ہوئے،

لیکن احادیث میں سب سے بازی لے گئے۔ اور احادیث بھی ایسی کہ سارا

قرآن ایک طرف اور ابو ہریرہ کی احادیث دوسری طرف! یہ ایک دفعہ پڑھے بھی،

مگر روایت سے باز نہ آئے۔“ (پھر وہ مسلم والی روایت جس میں ”لا إله إلا

اللہ“ پر جنت کی بشارت کا ذکر ہے، بیان کی) اس حدیث پر مصنف نے

مندرجہ ذیل اعتراضات کئے ہیں:

ا: نہ صوم، نہ صلوٰۃ، نہ زکوٰۃ، نہ جہاد اکبر، نہ اصغر۔

ب: پھر حضرت عمر کا حکم کہ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ

”لقد حدثکم بأحادیث لو حدثت بها فی زمن عمر بن

الخطاب لضربنی بالدرة“ (تذکرہ: ۸)

﴿۱۶﴾ ہمارے موجودہ علماء میں ایک دو بڑی خوبیاں ہیں:

اول: ان کا دامن وضع احادیث سے ملوث نہیں۔

دوم: انہیں سرور کائنات سے گہری محبت ہے۔

اور ایک دو خرابیاں بھی ہیں۔

﴿۱۷﴾ اولاً: یہ کہ ملکہ تنقید سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے صحیح یا غلط میں تمیز نہیں کر پاتے۔

❧ دوم: یہ کہ وہ اسلاف پرستی اور اندھی تقلید میں مبتلا ہیں۔

شیخ عبدالحق لاکھ چلائیں: ”صحاب میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے،“ علامہ ابن حجر ہزار کہیں کہ صحیح بخاری کی چالیس احادیث جھوٹی ہیں،

(ملاحظہ ہو: الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، صفحہ: ۲۶۸، ۲۷۶)

مصنف کا تردد:

نیز کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف حدیث کے ماننے نہ ماننے میں متردد ہے، کبھی تو کہتے ہیں:

”اسی طرح ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیمات قرآنی کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ صحابہ کرام کی جرأت، شجاعت ایثار، سرفروشی، خدمتِ خلق، حرارتِ ایمانی، عشقِ رسول، تقویٰ اور نظم و ضبط کی حیاتِ انگیز داستانیں سناتی ہیں۔ اس عہد کے تمدن پر مکمل روشنی ڈالتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ اسلام کی حیرت انگیز ترقی کے اسباب کیا تھے؟ آکاسرہ کیوں مٹ گئے؟ قیصرہ کو کیوں شکست ہوئی؟ مٹھی بھر مسلمان سندھ کے ریگستان سے فرانس کی عشرت گاہوں تک کیسے پہنچ گئے؟ لیرے فرمانروا کیسے بن گئے؟ گذریے اور نگ جہانبانی پر کیسے جا بیٹھے؟ وحشی فلسفہ حکمت کا درس کیسے دینے لگے؟ شرابیوں اور جوار یوں میں اس بلا کی پاکیزگی کہاں سے آگئی؟ بتوں کے پجاری ایک خدا، ایک قبیلہ، ایک مرکز اور ایک نصب العین کے تحنیل پر کیسے متحد ہو گئے؟ یہ تمام تفصیل حدیث سے ملتی ہیں اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے، جس پر ہم نازاں ہیں۔ اور جس سے اب تک سینکڑوں

غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں۔“ (یسواں باب : ۳۴۳)

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”کیا سارے قرآن میں حدیث کا ضمنہ بھی کہیں ذکر ہے؟ اگر نہیں ہے تو

آپ اسے ہمارے ایمان کا جزو کیسے بنا رہے ہیں؟“ (صفحہ: ۱۰۰)

اور ایک جگہ فرماتے ہیں:

”لیکن حدیث! توبہ ہی بھلی، اس کا تو وہ ستیاناس ہوا کہ اس سے زیادہ

محرف، بربدہ، تراشیدہ اور مسخ شدہ لٹریچر دنیا کے صفحے پر موجود نہیں۔“

(صفحہ: ۱۰۸)

اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

”اس میں کلام نہیں کہ حضور کے ان اوصاف جمیلہ کا چرچا احادیث کی

بدولت ہوا اور ہم سب حدیث کے اس گراں بہار ذخیرہ پر ہمیشہ ناز کرتے

رہیں گے۔“ (صفحہ: ۱۹۹)

ان تحریروں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ڈرامائی انداز میں لکھ رہے

ہیں۔ حقیقت سے نقاب اٹھانا، ان کے پیش نظر نہیں۔ چنانچہ اپنے متعلق خود مصنف

لکھتے ہیں:

”اور آج جب کہ میری عمر ۴۷ سے کچھ اوپر ہو چکی ہے، علم کے کئی منازل

طے کر چکا ہوں، متانت، حقیقت اور واقعیت کی قدر و قیمت سے آگاہ

ہوں، پھر بھی داستانِ سرائی، مبالغہ اور رنگ آمیزی سے پوری طرح نہیں بچ

سکا۔“ (صفحہ: ۱۲۱)

مصنف نے حدیث کا مطالعہ کرتے وقت دماغ سے کام نہیں لیا، جب کسی غلط فہمی

کی بناء پر یہ سمجھا کہ یہ حدیث میرے مذاق کے مطابق ہے، فوراً اپنی طرف سے ترجمہ

کر کے لکھ دی۔ چنانچہ متضاد احادیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”آنحضرت ﷺ نے عورتوں کے ایک مجمع کو خطاب کیا۔ دورانِ تقریر میں

فرمایا ”جو عورت تین بچے پیدا کرے گی، اللہ اسے نارِ جہنم سے بچالے گا۔“

ایک عورت کہنے لگی، ”اور دو بچوں والی؟“ فرمایا: دو والی بھی جنت میں

جائے گی۔“ (بخاری: ۲۰/۱، دو اسلام: ۳۰۵)

یہ ہے مبلغِ علم!! حدیث میں بچوں کی موت پر صبر کا ذکر ہے اور اسی پر اجر کا بیان ہو رہا ہے^۱ اور آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ بچے جننے پر جنت مل رہی ہے۔ سبحان اللہ!

مندرجہ بالا باتوں کا جواب دینے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے بارہ میں محدثین نے جو کوششیں فرمائی ہیں، ان کا مختصر جائزہ لیا جائے اس ذیل میں ہم تین امور کو زیرِ بحث لائیں گے:

① حقیقت حدیث۔

② حجیت حدیث۔

③ حفاظت و کتابت حدیث۔

● صحیح البخاری: کتاب العلم، هل يجعل للنساء يوم على حدة في العلم، رقم الحديث (۱۰۱)، صحیح مسلم: کتاب البر و الصلة، باب فضل من يموت له ولد فيحسبه، رقم الحديث (۲۶۳۳)

حقیقت و حجیت حدیث

حدیث کی تعریف:

حدیث اصل میں رسول اللہ ﷺ کے فعل، قول، آپ ﷺ کی تقریر اور آپ ﷺ سے متعلقہ امور کا نام ہے۔

افعالِ رسول کی اقسام:

آپ ﷺ کے فعل کی دو قسمیں ہیں:

اول: وہ امور جن کا تعلق آپ ﷺ کی عادتِ مبارک سے ہے۔

دوم: وہ کہ جن کا تعلق عبادت سے ہے۔

انبیاء ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہوتے ہیں، اس واسطے ان کے افعال سے کم از کم یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلاں کام جائز ہے، بشرطیکہ اس فعل کے متعلق یہ ثابت نہ ہو کہ پیغمبر (نبی کریم ﷺ) کے ساتھ مخصوص ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تردید بھی وارد نہ ہوئی ہو۔

اقوالِ رسول کی اقسام:

اور آپ ﷺ کے قول کی بھی دو قسمیں ہیں:

ا: امر و نہی۔

ب: اخبار، واقعات، ترغیبات اور فضائل و مناقب وغیرہ۔

اس میں اصل ایجاب اور نہی میں اصل تحریم ہے، جیسے قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱ ﴾

”جو نبی کے حکم کے خلاف کرتے ہیں، ان کو اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ وہ فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں، یا عذاب الیم کی گرفت میں نہ آجائیں۔“
اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونُوا لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۝۲ ﴾

”کسی مومن مرد یا عورت کو اختیار نہیں رہتا، جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا فیصلہ کر دے۔“

فرمانِ رسول کی شرعی حیثیت:

اگر کوئی کہے: نبی قرآن کے سوا کیسے حکم کرے گا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں یہ بحث نہیں کہ یہ حکم قرآن کے خلاف ہے یا موافق، بلکہ اس بات کا ذکر ہے کہ جب کسی امر کے متعلق یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے کہ یہ نبی کا فرمان ہے۔ اس وقت کیا کرنا چاہئے، کیا اس وقت صرف یہ کہہ کر کہ ”یہ قرآن نہیں، ہم اس کی پابندی کے مامور نہیں۔“ سبکدوش ہو سکتے ہیں یا ہم اس وقت پابند رہنے کے مامور ہیں؟

”دوا سلام“ کے (صفحہ: ۱۱۱) میں لکھا ہے:

”تو کیا اقوال رسول قابلِ ایمان نہیں؟ جواب: کیوں نہیں! بشرطیکہ کہیں سے قول رسول مل جائے۔ رونا تو اسی بات کا ہے کہ اقوال رسول کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے۔ اگر اقوال رسول مل جائیں، تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جائے۔“

مصنف نے پھر اس امر کا اقرار کیا ہے کہ اقوال رسول پر ایمان لانا ضروری ہے، مگر اس کے دستیاب ہونے میں تردد کا اظہار کیا ہے۔
 بلکہ (صفحہ ۱۲۹) میں لکھا ہے:
 ”در اصل اقوال رسول کی تعداد پانچ سات ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔“

احادیث کی تعداد:

حالانکہ صحیح بخاری میں اصل احادیث کی تعداد اس سے بہت کم ہے، کل اڑھائی ہزار کے قریب ہے۔ احکام کی روایات اس سے بھی کم ہیں۔ بعض علماء نے ان کی تعداد صرف بارہ سو بتلائی ہے، اور چودہ لاکھ کا یہ مطلب نہیں (جس کا ذکر مصنف نے کیا ہے) کہ احادیث کی اصل تعداد چودہ لاکھ ہے، بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہی احادیث مختلف طرق اور اسانید کی بناء پر چودہ لاکھ بن جاتی ہیں۔

امام ابو داؤد نے سنن کا مجموعہ پانچ لاکھ سے تیار کیا ہے اور فرماتے ہیں:
 ”میں نے کوئی صحیح حدیث نہیں چھوڑی۔“ یعنی قریب قریب پانچ لاکھ کی پانچ لاکھ سب اس مجموعہ میں درج ہو چکی ہیں، حالانکہ سنن ابی داؤد میں صرف ۴۸۰۰ کے قریب احادیث ہیں۔^① پس چودہ لاکھ کا یہ مطلب نہیں کہ احادیث کی گنتی بڑھ کر

① رسالۃ ابی داؤد إلی أهل مكة: ۳۵

چودہ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ یہ بالکل بے معنی بات ہے، بلکہ مرورِ زمانہ کی بناء پر چونکہ ایک ایک حدیث کی تین تین سو سندیں پھیل چکی تھیں، لہذا مختلف اسانید کی بنا پر ان کی گنتی بڑھتی گئی۔^① جیسے صحیح بخاری کی تعداد احادیث حافظ ابن حجر نے ۹۰۸۲ بتلائی ہے، تکرار کو چھوڑ کر اصل گنتی ۲۶۰۲ رہ جاتی ہے۔^② ایک حدیث کے جتنے طرق ہونگے، اسی قدر اس کو قوت ہوگی، پس ایک حدیث اگر سو طرق سے مروی ہوگی، تو وہ اس حدیث سے زیادہ قوی ہوگی، جو صرف ایک طریق سے مروی ہے۔

① ویکس: علوم الحدیث لابن الصلاح: ۱۰، توجیہ النظر: ۴۱/۱

② ہدی الساری: ۴۶۹، ۴۷۷، فتح المغیث: ۵۹/۱

حفاظت و کتابت حدیث

کتاب احادیث کے طبقات:

اس وقت حدیث کا وجود صرف کتابوں میں ہے اور حدیث کی کتابیں پانچ قسم کی ہیں:

طبقہ اولیٰ:

بعض وہ ہیں جن میں صرف صحیح احادیث پائی جاتی ہیں، جیسے بخاری و مسلم۔ ان دونوں کتابوں میں قریب قریب کل احادیث باتفاق امت صحیح ہیں۔ صرف دو سو کے قریب ایسی احادیث ہیں، جن میں علماء محققین نے بحث کی ہے۔ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ حدیثیں بھی صحیح ہیں۔^① صرف بعض احادیث کے چند کلمات ایسے ہیں، جو شاذ ہیں۔ بعض محققین نے ”مؤطا“ کو بھی ”صحیحین“ کے ساتھ ملایا ہے اور تینوں کتابوں کو طبقہ اولیٰ میں شمار کیا ہے۔^②

طبقہ ثانیہ:

دوسری قسم کی کتابیں وہ ہیں، جن میں صحیح، حسن، ضعیف، ہر طرح کی

① حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحیحین میں احادیث منتقدہ کی تعداد ایک سو دس (۱۱۰) ہے۔ (مہدی

السناری: ۳۴۶)

② جیسا کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ (حجة الله البالغة: ۱/۱۰۵)

حدیثیں ہیں۔ مگر ان کے مؤلفین نے التزام کیا ہے کہ اگر حدیث ضعیف ہو، تو اس کا ضعف بیان کر دیں گے۔ اس طبقہ میں تین کتابیں ہیں:

① سنن أبی داود۔

② سنن نسائی۔

③ جامع ترمذی۔

اس طبقہ کی احادیث پر بحث کی گنجائش ہے، مندرجہ بالا دو طبقوں کو ”صحاح ستہ“ کہتے ہیں۔ ”صحاح ستہ“ کی ہر حدیث صحیح نہیں، مگر ان سے ”صحیح“ کا معلوم کرنا بہت آسان ہے، کیونکہ عام طور پر محدثین نے التزام کیا ہے۔ اگر ضعف ہو، تو بیان کر دیں گے اور جہاں ضعف بیان نہ کیا ہو، تو وہ حدیث ”حسن“ یا ”صحیح“ ہوتی ہے۔ بہت کم ایسے مواقع ہیں، جہاں بحث کی ضرورت ہوتی ہے ان دو طبقوں پر محدثین کا عمل ہے۔

طبقہ ثالثہ:

تیسری قسم کی کتابیں وہ ہیں، جن میں صحیح، حسن، ضعیف، منکر، شاذ ہر طرح کی احادیث ہیں، مگر محدثین نے اس امر کا التزام نہیں کیا کہ جہاں ضعف ہو ضرور بیان کر دیں۔ بعض جگہ بیان کرتے ہیں اور بعض جگہ بیان نہیں کرتے۔ مگر ایک محقق آدمی أسماء الرجال کی مدد سے ان کا حال معلوم کر سکتا ہے اور اسی طبقہ میں بعض ایسی کتابیں بھی ہیں، جن کے مصنفین نے صحت کا التزام کیا ہے مگر محدثین نے ان کے حکم کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ ان کی احادیث کو محققین محدثین کے حوالے کیا، جنہوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اگر ایسی کتاب میں کوئی حدیث ہو اور کسی محقق نے اس پر کلام نہیں کیا، تو صاحب کتاب کا فیصلہ معتبر ہے یہ تیسرا طبقہ ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

ابن ماجہ، دارمی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن أبی شیبہ،

مسند أبی یعلیٰ، مسند أحمد، مسند شافعی، مسند عبد بن حمید، مسند ایبداود طرابلسی، طحاوی، کتب بیہقی، دارقطنی، مستدرک حاکم، صحیح ابن حبان صحیح ابن خزیمة، صحیح ابن سکن، صحیح أبی عوانة مختارة ضیاء مقدسی، منتقی، تصانیف طبرانی وغیرہ۔

طبقہ رابعہ:

چوتھی قسم کی کتابیں وہ ہیں، جن کے تفردات سب ضعیف ہوتے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: کتاب الضعفاء لابن حبان، کتاب الضعفاء للعقيلي ابو حیان کی کتابیں، مسند فردوس، تفسیر ابن جریر وغیرہ۔

طبقہ خامسہ:

پانچویں قسم کی کتابیں وہ ہیں، جن میں محدثین نے موضوع حدیثیں جمع کی ہیں۔ جیسے تذکرۃ الموضوعات، موضوعات کبیر ملا علی قاری، اللالی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة للسيوطي، ابن جوزی کی کتاب جس پر سیوطی کے تعقبات ہیں، اللؤلؤ المصنوع فی الحديث الموضوع، امام شوکانی کا رسالہ۔^①

ماحصل یہ ہے کہ جو حدیث باتفاق محدثین ”صحیح“ ہو، جیسے بخاری و مسلم کی وہ روایات کہ جن پر محدثین نے جرح نہیں کی اور باقی صحاح ستہ اور دیگر کتب کی وہ روایتیں جن پر کسی محدث نے صحت کا فتویٰ لگایا ہو اور اس کے خلاف کوئی قابل قبول

① امام شوکانی کی کتاب کا نام ہے: ”الفوائد المجموعة فی الأحادیث الموضوعة“ کتب احادیث

کی مذکورہ بالا پانچ طبقات میں تقسیم شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے بیان کی ہے۔ (حجة الله

البالغة: ۱/۱۰۵)

فتویٰ نہ ہو، وہ حدیث حجت ہے۔ اسی طرح جو ”حسن“ ہو، وہ بھی قابل عمل ہے۔

صحیح حدیث کی اقسام:

اور ”صحیح حدیث“ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی صحت پر امت کا اتفاق ہے، جیسے بخاری و مسلم کی وہ روایات جن پر کسی نے تنقید نہیں کی اور ان کے معانی میں تعارض بھی نہیں۔ ان احادیث کی صحت قطعی ہے، بغیر بحث کے ان پر عمل ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان کا مضمون بھی قطعی الثبوت ہے، یعنی سننے والوں کو ان احادیث کے مضمون کا یقین ہو جاتا ہے، بشرطیکہ ان کے اوصاف سے بھی واقف ہو۔ یا امت کے اتفاق کا اس کو علم ہو۔

یہ روایتیں بھی دو قسم کی ہیں۔ بعض متواتر ہیں اور بعض غیر متواتر۔

متواتر کی اقسام:

متواتر کی پھر دو قسمیں ہیں:

1 متواتر بالعمل

2 متواتر بالروایۃ

صحیح حدیث پر عمل واجب ہے:

اور جو حدیثیں صحیح ہیں، مگر ان کی صحت پر امت کا اجماع نہ ہو، تو ایسی حدیثوں کے متعلق علماء کا یہی خیال ہے کہ ان سے علم کا وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو عمل کیلئے ضروری ہوتا ہے۔

صحیح حدیث کی شرائط قرآن سے مأخوذ ہیں:

جن قواعد پر محدثین نے احادیث کو جانچا ہے، وہ قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔

محدثین نے صحت کیلئے پانچ شرطیں لگائی ہیں:

① سب راوی مصنف سے لیکر نبی کریم ﷺ تک ثقہ اور عادل ہوں۔ عادل کا مطلب یہ ہے کہ امانت دار، پرہیزگار اور سچا ہو۔

② ان کا حافظہ اچھا ہو۔

③ سند میں جس قدر راوی ہیں، ایک دوسرے سے ان کی ملاقات اور سماع (یعنی حدیث سننا) ثابت ہو۔

④ راوی نے اس حدیث میں غلطی نہ کی ہو۔ اکثر کی یا اپنے سے زیادہ ”ثقہ“ کی مخالفت نہ کی ہو۔

⑤ اس حدیث کے متعلق عدم سماع کی مخفی دلیل نہ ہو، یعنی علت نہ ہو۔

ان تمام شرائط کا یہ مطلب ہے کہ کوئی راوی فاسق یا مجہول نہ ہو۔ قرآن مجید کی آیت ذیل سے یہ شرائط ماخوذ ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ.....﴾^①

”اگر کوئی فاسق خبر لائے، تو اس خبر کی چھان بین کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم جہالت سے کوئی غلط کام کر بیٹھو۔“

یعنی اگر خبر عادل ہو، تو اس کی خبر پر عمل کرو، کیونکہ اس کی خبر سے جہالت جاتی رہتی ہے اور فاسق کی خبر سے علم حاصل نہیں ہوتا۔ اسی واسطے شہادت میں ایک مرد کے ساتھ قرآن مجید میں دو عورتوں کا ذکر ہے، اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ غلطی سے بچا جائے۔^②

① الحجرات: ۶

② البقرة: ۲۸۲

چنانچہ مندرجہ بالا شرائط اسی لئے لگائی گئی ہیں کہ راوی کے متعلق پتہ چل جائے کہ فاسق ہے یا عادل؟ حافظہ اچھا ہے یا نہیں؟ یا حافظہ ہونے کے باوجود کبھی بھول تو نہیں جاتا؟ نیز واسطہ کا بھی علم ہو جائے کہ کیسا ہے؟ انسانی جدوجہد میں اتنی ہی گنجائش ہے اور اسی کا انسان مکلف ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمْ الْمُؤْمِنَاتُ مِنْهَا جَرَائِدٌ فَامْتَحِنُوهُنَّ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۚ﴾¹

”جب ایماندار عورتیں تمہارے پاس وطن چھوڑ کر آئیں، تو ان کا امتحان کرو۔ اللہ کو ان کے ایمان کا تم سے زیادہ علم ہے۔ اگر تم کو ان کے ایمان کا علم ہو، تو ان کو کفار کے حوالے مت کرو۔“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان اپنی سی جدوجہد کرے اور انتہائی کوشش کے بعد جس نتیجے پر پہنچے، وہی اس کا علم ہے۔ یہاں ایک اور نکتہ ہے اور وہ یہ کہ شریعت کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لی ہے۔ اس واسطے ضروری ہے کہ جب ہم اپنی جدوجہد اور انتہائی کوشش کے باوجود شریعت کی ایک بات کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہیں، اگر اس میں کسی قسم کی غلطی ہو، تو ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر کوئی دلیل قائم کرے، جس سے ہمیں غلطی پر اطلاع ہو جائے۔

صحیح حدیث کی دیگر شرائط:

اب یہ امر زیر بحث لانا باقی رہ جاتا ہے کہ اگر کوئی حدیث ان پانچ شرائط پر

مشتمل ہو اور امت میں سے کسی محدث یا مجتہد کو اس میں کسی غلطی کا علم بھی نہیں ہوا، تو کیا حدیث کی صحت کیلئے اسی قدر کافی ہے یا اور شرائط کی بھی ضرورت ہے؟ بعض علماء کا خیال ہے کہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ حدیث مذکورہ شرائط کے علاوہ عقل، قرآن اور حدیث متواتر کے خلاف نہ ہو۔ مگر محدثین نے فرمایا ہے کہ جو حدیث مذکورہ شرائط پر پوری اترتی ہے، وہ عقل، قرآن اور حدیث متواتر کے خلاف نہیں پائی گئی، اس کی تشریح اس طرح ہے:

دلیل کی اقسام:

دلائل دو قسم کے ہیں: عقلی اور نقلی۔

پھر ان کی بھی دو قسمیں: یقینی اور غیر یقینی۔

متواتر اور اجماعی الصحت ^① حدیث یقینی ہے اور باقی غیر یقینی۔ اسی طرح عقلی باتیں بعض یقینی ہوتی ہیں، جیسے بدیہیات وغیرہ اور بعض غیر یقینی، جیسے نظریات۔ محققین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دلیل نقلی یقینی اور عقلی یقینی میں تعارض نہیں ہوتا اور نہ یقینی دلائل عقلیہ کا آپس میں، نہ یقینی دلائل نقلیہ کا آپس میں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دلیل یقینی ہو اور دوسری ظنی، اگر اس طرح کی کوئی صورت ہو، تو اس وقت یقینی کو ظنی پر ترجیح ہوگی۔ مثلاً حدیث متواتر یا اجماعی الصحت نہ ہو، بدیہیات کے خلاف ہو، وہ مردود ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی نظریہ حدیث متواتر، قرآن یا حدیث اجماعی الصحت کے خلاف ہو، تو وہ نظریہ مردود ہوگا۔ مگر یہ بات بھی فرضی ہے، اب تک کوئی صحیح حدیث کسی عقلی یقینی دلیل کے خلاف نہیں پائی گئی۔ اگر کسی کے دماغ میں

① یعنی جن احادیث کی صحت پر اجماع ہے، جیسے بخاری و مسلم کی وہ احادیث جن پر کسی محدث نے کلام نہیں کیا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتاویٰ ابن تیمیہ: ۴/۴۷

یہ بات بیٹھ جائے کہ فلاں صحیح حدیث بدھیات کے خلاف ہے، وہ اس کی تاویل کر سکتا ہے یا اس کو رد بھی کر سکتا ہے۔

حدیث قرآن کا بیان ہے

بعض احادیث وہ ہیں، جو قرآن مجید کی عملی صورتیں ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اقِیْمُوا الصَّلَاةَ﴾^① یعنی ”نماز قائم کرو۔“

مختلف مقامات پر اس کے اجزاء ”قیام، رکوع، سجود، تسبیح، تحمید، تکبیر، قرأت قرآن“ کا اور اس کی شرائط میں سے ”وضو، جنابت سے غسل وغیرہ“ کا ذکر ہے۔ استقبال قبلہ ایک جگہ بدوں نماز مذکور ہے اور ایک جگہ جماعت کی طرف بھی اشارہ ہے ﴿وَارْکَعُوا مَعَ الرَّاکِعِیْنَ﴾^② اور صلوٰۃ خوف میں باجماعت پڑھنے کا بیان ہے^③ اور نداء کا ذکر ہے۔^④

جمعہ کے دن ذکر اللہ اور نماز کو خاص طور پر بیان فرمایا ہے اور مختلف آیات میں اوقات نماز کی طرف بھی اشارات ہیں۔ مگر حدیث میں ایک خاص طریقہ پر اذان، نماز، اقامت، امامت اور خطبہ جمعہ کا بیان ہے۔ جو قرآن کے مخالف نہیں، بلکہ قرآن کے بیان کردہ منتشر اجزاء کا مجموعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس پر مداومت کی۔ آپ ﷺ کے بعد صحابہ اسی پر عامل رہے، یہاں تک کہ وہ نماز اسی صورت میں ہم تک پہنچی۔ ہر قرن میں نمازیوں کی تعداد قرآن کے ناقلوں (حافظوں اور کاتبوں) سے زیادہ رہی۔ پس نماز جس طریق پر نبی کریم ﷺ نے پڑھی، اس کا ثبوت قرآن

① البقرة: ۴۲

② البقرة: ۴۲

③ النساء: ۱۰۲

④ المائدة: ۵۸، الجمعة: ۹

کے ثبوت سے بڑھ کر ہے۔

قرآن مجید میں ذکر ہے:

﴿وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَذَا كُمْ﴾^①

”اللہ کا ذکر اسی طرح کرو، جیسے تم کو ہدایت کی گئی۔“

اسی طرح قرآن مجید نے ”نداء“ کا ذکر بطور حکایت کے کیا ہے، اس پر استہزاء کرنے والوں کو ڈانٹا ہے۔^② نداء (اذان) کی ہیئت کذائی چونکہ تواتر سے ثابت ہے اور قرآن سے بھی بڑھ کر اس کا تواتر ہے۔ اس واسطے اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ پس لازماً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی کریم ﷺ نے یہ نماز یا نداء منشا قرآن کے خلاف نہیں پڑھی ہوگی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہوگی۔ اگر قرآن کے منتشر اجزاء اور حدیث میں ان کے اجتماع کو بیک نظر دیکھا جائے، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا عمل قرآن کے اس الہام کا بیان ہے، جو نماز کے متعلق قرآن نے اختیار کیا ہے۔

شریعت ہم تک کیسے پہنچی؟

مگر ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ شریعت ہم تک دو طریقوں سے پہنچی ہے:

ایک تعامل، یعنی ہر زمانہ میں لوگ ایک کام پر عمل کرتے آئے۔

دوم: روایت، جو کتب حدیث میں موجود ہیں۔

ہر ایک میں ایک نقص ہے، جس کا جبر دوسرے طریقہ سے ہو جاتا ہے۔ تعامل میں یہ نقص ہے کہ کبھی بعد کا پیدا شدہ عمل بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے رفع کرنے کیلئے ہمیں روایت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

① البقرة: ۱۹۸

② المائدة: ۵۸

اور اسی طرح روایات میں ابہام ہوتا ہے، جو عمل سے رفع ہو جاتا ہے۔ لفظ میں ایک سے زیادہ احتمال ہوتے ہیں، مگر تعالٰی سے ایک شق متعین ہو جاتی ہے۔ یہی حال قرآن مجید کے اور مقامات کا ہے۔

حج کا بیان حدیث میں ہے:

مثلاً حج کے متعلق قرآن مجید نے حلال ہونے اور محرم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ مگر احرام باندھنے کے متعلق سوائے سر منڈانے، مجامعت کرنے اور شکار کرنے کی ممانعت کے اور چیزوں کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح بیت اللہ کے طواف کا ذکر کیا، اس کی کنتی اور وقت کے بارے میں نہیں بتایا، یہی حال صفا و مروہ کے طواف کا ہے، اس کیلئے کوئی کنتی نہیں بتائی۔

رسول اللہ ﷺ نے سات دفعہ طواف کیا اور احرام میں خوشبو لگانے اور سلے ہوئے کپڑے پہننے کی ممانعت، نیز مرد کو سرنگا رکھنے کا حکم دیا۔ اجمار کے بعد حلال ہونے کو کہا، اگر قربانی لازم نہ ہو، ورنہ قربانی کرنے کے بعد، اور عمرہ میں بیت اللہ کے طواف اور صفا و مروہ میں سعی پر اکتفا فرمایا۔ احرام باندھنے کیلئے ”مواقبت“ کو متعین کیا۔ قرآن مجید نے صرف یہ کہا کہ ﴿الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ﴾ ❶ مگر ان کی تعیین نہیں کی۔

نبی کریم ﷺ نے جس طرح حج کیا، آپ ﷺ کو ہزاروں آدمیوں نے دیکھا، پھر ہر سال آپ ﷺ کے خلفاء حج کرتے رہے، تعالٰی اور روایت سے حج کا طریقہ نماز کی طرح ہم تک پہنچا۔

احکام زکاة کی تفصیل حدیث میں ہے:

یہی حال زکوة کا ہے۔ قرآن مجید نے کہا کہ زکوة ادا کرو۔ مگر اس کا اندازہ نہیں بتایا، نہ مال کی مقدار متعین کی اور نہ ہی نصاب بیان فرمایا۔ آنحضرت ﷺ نے نصاب مال اور زکوة متعین کی اور ایک رقعہ میں لکھا دیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی ایک نقل حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دی اور مختلف عمال کو اس کی نقلیں بھیجیں۔^① وہی حکومت کا قانون بنا، اس وجہ سے رد و بدل سے محفوظ ہو گیا۔ قرآن کی یہ آیت ﴿لَتَبْلِيَنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَلَ إِلَيْهِمْ﴾^② ان احادیث پر ٹھیک منطبق ہو جاتی ہے۔

حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے:

اگر کوئی کہے کہ ہم نماز کی ایسی تفسیر کریں گے، جو ان احادیث کی محتاج نہ ہوگی، اسی طرح حج کی اور زکوة کی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس نماز کی تفسیر نہ ہوگی، جو قرآن کے زمانہ نزول میں پڑھی جاتی تھی اور آج تک تواتر عملی سے ہم تک پہنچی ہے، بلکہ وہ اور نماز ہوگی، اسی طرح وہ حج نہ ہوگا، جو زمانہ نزول قرآن میں کیا جاتا تھا، ایک نئی اصطلاح ہوگی، اسی طرح وہ زکوة بھی ایک نئی چیز ہوگی۔

اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص ایک آدمی کو کہے، سیا لکوٹ جاؤ اور اتنا کہہ کر خاموش ہو جائے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ سیا لکوٹ سے مراد وہی لیا جائے گا، جو مشہور و معروف ہے۔ اگر مامور یہ کہے (چونکہ متکلم نے سیا لکوٹ کی تفصیل نہیں کی، اس واسطے) میں اپنی طرف سے ایک تفسیر کر لیتا ہوں۔ ”سیال“ کے معنی جاڑا، اور

① صحیح البخاری: کتاب الزکاة، باب صدقة الغنم، رقم الحدیث (۱۳۸۶)، سنن ابی داود (۱۵۶۸)، سنن الترمذی (۶۲۱)، سنن ابن ماجہ (۱۷۹۸)

”کوٹ“ بمعنی کوٹ، پس سیالکوٹ کا معنی ہوا: ”جاڑے والا کوٹ“ اس واسطے میں کوٹ فروش کے پاس چلا جاتا ہوں، تو یہ اس کی حماقت ہوگی۔

اسی طرح جب نماز، زکوٰۃ اور حج کی صورت نبی کریم ﷺ کے وقت سے چلی آتی ہے۔ خود اگر کوئی نئی صورت بنائے، تو یہ اس کی حماقت ہوگی۔

قرآن میں نکاح کا ذکر ہے اور نکاح کا اطلاق ”عقد“ اور ”وطی“ دونوں پر ہوتا ہے۔^① قرآن مجید صرف نکاح کا حکم دیتا ہے اور زنا سے روکتا ہے۔ مگر نکاح کے متعلق کوئی صورت نہیں بتاتا، جس سے نکاح اور زنا میں فرق کیا جاسکے۔

بیانِ قرآن، قرآن سے الگ بھی ہے

قرآن مجید میں ہے:

﴿إِن عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۚ﴾^②

”قرآن کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ جب ہم پڑھیں، تو اس کے پڑھنے کی پیروی کر، پھر اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے۔“

پہلی مثال:

①..... ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ ۚ﴾^③

① القاموس المحيط: ۲۳۷

② القيامة: ۱۷-۱۹

③ البقرة: ۱۴۳

”جس کعبہ پر آپ تھے، اس کو ہم نے اس لئے بنایا تھا، تاکہ ہم اس کو جانیں جو رسول کا متبع ہے اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جاتا ہے۔“
اس آیت میں پہلے ”کعبہ“ کا ذکر ہے اور اس کعبہ کا معین کرنا، من جانب اللہ بتایا گیا ہے، مگر قرآن میں کہیں اس کعبہ کی طرف متنبہ کرنے کا ذکر نہیں۔

دوسری مثال:

①..... ﴿وَإِذْ أَسْرَ النَّبِيُّ إِلَيَّ بِعُضِ أَرْوَاحِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَاكَ هَذَا قَالَ نَبَأَنِي الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ①﴾
”جب (نبی ﷺ) نے اپنی ایک بیوی کو ایک راز بتایا، اس نے آگے اس کا افشا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے آگاہ کیا۔ نبی نے کچھ حصہ اپنی بیوی کو بتلایا اور کچھ نہ بتلایا۔ بیوی نے پوچھا: آپ کو کیسے پتہ چلا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے علیم وخبیر نے بتایا ہے۔“
اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کو قرآن کے علاوہ بھی اللہ کی طرف سے خبر آیا کرتی تھی۔

تیسری مثال:

②..... ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّوْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ ②﴾
”اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچی خواب دکھائی کہ تم مسجد حرام میں انشاء اللہ

① التحريم: ۳

② الفتح: ۲۷

اس سوال کا جواب قرآن مجید نے یہ دیا ہے کہ:

”یہ بات ہماری مرضی پر موقوف ہے جس کو ہم چاہیں اپنی رحمت کے ساتھ خاص کریں۔“^①

پس ثابت ہوا کہ کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے صرف دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص دلائل کا مطالبہ کفار کی عادت ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرے۔

﴿لَا يَسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ﴾^②

”جو اللہ تعالیٰ کرے، اس سے یہ سوال نہیں کیا جاتا کہ ایسا کیوں کیا۔ یہ سوال دوسروں سے ہوتا ہے۔“

کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اس کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ انسان کی سمجھ میں حکمت آئے یا نہ آئے، صرف اس قدر ثابت کر دینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا ہے۔

کتابت اور حجیت

پس جب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے کہ قرآن و حدیث دونوں حجت ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے دونوں میں خود فرق کیا ہے۔ قرآن کو بلحاظ فصاحت و بلاغت کے معجزہ بنایا، اور اس کی کتابت کا باقاعدہ انتظام آنحضرت ﷺ کی معرفت کرایا، تاکہ یہ الفاظ بعینہ محفوظ رہیں اور ان کی تلاوت سے امت مستفید ہو، اور یہ معجزانہ نظم ہمیشہ کے لیے رہے، اور حدیث کو قرآن مجید کی طرح آنحضرت ﷺ کی معرفت اس کی کتابت کا باقاعدہ انتظام نہ کرایا اور دونوں کو حجت ٹھہرایا، اور ہر ایک کی اتباع کو فرض قرار دیا۔ اگر احادیث ہمیشہ کے لیے واجب الاتباع نہ ہوتیں، تو باقاعدہ لکھانے سے

① البقرہ: ۱۱۵

② الانبیاء: ۲۳

بھی ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہ پڑتا، کیونکہ حجت ہونے اور لکھانے میں کوئی تلازم نہیں۔ چنانچہ بہت سی حدیثیں ایسی ہیں، جن کو آپ نے لکھایا، مگر منکرینِ حدیث ان کو بھی واجب الاتباع نہیں سمجھتے، کیونکہ ان کے نزدیک حدیث وقتی تھی۔ پس اگر حدیث لکھا دی جاتی، تب بھی وقتی ہی رہتی، جیسا کہ قرآن مجید میں بھی بعض احکام ایسے ہیں، جو وقتی ہیں، جیسے یہ آیت:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ﴾ ①

”اے ایمان والو! جب تم رسول سے سرگوشی کرو، تو پہلے کچھ صدقہ کر لیا کرو۔“
مگر یہ حکم فقط وقتی ہے، کیونکہ اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی زندگی کے ساتھ ہے، مگر یہ حکم لکھا ہوا ہے۔ لکھا ہوا بھی قرآن مجید میں ہے۔ اسی طرح وہ احکام جن کا تعلق صرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھا، وہ سب کے سب وقتی تھے۔ جیسے یہ حکم:

﴿وَأَمْرًا مُؤْمِنَةً إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ②

”وہ عورت بھی اسے نبی ہم نے تیرے لیے حلال کی ہے جو ایماندار ہو، اپنے نفس کو نبی کے لیے بہہ کرے اور نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ یہ حکم خالص تیرے لیے ہے، دوسرے مومن اس میں شریک نہیں۔“

اسی طرح یہ حکم:

﴿وَلَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ﴾ ③

① المجادلة: ۱۲

② الأحزاب: ۵۰

③ الأحزاب: ۵۲

”اے نبی! اس کے بعد تیرے لیے عورتیں حلال نہیں۔ نہ ان میں تبدیلی کی

اجازت ہے۔ خواہ کتنی ہی خوب صورت ہو۔“

اور دوسرے ایمانداروں کو تبدیلی کی اجازت ہے:

﴿وَإِنْ أَرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۖ﴾ ①

”اگر اپنی بیوی کو بدلنا چاہو، یعنی ایک کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کرنا چاہو (تو پہلی سے مہر واپس نہ لو)۔“

اسی طرح یہ حکم:

﴿وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ

كَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ ②

”اللہ نے تجھ پر کتاب و حکمت (سنت) نازل کی، اور تجھے وہ کچھ سکھایا، جس سے تو واقف نہ تھا، اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔“

اسی طرح یہ حکم:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا.....﴾ ③

آنحضرت ﷺ کی بیویوں سے آپ کے بعد نکاح کرنا منع ہے۔ اللہ کے ہاں یہ بہت بڑا جرم ہے۔

اسی طرح بہت سے احکام ہیں، جو ہمارے لیے پند و عبرت کا باعث تو بن سکتے ہیں، مگر عمل کے اعتبار سے وقتی ہیں۔ جب وقتی احکام قرآن کے اندر لکھے جاسکتے ہیں، تو حدیث لکھنے سے کیسے دائمی بن جاتی۔ پس حدیثیں وقتی بھی ہوں، تب بھی ان

① النساء: ۲۰

② النساء: ۱۱۳

③ الأحزاب: ۵۳

کے لکھنے سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے۔ آپ لوگ (منکرینِ حدیث) تو کہتے ہیں کہ حدیثوں کے احکام ایک دو سورتوں میں بیان کیے جاسکتے تھے۔ اگر ایسا کر دیا جاتا اور اخیر میں یہ کہہ دیا جاتا کہ یہ احکام پائیدار قسم کے ہیں، وقتی ہیں، دائمی نہیں، تو لکھنے سے ان کے دائمی ہونے کا شبہ بھی نہ پڑتا۔ بس یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ احکام نہ لکھنے سے دائمی بنتے ہیں اور نہ نہ لکھنے سے وقتی ہو جاتے ہیں۔

پس جب اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ خلافت راشدہ صرف تیس سال تک چلے گی، بلکہ اس سے کم زمانہ، اس کے بعد شاید چودہویں صدی میں جا کر منکرینِ حدیث کا ایک گروہ پیدا ہو کر خلافت راشدہ کے قائم کرنے کی سعی کرے گا۔ اس وقت جو وقتی بائیلاز (قانونی دستاویز) تیار ہوگا، وہ اس وقت کے لیے مناسب ہوگا۔ پس اس برزخی زمانہ تیرہ سو سال کے لیے امت کو قرآن کے تشریحی بائیلاز سے واقف رکھنے کے لیے ان احکام کو جو حدیث میں ہیں، ایک دو سورتوں میں (بقول آپ کے) لکھ دیا جاتا، تاکہ خلافت راشدہ کے قیام ثانی تک امت ان سے مستفید ہوتی۔

حدیثِ دائمی حجت ہے

ہم میں اور آپ میں فرق تو صرف وقتی اور دائمی ہونے کا ہے۔ نہ مفید اور غیر مفید ہونے کا۔ دونوں ان احکام کو مفید سمجھتے ہیں۔ ہم اس لیے کہ وہ دائمی شریعت ہیں اور آپ اس لیے کہ دوسرے بائیلاز کے تیار کرنے میں مدد و معاون ہیں اور جب تک تقاضائے زمانی نہیں بدلتا، قابلِ عمل بھی ہیں۔ پس ان احکام کے نہ لکھنے کا اعتراض تو دونوں فریق پر یکساں ہے۔ آپ صرف اسی فریق پر اس کا بوجھ ڈالنا چاہتے ہیں، جو حدیث کو دائمی حجت سمجھتا ہے۔ آپ خود کہتے ہیں:

”لہذا اس تاریخی مسئلہ کو پرکھنے کے لیے ہمارے پاس نہایت صحیح اور محکم معیار خود

کتاب اللہ ہے۔ اس میں جو بات بھی قرآن کے خلاف نظر آئے یا ایسی ہو جس سے حضور ﷺ کی شان میں طعن پایا جاتا ہو، اسے بلا ادنیٰ تاہل الگ کر دیا جائے اور باقی حصہ کو نکھار کر ایک جگہ جمع کر لیا جائے، تاکہ اس سے تاریخی کام لیا جاسکے۔ یہ ہماری تاریخ کا گراں بہا سرمایہ ہوگا، جس پر ہم بجا طور پر ناز کر سکیں گے۔“ ①

اگر یہ بات واقعی ہے کہ یہ ذخیرہ گراں بہا سرمایہ ہے۔ پھر سنت کا وہ حصہ جو بائبل از کہلاتا ہے، وہ بہت قلیل ہوگا۔ وہ تو آپ کے نزدیک بھی نہایت بیش قیمت ہوگا، پس دو بائبل از اگر قرآن میں بیان کر دیے جاتے اور بعد میں یہ کہہ دیا جاتا کہ یہ وقتی ہیں تو کیا ہی اچھا ہوتا، مگر ایسا نہ کرنے سے آپ کے خیال کے مطابق اس کی ایسی گت بنی کہ اللہ کی پناہ!

حاصل کلام یہ ہے کہ حدیث کے حجت ہونے یا نہ ہونے، وقتی ہونے یا دائمی ہونے کی صورت میں جو اختلاف نظر آتا ہے، وہ اس قسم کا نہیں جس میں ایک صورت میں حدیث کا (لکھنا) منع ہو اور دوسری صورت میں واجب ہو بلکہ وقتی ہونے کی صورت میں بھی حدیث کا لکھنا مفید ہے اور دائمی ہونے کی صورت میں اگرچہ مفید ہے، مگر واجب نہیں، کیونکہ حجیت کے لیے لکھنا کوئی ضروری نہیں۔

حدیث نہ لکھنے کا سبب

اگرچہ ایک مسلم مومن کے لیے یہ جواب کافی ہے مگر جس طرح اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، کرتا ہے، مگر آج کل زمانہ اس قسم کا ہے کہ لوگ ہر امر کی کچھ نہ کچھ حکمت بھی معلوم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے ذوق کے مطابق بھی کچھ لکھا جاتا ہے۔ (یہ اس سوال کا دوسرا جواب ہے)

قرآن و سنت میں یہ فرق کہ ”ایک کو فوری طور پر لکھا دیا گیا اور دوسری چیز کے کچھ حصے کو عمل اور حفظ کے حوالہ کیا گیا۔“ اس لیے ہے کہ شریعت کے دونوں حصوں میں اعجاز ظاہر ہو۔ قرآن مجید نظم میں بے نظیر ہونے کی وجہ سے معجز ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت درجہ علیا میں ہے۔ مقصد، الفاظ اور ترکیب میں انسانی دسترس سے باہر ہے۔ جن بھی اس کی نظیر نہیں لاسکتے۔ اس بناء پر رسول کریم ﷺ کی صداقت کی ایک زندہ دائمی نشانی موجود ہے۔

حدیث بلحاظ شرح و بیان، جامع العلوم اور مکمل تعلیم ہونے کی بناء پر ایک بے بہا ذخیرہ ہے۔ اس قسم کی باتوں کا اگر لکھائی کے ساتھ انتظام نہ کیا جائے، تو ان میں اگر حفاظت الہی نہ ہو، تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، مگر باوجود اس کے کہ حدیث کو قرآن کی طرح باقاعدہ طور پر نہیں لکھا گیا، مگر پھر بھی اس کا دینی حصہ جوں کا توں محفوظ رہا۔ ایسا کلام جس کے اجزاء قرآن کی طرح فوری طور پر سب کے سب نہیں لکھے گئے۔ حوادث کے ملاحظ اور عجمی سازشوں کے باوجود اس کا ہمیشہ کے لیے اسی طرح قائم رہنا، اس کی حفاظت کے لیے اسباب کثیرہ کا پیدا کر دینا بھی ایک زندہ معجزہ ہے۔ کیونکہ اس قسم کی حفاظت جو دینی حدیثوں کی گئی ہے، اسی صورت میں ممکن ہے جب تائیدِ غیبی شامل ہو۔

اس امر میں غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان اسباب میں غور کیا جائے، جو اللہ تعالیٰ نے حدیث کے محفوظ رہنے کے لیے پیدا کیے، تاکہ غور کرنے والے کو اس امر کا یقین ہو جائے کہ ان اسباب کے ہوتے ہوئے حدیث میں رد و بدل ناممکن ہے اور اسباب کے پیدا ہونے میں غیبی طاقت کو دخل ہے۔



حفاظتِ حدیث کے اسباب کا اجمالی ذکر

احادیث کو عملی شکل دینا

۱۱ حدیث کی حفاظت کا سبب حدیثوں کو عمل میں داخل کرنا ہے۔

جو حدیثیں نماز کے متعلق ہیں، خواہ نماز کے اوقات سے ہو یا نماز کی دیگر شرائط طہارت و استقبال کعبہ سے یا نماز کے آداب و ارکان سے، یہ تمام حدیثیں ایسی ہیں کہ جن پر چوبیس گھنٹوں میں کم از کم پانچ بار عمل کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ اب جن حدیثوں پر دن رات میں پانچ مرتبہ عمل کیا جائے، وہ کب بھول سکتی ہیں؟ یہی حال ان احادیث کا ہے، جن کا روزوں سے تعلق ہے، اگرچہ فرض روزے سال میں ایک دفعہ آتے ہیں، مگر پورا ایک مہینہ رہتے ہیں اور سال میں نقلی روزے ہمیشہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے آتے رہتے ہیں، ناممکن ہے کہ ایسی حدیثیں بھول جائیں۔

یہی حال حج کا ہے۔ حج اگرچہ عمر میں ایک بار فرض ہوتا ہے۔ مگر حج میں چونکہ لاکھوں آدمی شریک ہوتے ہیں۔ اس واسطے اس میں ان احکام کو بھول جانا، پھر اس بھول کا برقرار رہنا ناممکن ہے۔ مکہ والے تو کم از کم اس کے احکام نہیں بھول سکتے۔

احادیث کو حکومت کا آئین بنانا

۱۲ زکاة و عشر و خراج، قصاص، نکاح و طلاق و عدت، غلاموں کا آزلا کرنا، والدین کے حقوق، زوجین کے حقوق اور اقتصادی امور ان سب کو ریاست کے حوالے

کیا گیا۔ حکومت قائم کر کے ان تمام امور کو منظم کر کے علماء، قضاة، امراء اور عمال کے سپرد کر دیا گیا۔

۳ پھر لوگوں کے دلوں میں دین کی محبت اور آنحضرت ﷺ کی الفت ڈال دی گئی۔
۴ پھر ایسے ایسے حافظہ والوں کو قرآن و سنت کے مسائل سیکھنے کی طرف متوجہ کیا گیا۔

کتابتِ حدیث

۵ بعض ضروری مسائل کو آنحضرت ﷺ نے خود لکھوایا، اور بعض کو صحابہ اور خلفاء نے تحریر کرایا اور کیا۔ یہاں تک کہ تابعین کے زمانہ میں تمام احادیث قریب قریب تحریر میں آ گئیں اور تابعین صحابہ سے سننے والے تھے۔ تابعین کے نسخے صحابہ کے نسخوں پر مشتمل ہوئے اور بعد میں آنے والوں نے تمام شہروں کے نسخوں کو جمع کروایا۔ یہاں تک کہ دوسری صدی میں ساری حدیثیں کتابی شکل میں مجموعوں میں جمع ہو گئیں، مگر ان میں کچھ اختلاط بھی پایا گیا۔ کیونکہ ان تمام کے استیعاب سے یہ غرض تھی کہ ان تمام شائع شدہ ذخیرہ احادیث سے صحیح و ضعیف کو الگ الگ کر دیا جائے۔ جو قابل عمل اور بالکل صحیح ہیں، ان کو الگ کر دیا جائے تاکہ عوام بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے رطب و یابس اور تمام لکھے ہوئے ذخیرے پر بدوں امتیاز عمل ہوتا تھا، بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ پہلے حدیث پر عمل کرنے کے لیے بڑے بڑے محدثین کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ وہ محدثین عوام کی راہ نمائی کرتے تھے، مگر بعد میں جب دو کتابیں ”صحیح بخاری و مسلم“ لکھی گئیں، تو اب عوام کے لیے حدیث پر عمل کرنا آساں ہو گیا۔ آسانی کے لیے چھانٹا گیا، ورنہ پہلے بھی قابل عمل حدیثیں یہی تھیں، مگر ان حدیثوں کے ساتھ لکھی ہوئی تھیں، جو ناقابل عمل

تھیں۔ محدثین نے ان حدیثوں کو معرفت کے لیے لکھا تھا۔ ❶

سوال: ان ناقابل عمل حدیثوں کو کیوں لکھا گیا۔ شروع ہی میں نہ لکھتے، تاکہ چھانٹنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

جواب: شروع میں ان غیر قابل عمل حدیثوں کو اس لیے لکھا گیا کہ حدیثیں لکھنے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ گروہ تھا جو فن حدیث میں ماہر تھے، جن کی بات پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ صحیح اور ضعیف میں پورے طور پر امتیاز کیا کرتے تھے۔ یہی گروہ حدیث کی خدمت کے لیے چنا گیا تھا۔ مگر حدیث پر چونکہ ان کی اجارہ داری نہ تھی، اس لیے دوسرے لوگ بھی اس فن میں مشغول ہو گئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی فن میں ماہر نہ ہو، اس سے غلطیاں ضرور ہوتی ہیں، مگر عوام میں وعظ و تبلیغ کے لیے یہی گروہ پیش پیش ہوتا ہے اور خواص پہلے گروہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔ اگر اس غیر ماہر گروہ کی اغلاط کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے، تو امت کے لیے ایک مستقل خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس واسطے شروع میں تو ان کو لکھ لیا گیا، مگر بعد میں یا تو چھانٹی کے وقت نکال دیا گیا یا ان کی اصلیت پر متنبہ کر دیا گیا، اس

❶ امام ابو الولید الباجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین جب یمن میں عبدالرزاق بن ہمام کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے گئے، تو ایک دن امام احمد نے یحییٰ بن معین کو دیکھا کہ وہ موضوع احادیث لکھ رہے ہیں، امام احمد کہنے لگے: تم کو معلوم ہے کہ یہ احادیث موضوع ہیں، پھر بھی ان کو لکھ رہے ہو! ابن معین فرمانے لگے: مجھے معلوم ہے کہ یہ احادیث موضوع ہیں، لیکن میں انہیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ کہیں کوئی شخص کل کلاں ان احادیث کو صحیح سند کے ساتھ جوڑ کر بیان کرے، تو میں اس کو کہہ سکوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، یہ تو اس ضعیف و موضوع سند سے مروی ہیں۔

اسی طرح سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں تین مقاصد کے لیے احادیث لکھتا ہوں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ضعیف راوی کی احادیث معلوم کر سکوں، امام اوزاعی فرماتے ہیں: جس طرح تم وہ علم حاصل کرتے ہو جو قابل عمل ہے، اسی طرح وہ علم بھی حاصل کرو جو قابل عمل نہیں ہے۔ (التعدیل

والنہجریح: ۱/ ۳۹۰)

طرح کہ تصریح کر دی گئی یا سند کے ذکر کر دینے پر اکتفا کر دیا گیا، تاکہ ماہرین سند سے ہی ان کی حقیقت معلوم کر لیں، یا ضعیف راویوں کے متعلق الگ الگ کتابیں لکھ کر آگاہ کر دیا گیا، جیسے قرآن مجید یا دوسری کتابیں جو طبع ہو کر آتی ہیں، کتابوں کی سستی کی وجہ سے ان میں کمی و بیشی ہو جاتی ہے اور اس کا تذکرہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ کتاب کے پیچھے اغلاط نامہ لگا دیا جاتا ہے، کیونکہ ان اغلاط کا تمام کتاب سے نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

فتنہ وضع حدیث کا تذکرہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک گروہ جو دین کی تخریب کے درپے تھا۔ اس نے حدیثیں بنائیں اور عوام کے لیے ایک فتنہ برپا کر دیا۔ مگر جو گروہ ماہر حدیث اس خدمت پر مامور تھا۔ اس نے جن جن کر ان حدیثوں کو الگ لکھا اور ان کے نام کے متعلق کتابیں لکھیں اور حدیثیں بنانے کے اسباب بیان کیے، یہاں تک کہ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ الگ ہو گیا اور امت اس فتنہ سے بچ گئی اور وضعی احادیث کا ذخیرہ لکھا ہوا لوگوں کے سامنے آ گیا۔^①

جیسے قرآن مجید کے متعلق بھی بعض لوگوں نے کوشش کی کہ غیر محفوظ ہو جائے، مگر ان کی کوشش کارگر نہ ہوئی، بلکہ منکرین حدیث کے نزدیک تو بہت سے قرآن بتائے

① امام عبدہ بن سلیمان فرماتے ہیں: کسی شخص نے عبد اللہ بن مبارک سے کہا کہ ان موضوع احادیث کا کیا ہوگا؟ عبد اللہ بن مبارک فرمانے لگے: ”ان کے لیے نقاد اور راخ علماء زندہ رہیں گے۔“ یعنی امت کو اس فتنہ سے بچائیں گے۔ (الكفاية: ۳۷، التعديل والتجريح: ۲۹۱/۱، فتح المغیث: ۱۱۲/۲، تدریب الراوی: ۲۸۲/۱)

ابی طرح ایک زندیق کو ہارون الرشید کے پاس قتل کرنے کے لیے لایا گیا، تو وہ کہنے لگا: تم لوگ ان ایک ہزار احادیث کا کیا کرو گے، جو میں نے وضع کی ہیں؟ ہارون الرشید نے جواب دیا: اے دشمن خدا! ان احادیث کے لیے عبد اللہ بن مبارک اور ابواسحاق فزاری زندہ ہیں، جو ان کا ایک ایک حرف نکال باہر کریں گے۔ (الموضوعات لابن الجوزي: ۴۵/۱، سیر أعلام النبلاء: ۵۴۲/۸، فتح المغیث: ۱۱۲/۲۔)

گئے، مگر اصل قرآن محفوظ رہا۔ یہی حال احادیث کا ہے کہ حدیثیں وضعی اگرچہ بنائی گئیں، مگر وہ حدیثیں حدیث کے دینی حصہ میں داخل نہ ہو سکیں، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حدیث کے اندر اساتذہ اور تلامذہ کا سلسلہ صحابہ کے زمانہ سے قائم ہو چکا تھا۔ ہر استاذ کے تلامذہ گئے گئے تھے اور ان مشہور اساتذہ کی احادیث شمار کر لی گئی تھیں۔ اب ان میں احادیث داخل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ کیونکہ جو شخص کسی استاذ کا نام لے کر کوئی حدیث بیان کرتا، تو اس کے لیے لازم تھا کہ اس کی سند استاذ کے آگے رسول اللہ ﷺ تک بیان کرے۔ اب اس کی کذب بیانی کا پتہ لگانا بالکل آسان تھا، کیونکہ اس سند کے سلسلہ میں جتنے راوی ہوتے ہیں، ان کے اساتذہ اور تلامذہ معروف تھے اور ان کی حدیثیں بھی معروف تھیں۔ اگر اس نے ایسی حدیث بیان کی جو اس سلسلہ کے راویوں میں کسی ایک کی نہیں، تو ظاہر ہے کہ جھوٹ ہے۔ اس طرح اگر سلسلہ اسناد میں کسی شاگرد کا اضافہ کر دیا یا ایسی سند ذکر کر دی، جو حقیقت میں نہیں، تو اس سے بھی اس کی کذب بیانی ظاہر ہو جاتی۔ اس لیے کسی جھوٹے کا جھوٹ چھپ نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ عوام پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مطلب برآری کی کوشش کرتے تھے، مگر خواص ان سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ دینی علم کا تعلق چونکہ خواص سے ہوتا ہے۔ اسی لیے دین اسی طرح محفوظ رہا۔ چنانچہ دار قطنی نے اپنے زمانہ میں بغداد میں اعلان کیا تھا کہ کوئی شخص موضوع روایت دین میں داخل نہیں کر سکتا۔ ۱ کیونکہ ان کو اسانید پر اتنا عبور تھا کہ اگر کوئی شخص جعلی حدیث بناتا، تو فوراً معلوم کر لیتے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بعض روایات کے بعض الفاظ شاذ ہوں، مگر صحیحین کی ان روایات میں جن پر تنقید نہیں ہوئی، یعنی بعد کے محدثین نے بخاری کے حکم کو صحیح مانا ہے اور بالاجماع وہ صحیح ہیں یا جن میں صحت کا فتویٰ ایک دو محدثوں کا ہے، مگر اس کے

خلاف کسی سے مروی نہیں۔ ان پر شذوذ کا کوئی اثر نہیں۔

احادیث کے ذخیرہ میں صحیح و ضعیف کا مخلوط ہونا اور موضوعات کا دنیا میں پایا جانا، اس بات کو مستلزم نہیں کہ جو حصہ دستور العمل ہے اور محققین محدثین کے نزدیک معتبر ہے، اس میں بھی اختلاط پایا جاتا ہو۔

جیسے قرآن مجید ہمارے سامنے مختلف مطابع میں طبع ہوتا ہے۔ کاتبوں سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ زیروز بر بلکہ بعض جگہ کلمات میں بھی رد و بدل ہو جاتا ہے، مگر قرآن میں نفس الامر کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اگرچہ بعض تھوڑے علم والے جس طرح غلط لکھا ہوا ہوتا ہے، اس طرح ہی پڑھتے ہیں، مگر قرآن کی صحت کے لیے ان پر اعتما د نہیں ہوتا۔

یہی حال حدیث کے ذخیرہ کا ہے کہ اس میں ہر طرح کا مواد موجود ہے، جس کی وجہ روائۃ کی انسانی خامیاں یا دشمنان اسلام کی کارستانیوں اور نادان دوستوں کی بیوقوفیاں ہیں، مگر جو حصہ محدثین کے نزدیک قابل عمل اور صحیح ہے، اس میں اختلاط نہیں۔



حدیث کی کتابت

آنحضرت ﷺ کے عہد میں شروع ہو گئی تھی

بعض لوگ جو علم اور تاریخ سے پوری واقفیت نہیں رکھتے، جب دیکھتے ہیں کہ حدیث کی کتابیں جو مشہور ہیں، اور ”صحاح ستہ“ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان سے پہلی کتاب ”موطا“ دوسری صدی میں لکھی گئی اور باقی (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی) تیسری صدی میں تصنیف ہوئیں، تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حدیث کے لکھنے کا رواج دوسری یا تیسری صدی میں ہوا ہوگا۔ جامعین حدیث نے سنی سنائی باتوں کو جمع کیا ہوگا۔

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ کتابت کا رواج آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں شروع ہو گیا تھا۔ صحاح ستہ میں اکثر وہی احادیث ہیں، جو پہلی صدی میں لکھی گئیں، بلکہ بعض وہ بھی ہیں، جو آنحضرت ﷺ نے خود تحریر کرائیں اور پہلی صدی کے مجموعوں کی سندیں بالکل مختصر ہوتی ہیں۔ بعض جگہ ایک ہی واسطہ ہوتا ہے، یعنی آنحضرت ﷺ اور جمع کرنے والے کے درمیان صرف ایک واسطہ (صحابی) ہوتا ہے۔ کبھی کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ”ہمام بن منبہ“ کا صحیفہ جو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں صرف ایک واسطہ ہے یعنی ابوہریرہ، اور حضرت ابوہریرہ کی وفات 58ھ میں ہوئی ہے، ^① یعنی آنحضرت کی وفات کے 48 سال بعد، اور یہ صحیفہ قطعاً

① حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ ولادت کے بارے میں تین قول ہیں: ۵۷۷-۵۵۸-۵۵۹، دیکھیں:

طبقات خلیفہ بن خیاط: ۱۱۴، الاستیعاب: ۵۷۱/۱، الإصابة: ۴۴۴/۷، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ

نے ۵۷ھ کو راج قرار دیا ہے۔

اس سے پہلے کا ہے۔ اس میں 138 حدیثیں ہیں، یہ سب کی سب ایسی ہیں، جو ”مسند أحمد“ اور ”صحیح بخاری و مسلم“ وغیرہ میں آچکی ہیں۔^① ان کے دیکھنے سے حدیث کی حفاظت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ صحیفہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ احادیث جن الفاظ کے ساتھ ”ہمام بن منبہ“ کے صحیفہ میں ہیں۔ اسی طرح صحیحین وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی کے صحیفہ کی احادیث کس طرح تیسری صدی کے مجموعوں میں بعینہ نقل و نقل ہو کر آئی ہیں کہ ان میں کسی قسم کی کمی و بیشی نہیں ہوئی۔

اسی طرح وہ خط جو آنحضرت ﷺ نے ہر قل کو لکھایا تھا۔^② اس کا فوٹو بھی شائع ہو چکا ہے۔ دیکھو محدثین نے جو الفاظ اس خط کے تیسری صدی میں نقل و نقل کی صورت میں لکھے ہیں، بالکل وہی ہیں۔ حالانکہ اس خط کی نقل آنحضرت ﷺ کے پاس نہ تھی۔ صرف صحابہ نے وہ خط سنا اور یاد کر لیا، پھر نقل و نقل ہوتا ہوا مصنفین تک پہنچا اور اسی طرح محفوظ پہنچا، جیسے لکھا گیا تھا۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک صحیفہ لکھا،^③ جس کو ”صادقہ“ کہتے

① مثلاً دیکھیں: مسند أحمد ۲/۳۱۲-۳۱۹/۲ (۸۱۱۵-۸۲۵۲) بخاری (۱۳۵، ۲۳۷،

۲۷۸، ۲۷۲، ۲۴۰، ۲۵۵، ۳۴۰، ۳۷۷، ۷۷۱) مسلم: (۹۷۷، ۷۷۱)

② صحیح البخاری: بدء الوحي، باب کیف کان بدء الوحي (حدیث: ۷) صحیح مسلم:

کتاب المغازی، باب کتاب النبی ﷺ إلی ہر قل (حدیث: ۴۶۰۷)

③ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، رسول اللہ ﷺ سے سن کر احادیث لکھا کرتے تھے۔ دیکھیں:

صحیح البخاری: کتاب العلم، باب کتاب العلم (حدیث: ۱۱۳)، سنن الترمذی: کتاب

العلم، باب ما جاء فی الرخصة فیہ (حدیث: ۲۶۶۸) بلکہ بعض روایات میں آتا ہے کہ عبداللہ بن

عمرو جو چیز بھی رسول اللہ ﷺ سے سنا کرتے تھے، اس کو لکھ لیتے تھے۔ دیکھیں: سنن أبی داود:

کتاب العلم، باب فی کتاب العلم (حدیث: ۳۶۴۶)، مسند أحمد: ۱۶۲/۲، المستدرک:

(۱۸۷/۱، ۳۵۹)

ہیں۔^① اس کی حدیثیں بھی صحاح ستہ میں موجود ہیں، زکاۃ کا رسالہ آنحضرت ﷺ

← امام حاکم فرماتے ہیں: امام بخاری اور امام مسلم نے الولید بن عبد اللہ کے علاوہ اس حدیث کے رواۃ سے حجت پکڑی ہے، الولید بن عبد اللہ کی یمن میں اختلاف ہے، امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اگر وہ“ ولید بن ابی الولید الشامی“ ہے، تو پھر مسلم کی شرط پر ہے۔“ لیکن وہ ولید بن عبد اللہ بن ابی المغیث العبدری“ ہے۔ جو کہ ”بقہ“ ہے۔ (الکاشف: ۳۵۲/۲، ۶۰۷۳)، تہذیب التہذیب: ۱۱/۱۲۲) امام عراقی رحمہ اللہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور ”صحیح“ کہا ہے (تخریج أحادیث الإحياء: ۲/۲۸۰) شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ”صحیح“ کہا ہے۔ (السلسلة الصحيحة: ۴/۴۵) (۱۵۳۲)

① سنن الدارمی: المقدمة: باب من رخص في كتابة العلم، (حدیث: ۴۹۶)، مسند البزار: ۶/۳۷۴) (۲۳۹۲)، الطبقات الكبرى: ۴۹۴۷، المحدث الفاصل: ۱/۳۶۶، تنقید العلم: ۸۴، تاریخ دمشق: ۳۱/۲۶۲، یہ حدیث ان کتب میں مختلف طرق سے مروی ہے، لیکن زیادہ تر ان کا دارو مدار دو راویوں ”اسحاق بن یحییٰ بن طلحة بن عبد اللہ القرشی“ اور ”لیث بن ابی سلیم“ پر ہے، یہ دونوں ہی ”ضعیف“ ہیں۔ اسحاق بن یحییٰ کو امام احمد نے ”متروک الحدیث“ اور ابن معین نے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں: محدثین اس کے ”حفظ“ میں کلام کرتے ہیں۔ امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: محدثین نے اسے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ (العلل و معرفة الرجال: ۱/۱۰۵، تاریخ ابن معین۔ روایۃ الدوري: ۳/۱۷۳) (۷۶۴) تاریخ الكبير: ۱/۴۰۶، الکامل فی الضعفاء: ۴/۶۸، الضعفاء للعقيلي: ۲/۱۰۳) (۱۲۱)، الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي: ۱/۱۰۵) (۴۱۰) (الکاشف: ۲۳۹/۱) (۳۲۷)

لیث بن ابی سلیم کو ابن عیینہ، أحمد، ابن معین، ابن مہدی اور نسائی نے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ (العلل و معرفة الرجال: ۲/۳۷۹، ۳/۲۹، تاریخ ابن معین۔ روایۃ الدارمی: ۱۵۸) (۵۶۰)، الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي: ۳/۲۹، الکامل فی الضعفاء: ۶/۸۷) (۱۶۱۷)، الضعفاء للعقيلي: ۴/۱۵۰۔ تہذیب التہذیب: ۸/۴۱۷) لیکن کئی علماء نے اس صحیفہ کو ”صحیفہ صادقہ“ کے نام سے ذکر کیا ہے۔ (أسد الغابة: ۱/۶۵۷، صفة الصفوة: ۱/۶۵۵، تنقید العلم: ۱۸۴، عمدة الفکاري: ۲/۱۷۲، تأویل مختلف الحدیث: ۷۸، فتح المغیث: ۱/۱۳۱)۔ حافظ شاہ ولی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس صحیفہ صادقہ کے علاوہ ”صحیفہ یرموکیہ“ بھی تھا، جس میں اہل کتاب کے اقوال تھے۔ (فتح المغیث: ۱/۱۳۰) ←

نے لکھوایا، وہ رسالہ صحیح بخاری وغیرہ میں موجود ہے۔^①

حضور ﷺ کے مکتیب کا ذکر

① صلح حدیبیہ کا معاہدہ جو صحیح بخاری میں منقول ہے،^② اور دیگر معاہدات۔^③

← طبقات ابن سعد میں یہ حدیث اس سند کے ساتھ بھی مروی ہے: ”آخرنا أبو بکر بن عبد اللہ بن ابی اویس عن سلیمان بن بلال عن صفوان بن سلیم عن عبد اللہ بن عمرو.....“ اس سند میں ”صفوان بن سلیم“ اگرچہ ”ثقة“ ہے، لیکن حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقات ثابت نہیں ہے۔ صفوان بن سلیم ۷۲ برس کی عمر میں ۱۳۲ھ کو فوت ہوئے۔ اس حساب سے ان کی تاریخ ولادت ۶۰ھ بنتی ہے۔ اور عبد اللہ بن عمرو ۶۵ھ کو طائف یا مکہ میں فوت ہوئے، امام ابو داؤد فرماتے ہیں: صفوان بن سلیم صرف دو صحابہ: أبو أمامہ اور عبد اللہ بن بسر سے ملے ہیں۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھی انھوں نے نہیں دیکھا (حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ۹۳ھ کو وفات پائی) محدثین نے ان کے اساتذہ میں دیگر صحابہ کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن کسی نے ”عبد اللہ بن عمرو“ کا ذکر نہیں کیا۔

(تہذیب الکمال: ۱۸۴/۱۳، ۲۸۸۲)، (تہذیب التہذیب: ۲۷۳/۴)
علاوہ ازیں ”سلیمان بن بلال“ کی ”صفوان بن سلیم“ سے ملاقات بھی محل نظر ہے۔ کیونکہ ”سلیمان“ کے اساتذہ میں ”صفوان“ کا شمار نہیں ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سلیمان بن بلال کو ”طبقة ثامنة“ اور صفوان بن سلیم کو ”طبقة رابعة“ میں ذکر کیا ہے۔

تقریب التہذیب: ۴۰۵ (۲۵۵۴) و ۴۵۳ (۲۹۴۹)

① صحیح البخاری: کتاب الزکاة، باب زکاة الغنم، رقم الحدیث (۱۳۸۶)، سنن أبی داؤد: کتاب الزکاة، باب فی زکاة المائنة، رقم الحدیث (۱۵۶۷)، سنن النسائی: کتاب الزکاة، باب زکاة الابل، رقم الحدیث (۲۴۴۷)، سنن ابن ماجہ: کتاب الزکاة، باب إذا أخذ المصدق سنا دون سن أو فوق سن، رقم الحدیث (۱۸۰۰)

② صحیح البخاری: کتاب الصلح، باب کیف یکتب هذا ما صلح فلان بن فلان وفلان بن فلان، وإن لم ینسبه إلى قبیلته أو نسبه، رقم الحدیث (۲۵۵۱)، صحیح مسلم: کتاب الجہاد والسير، باب صلح الحديبية فی الحديبية، رقم الحدیث (۱۷۸۳)، سنن أبی داؤد: کتاب المناسک، باب المحرم یحمل السلاح، رقم الحدیث (۱۸۳۲)، مسند أحمد: ۴۹۱/۴، (۱۸۵۹۶)

③ دیکھیں: ابن حبان: ۱۴/۴۹۱-۵۱۵ (۶۵۵۳-۶۵۵۹)

مروی ہیں۔^① پس ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت کا مطلب وہی لیا جائے گا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ قرآن کے ساتھ حدیث نہ لکھو، بلکہ الگ لکھو، یا اس حدیث کو بسبب خبر واحد ہونے کے متواتر اور مشہور کے مقابلہ میں مرجوح یا منسوخ قرار دیا جائے گا۔^②

صحیفہ عمرو بن حزم:

مولانا مولوی ابوالقاسم بناری کی کتاب ”جمع القرآن والأحادیث“ میں ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن یعنی اہل نجران کے لئے ایک کتاب لکھوائی، جس میں تمام مسائل فرائض و سنن اور دیات وغیرہ کے تحریر تھے اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بھیجی۔ پھر وہ خاندان عمرو بن حزم کے ہاں محفوظ رہی، چنانچہ امام ابن شہاب زہری تابعی نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے نقل کی۔ یہ حدیث تواتر سے سنن نسائی (مطبع انصاری) کتاب القود والقسامة والدیات: ۲/۲۲۱، مراسیل ابوداؤد: ۳۸، سنن دارقطنی: ۴۵، ۳۳۶، ۳۳۷، مسند دارمی: ۳۱۰، مؤطا امام مالک: ۳۳۲، مسند شافعی: ۱۹۸، کتاب الشافعی: ۶۶، ۶۸، سنن بیہقی: ۴، ۸۹/، مستدرک حاکم: ۱/۳۹۵، بلوغ المرام: ۱۴۲، جامع بیان

① تفصیل کے لیے دیکھیں:

② امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو ”موقوف“ قرار دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان نہیں ہے، دیگر اہل علم نے اس حدیث کے متعلق جمع، ترجیح، نسخ کے حوالے سے کئی جوابات دیے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: شرح السنة: ۱/۲۹۴، تاویل مختلف الحدیث (۱۹۳)، معالم السنن: ۴/۴۲، جامع الأصول: ۸/۳۳، مجموع الفتاوی: ۱۸/۳۱۸، جامع بیان العلم: ۱/۲۹۲، مقدمة ابن الصلاح: ۱۹۰، تنقید العلم: ۳۲، ۵۷، ۹۳، فتح الباری: ۱/۲۷۵، الأنوار الکاشفة للمعلمی: ۴۳۔

العلم وفضله لابن عبد البر: ۷۱/۱، فتح الباری (مطبع انصاری): ۲۸،

۲۹۵، اور تفسیر ابن کثیر: ۶۰۴/۳ وغیرہ کتب میں ثابت ہے۔“

پس کتابت کے خلاف جو ادلہ ذکر کی جاتی ہیں، وہ کمزور ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اثر:

❖ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ آپ نے پانچ سوا حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہوا تھا۔ لیکن ایک صبح اٹھ کر اسے جلا دیا۔

جواب:

اس اثر کی سند ”تذکرۃ الحفاظ“ میں اس طرح ہے:

”وقد نقل الحاکم) فقال حدثني بكر بن محمد أنا محمد

بن موسى البربري أنا الفضل بن غسان أنا علي بن صالح أنا

موسى بن عبد الله بن حسن عن إبراهيم بن عمر بن عبيد الله

اليميني حدثني القاسم بن محمد قالت عائشة جمع أبي.....

الحديث۔“

ا: یہ سند صحیح نہیں۔ اس کی سند میں ”علی بن صالح“ ہے، جو مجہول ہے۔

ب: ”مفضل بن غسان“ بھی مجہول اور غیر مقبول ہے۔

ج: اس میں ”موسی بن عبد اللہ“ ہے، جو ”متهم بالكذب“ ہے۔

د: اس اثر کے اخیر میں ”تذکرہ“ میں بھی لکھا ہے۔ ”لایصح“ یعنی یہ صحیح نہیں۔^①

ح: امام ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی تردید کی ہے، جیسے ”کنز العمال“ سے

معلوم ہوتا ہے۔^①

ز: بخاری میں ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو جب بحرین کی طرف بھیجا، تو ان کو ایک لمبی حدیث کی نقل لکھ کر دی،^② جس میں زکوٰۃ کا مکمل مسئلہ ہے۔

ز: ”شرف أصحاب الحدیث“ میں ہے: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو مجھ سے کوئی حدیث لکھے، جب تک وہ حدیث پڑھی جائے گی، اس کو ثواب ملتا رہے گا۔“^③

یہ عام وجوہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ احادیث کے جملانے کا جو افسانہ مروی ہے، وہ باطل و بے دلیل ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دوسرا اثر:

❖ تذکرہ (۳/۱) میں بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک ایسی حدیث ہے، جس میں ذکر ہے کہ:

”تم حدیث میں اختلاف کرتے ہو، تم سے پیچھے آنے والے تم سے زیادہ اختلاف کریں گے۔ اس واسطے تم آنحضرت ﷺ سے کچھ نہ بیان کرو، جو تم سے پوچھے، تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔“

① کنز العمال: ۱۰/ ۵۰۳ (۲۹۴۶۰) نیز دیکھیں: الأنوار الکاشفة: ۳۷

② صحیح البخاری: کتاب الزکاة: باب صدقة الغنم، رقم الحدیث (۱۳۸۶)

③ اس کی سند ”موضوع“ ہے۔

جواب:

۱۔ مگر یہ ”مرسل منقطع“ ہے۔ چنانچہ (ذہبی) لکھتے ہیں: ”ومن مراسیل بن أبي مليكة“ اور اخیر میں کہتے ہیں کہ ”فهذا المرسل.....“ اور ”مرسل منقطع“ محدثین کے نزدیک حجت نہیں ہوتی۔ چنانچہ لکھا ہے:

”ردہ جماہیر النقاد..... للمجهل بالسقاط في الإسناد“^①

یعنی جمہور محققین ”مرسل“ کو مردود جانتے ہیں، کیونکہ جو راوی غیر مذکور ہے، وہ مجہول ہے۔

ب: اس حدیث میں اختلاف کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حدیث کا بیان کرنا، تم جیسے لوگوں کا کام نہیں، جو حدیث کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ بلکہ ان لوگوں کا کام ہے، جن کا حافظہ اللہ نے اچھا بنایا ہو۔ تم صرف قرآن کا ہی حوالہ دیا کرو، کیونکہ حدیث بھی قرآن ہی کی تفسیر ہے۔

ج: امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ مطلب تھا کہ حدیث میں تحقیق سے کام لیا کرو۔ یہ مطلب نہیں کہ بالکل روایت ہی بیان نہ کرو۔ کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خود دادی یا ثانی کے متعلق حدیث کے فتویٰ پر عمل کیا، جب کہ اس کا حکم کتاب اللہ سے نہ ملا۔“^②

د: آگے یہ ذکر کیا ہے: ایک دفعہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو حدیث سنائی، تو اس نے کہا: اسی طرح ہے؟ آپ نے فرمایا ”اسی طرح ہے۔ ورنہ میں زمین پر کیسے چل پھر سکتا ہوں۔ اگر ایسی حدیث بیان کروں، جو نبی کریم ﷺ نے بیان

① ألفية العراقي: ٧٨

② تذكرة الحفاظ: ٣/١

نہیں فرمائی۔“^①

ع: ”توجیہ النظر“ میں ہے:

”وأما الرواية فمنقطعة لا تصح“

کہ یہ روایت ابو بکر صدیقؓ تک نہیں پہنچتی، اس لئے ”صحیح“ نہیں۔^②

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر:

⑤ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ:

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین آدمیوں عبداللہ بن مسعود، ابوالدرداء اور ابو مسعود (جی اللہ عنہم) کو حدیث کے بیان کرنے میں قید کر دیا تھا۔“

جواب:

یہ اثر بھی صحیح نہیں، اس کی سند اس طرح ہے:

”عن شعبة عن سعد بن إبراهيم عن أبيه أن عمر حبس.....“
(تذکرۃ الحفاظ ۷/۱)

”توجیہ النظر“ میں لکھا ہے:

”هذا مرسل ومشكوك فيه من شعبة فلا يصح، ولا يجوز“

الاحتجاج به ثم هو في نفسه ظاهر الكذب“ (توجیہ النظر: ۷۲/۱)

① تذکرۃ الحفاظ: ۳/۱۔ اس کی سند ”منقطع“ ہے۔ کیونکہ امام زہری رحمہ اللہ اس اثر کو حضرت ابو بکر صدیقؓ

سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔

② الاحکام لابن حزم: ۲۵۸/۲، توجیہ النظر: ۷۴/۱، امام ابن حزم رحمہ اللہ نے یہ الفاظ حضرت

ابو بکر صدیقؓ کی اس روایت کے متعلق کہے ہیں، جس میں دادی کی توریث کا ذکر ہے کیونکہ قیصہ

بن ذویب اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے درمیان ”انقطاع“ ہے۔

”یہ حدیث صحیح نہیں، مشکوک ہے، اس کا جھوٹ ہونا بالکل ظاہر ہے۔“^①

اس کے جھوٹا ہونے کیلئے یہ کافی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ والوں کی طرف عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اُن کا وزیر بنا کر بھیجا اور کہا: ”یہ دونوں بدری ہیں اور آنحضرت ﷺ کے بہترین اصحاب میں سے ہیں، ان کی اقتداء کرو اور ان کی باتیں سنو۔ میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تمہارے پاس اپنی ذات پر ترجیح دے کر بھیجا ہے۔“^② (تذکرہ: ۱۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دوسرا اثر:

⑤ ایک روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا:

”قرظہ بن کعب! لوگوں کو حدیثوں میں پھنسا کر قرآن سے نہ روکنا اور یہ روایتیں نہ سنانا۔“

جواب:

① اس حدیث کو پورے طور پر لکھ نہیں گیا، ورنہ اس کا مطلب ظاہر ہو جاتا۔

”تذکرۃ الحفاظ“ میں یہ روایت اس طرح ہے:

”عن الشعبي عن قرظة بن كعب قال لما سیرنا عمر إلى العراق مہشی معنا عمرو قال أتدرون لم شیعتکم قالوا نعم

① امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ اثر ”منقطع“ ہے، ابراہیم نے حضرت عمر کی زندگی کے صرف تین سال پائے ہیں، حالانکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں تھے۔ لہذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ اثر ”صحیح“ نہیں ہے۔ (مجمع الزوائد: ۱/۳۴۶) (۲۶۶)

② تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۴ (۵) نیز دیکھیں: طبقات ابن سعد: ۳/۲۵۵، ۶/۷

تکرمۃ لنا وقال مع ذلك أنکم تأتون أهل قرية لهم دوي بالقرآن كدوي النحل فلا تصدوهم بالأحاديث فتشغلوهم، جردوا القرآن وأقلوا الرواية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا شريككم فلما جاء قرظة قالوا حدثنا فقال نهانا عمر رضي الله عنه“ ❶

”قرظہ بن کعب کہتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ہم کو عراق کی طرف بھیجا، تو ہمارے ساتھ خود ہی چلے اور فرمایا: کیا تمہیں علم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیوں چلا ہوں؟ انہوں نے کہا: ہماری عزت افزائی کے لیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بات بھی ہے اور ایک بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ تم ایسے شہر میں جا رہے ہو، جہاں لوگ قرآن لگا تار پڑھتے رہتے ہیں۔ تم حدیثوں کے ساتھ ان کو قرآن پڑھنے سے مت روکنا، قرآن کو خالص رکھو اور آنحضرت ﷺ سے روایات کم بیان کرو، پھر میں تمہارا شریک ہوں۔ چنانچہ قرظہ بن کعب آئے، تو لوگوں نے کہا: تمہیں حدیث سنائیے! تو آپ نے کہا کہ ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع فرمادیا ہے۔“

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کرنے سے نہیں روکا، بلکہ یہ کہا ہے کہ روایات کم بیان کرو۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کا زیادہ وقت اسی میں صرف ہو جائے اور وہ قرآن پڑھنے سے رک جائیں۔

ب: قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ سے کتب احادیث میں روایات موجود ہیں۔

ج: یہ اثر بلحاظ سند کے صحیح نہیں۔ ”توجیہ النظر“ (صفحہ: ۸) میں لکھا ہے:

”شعبی کی ملاقات قرظہ سے نہیں ہوئی، لہذا یہ اثر ساقط اور باطل ہے۔“^①

”مختصر جامع بیان العلم“ (صفحہ ۱۷) میں ہے:

”والآثار الصحاح عنه من رواية أهل المدينة بخلاف حديث

قرظہ وإتاما يدور على بيان عن الشعبي وليس مثله حجة في

هذا الباب لأنه يعارض السنن والكتب“

”صحیح آثار جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں اور مدینہ کی روایت میں ثابت

ہیں، وہ قرظہ کی روایت کے خلاف ہیں۔ قرظہ کی روایت کا مدار ”بیان عن

الشعبي“ ہے اور وہ اس باب میں سند نہیں۔“^②

9: ”دارمی“ میں ہے:

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسے تم قرآن مجید کا علم حاصل کرتے ہو، ایسے

ہی قرآن لے، لغت اور سنن یعنی آنحضرت ﷺ کی حدیثیں بھی سیکھو۔“^③

ح: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پانچ سو سے بھی زیادہ حدیثیں مروی ہیں۔^④

(توجیہ النظر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تیسرا اثر:

⑤ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے رسول

① توجیہ النظر: ۷۳/۱، نیز دیکھیں: الأحکام لابن حزم: ۲۵۶/۲۔ اس اثر کی سند ”صحیح“ ہے اور سند میں انقطاع بھی نہیں ہے۔

② جامع بیان العلم: ۱۰۰۶/۲، لیکن شعبی سے یہ اثر بیان کرنے میں ”پانچ بن بشر“ منفرد نہیں، بلکہ شعبی کے دوسرے ثقات شاگردوں نے بھی ان کی متابعت کی ہے۔

③ سنن الدارمی: ۲/۴۱۱ (۲۸۵۰)۔

④ الأحکام لابن حزم: ۲۵۷/۲، توجیہ النظر: ۷۴/۱۔

کریم ﷺ کی احادیث اور آپ ﷺ کا اسوہ لکھنے کا ارادہ کیا، مہینہ بھر استخارہ کرتے رہے، پھر فرمایا:

”كَانَ قَبْلَكُمْ قَوْمٌ كَتَبُوا كِتَابًا فَأَكْبُوا عَلَيْهَا وَتَرَكُوا كِتَابَ اللَّهِ
وَإِنِّي وَاللَّهِ لَا أَشُوبُ كِتَابَ اللَّهِ بَشْيَءٍ أَبَدًا“^①

(کتاب جامع بیان العلم - مصری :- ۲۳)

”تم سے پہلے ایسے لوگ ہو گزرے، جنہوں نے کتابیں لکھیں اور خدائی کتاب کو چھوڑ کر انہی پر جھک پڑے۔ خدا کی قسم! میں کتاب اللہ میں کسی شے کو نہیں ملاؤں گا۔“

جواب:

اس روایت کی سند اس طرح ہے:

”وَعَنْ عُرْوَةَ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ.....“

حالانکہ عروہ کی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں۔^② جس سال حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، اسی سال وہ پیدا ہوئے۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ چھ سال بعد پیدا ہوئے،^③ اس لئے یہ روایت سند کے لحاظ سے باطل ہے۔

ج: اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

”لَا أَشُوبُ بِكِتَابِ اللَّهِ“

① جامع بیان العلم: ۱/ ۲۷۵ (۳۴۳) یہ ”اثر“ دیگر طرق سے بھی مروی ہے، لیکن ان کی اسانید میں

شدید ضعف پایا جاتا ہے، لہذا یہ ”اثر“ کسی طرح بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔

② دیکھیں: جامع التحصیل: ۲۳۶ (۵۱۵)

③ تاریخ خلیفہ: ۱۵۶، سیر أعلام النبلاء: ۴/ ۴۲۲

”میں اللہ کی کتاب سے کوئی چیز نہیں ملاؤں گا۔“

اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، تو سب نے لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم اجادیت لکھنے کے قائل تھے، صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے قائل نہ تھے۔

ج: ”موطأ“ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز کے بارہ میں اور اوقات کے متعلق سب عمال کو لکھا۔^①

۵: مستدرک حاکم، دارمی اور جامع بیان العلم میں [حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول] ہے:

((قیدوا العلم بالكتابة))

”علم کو ضبط تحریر میں لاؤ۔“^②

ج: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث لکھ کر بھیجی۔^③

(مسلم: ۲/۱۹۱)

۵: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو منع کی روایت ہے، بلحاظ اس کے باطل ہے کہ یہ ان اولہ صحیحہ کے مقابلہ میں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، قابل التفات نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا چوتھا اثر:

◆ ”طبقات ابن سعد“ کے حوالہ سے ایک اور روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل

① الموطأ: ۶/۱ (۶)

② سنن الدارمی: ۱/۱۳۸ (۴۹۷)، مصنف ابن أبي شيبة: ۳۱۳۵، المستدرک ۱/۱۷۸

③ (۳۵۹)، جامع بیان العلم: ۱/۳۰۹، المدخل للبيهقي: ۲/۲۳۴ (۷۵۸)، المحدث الفاضل:

۳۷۷، یہ اثر دیگر کئی صحابہ سے بھی مرفوعاً و موقوفاً مروی ہے۔

④ صحيح مسلم: كتاب اللبس والزينة، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة، رقم

الحديث (۲۰۶۹)

کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: گھر جاؤ اور احادیث کا تمام ذخیرہ اٹھا لاؤ۔ ذخیرہ جمع ہو گیا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اسے جلا دیا۔^①

جواب:

یہ اثر بچہد وجوہ باطل ہے۔
 ۱: مذکورہ اثر منقطع ہے، اس کی سند اس طرح ہے:
 زید بن یحییٰ، عبد اللہ بن علاء سے اور وہ "قاسم بن محمد" سے..... اور قاسم مذکور کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہے، کیونکہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے آٹھ سال بعد پیدا ہوئے۔^②
 ب: بلا تنقید و تحقیق لکھا ہوا جلا دینا خلاف عقل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے فہیم آدمی کا یہ کام نہیں ہو سکتا۔
 ج: اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے، تو دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم جو کتابت کے قائل تھے، ضرور انکار کرتے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر:

بعض نے یہ کہا کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف سینکڑوں احادیث منسوب ہیں، لیکن ابو عمرو شیبانی بیان کرتے ہیں: "میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں برسوں رہا اور ان کی زبان سے کوئی حدیث نہ سنی۔ ہاں جب کبھی مجبوراً

① الطبقات الکبریٰ: ۱۸۸/۵

② "القاسم بن محمد بن ابی بکر" خلافت علی رضی اللہ عنہ کے دوران پیدا ہوئے تھے۔ (سیر أعلام النبلاء: ۵۴/۵) نیز دیکھیں: طبقات تالیف: ۲۴۴، تہذیب الکمال: ۴۳۵/۲۳۔

کوئی حدیث بیان کرنی پڑتی، تو خوف سے کانپنے لگتے اور فرماتے رسول اللہ ﷺ نے غالباً یوں ہی فرمایا تھا۔“

جواب:

ا: اصل لفظ یہ ہیں: ”میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک سال بیٹھا، آپ ﷺ آحضرت ﷺ سے حدیث نقل نہیں کرتے تھے، جب کبھی یہ کہتے: ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا“ آپ کانپنے لگتے اور فرماتے کہ اس طرح فرمایا یا اس کے قریب یا اس کے ہم معنی۔“^① (تذکرہ الحفاظ: ۱/۱۵)

ب: اس اثر سے حدیث کی نفی نہیں، بلکہ اثبات معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ آحضرت ﷺ سے روایت کرنے میں سخت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب تک ان کو پورا یقین نہ ہوتا، اس وقت تک حدیث بیان نہ کرتے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا دوسرا اثر:

④ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک اور اثر نقل کرتے ہیں:

”آپ کے پاس ایک نوشتہ لایا گیا، آپ نے اس کے بعد فرمایا: پہلے لوگ اسی لئے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے نوشتوں کے پیچھے لگ کر اصل کتاب کو چھوڑ دیا۔“^②

جواب:

ا: یہ اثر بھی صحیح نہیں، کیونکہ ابن عبد البر کی أبو بکر بن ابی شیبہ سے ملاقات

① المعجم الكبير: ۱۲۲/۹، (۸۶۱۳)، تاریخ ابی زرعہ: ۷۲، المحدث الفاصل: ۵۴۹، تاریخ دمشق: ۱۶۴/۳۳، الإلماع: ۱۷۷

② مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۱۵/۵، (۲۶۴۴۷)، جامع بیان العلم: ۲۷۸/۲، (۳۵۰)

نہیں ہوئی، سو سال کا فاصلہ ہے۔

ب: اس میں ”اعمش“ ہے جو ”مدلس“ ہے اور ”عن“ سے روایت کرتا ہے، جو ناقابل استدلال ہے۔

ج: اس کی سند میں ”ابو معاویہ“ ہے، اس کنیت والے بہت سے ہیں، بعض معتبر اور بعض غیر معتبر، ایسی حالت میں حدیث غیر معتبر ہوتی ہے۔^①

اس اثر میں یہ بھی ذکر نہیں کہ اس نوشتے میں حدیث رسول تھی یا کوئی اور کلام۔ اس قصہ کے ایک راوی ابو عبید کہتے ہیں: دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیفہ اہل کتاب سے لیا گیا تھا، اسی واسطے حضرت عبداللہ نے اسے مکروہ جانا۔“ (صفحہ: ۳۴)^②

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر:

✦ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ”آپ نے لکھی ہوئی حدیثوں کو مٹانے کا حکم دیا اور فرمایا: گزشتہ تو میں اس طرح تباہ ہوئیں کہ انہوں نے علماء کی روایات کی پیروی کی اور اپنے رب کی کتاب کو چھوڑ دیا۔“^③

① یہ اثر مصنف ابن ابی شیبہ میں موجود ہے، جسے ابن ابی شیبہ نے اپنی سند سے ذکر کیا ہے (۳۱۵/۵، ۲۶۴۴۷) لہذا ابن عبد البر کی ابن ابی شیبہ سے عدم لقاء کا اس اثر کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور سند میں مذکور ”ابو معاویہ“ کا نام ”محمد بن خازم الضریر الکوفی“ ہے جو ”ثقة ثبت في الأعمش“ اور امام اعمش کے اخص تلامذہ سے ہیں۔ (تہذیب الکمال: ۱۲۴/۲۵)

② جامع بیان العلم: ۲۸۳/۱ (۳۵۸) اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگرد امام مرة بن شراحیل الہمدانی فرماتے ہیں: أبو مرة الكندي حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس اہل کتاب کی کتب سے ایک کتاب لے کر آئے، تو ابن مسعود نے اسے مٹا دیا، مرة الہمدانی کہتے ہیں: اگر وہ قرآن یا نبی اکرم ﷺ کی سنت ہوتی، تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ اسے نہ مٹاتے، مگر وہ یہود و نصاریٰ کی کتاب تھی، اس لیے انھوں نے اسے مٹا دیا۔ (سنن الدارمی: ۱۳۴/۱ (۴۷۷))

③ مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۱۴/۵ (۲۶۴۳۹)، جامع بیان العلم: ۲۷۱/۱ (۳۳۷)

جواب:

۱: اصل الفاظ یہ ہیں کہ:

”حيث تتبعوا أحاديث علماء هم“
 ”یعنی جب انہوں نے علماء کی باتوں کی پیروی کی“
 یہ روایت بھی بلحاظ سند معتبر نہیں:

ب: اس میں ”بقیۃ“ ہے، جو قابل وثوق نہیں۔

ج: اس میں ”عبداللہ بن یسار“ ہے، جو ”مجهول“ ہے۔^①

د: اس میں علماء کی باتوں کی پیروی کا ذکر ہے۔ آنحضرت ﷺ کی احادیث کا ذکر نہیں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کی احادیث تو خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قلمبند کی تھیں، جیسے بخاری میں ہے۔^②

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تیسرا اثر:

① عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی بطور معارضہ پیش کی جاتی ہے:

① اس کی سند میں ”بقی بن مخلد“ ہیں، جو کہ ”ثقة“ ہیں، ویکھیں: تاریخ دمشق: ۳۵۴/۱۰۔ سیر أعلام النبلاء: ۲۸۵/۱۳۔ بعض مطبوعہ نسخوں میں ”بقیۃ“ غلطی سے لکھا گیا ہے، کیونکہ وہ اس طبقہ کے راوی نہیں۔

مزید برآں ابن ابی شیبۃ کی سند میں یہ ”بقی بن مخلد“ بھی نہیں ہیں۔ اور دوسرا راوی ”عبداللہ بن یسار الجعفی الکوفی“ ہے، جو کہ ”ثقة“ ہے۔ (الثقات لابن حبان: ۵۱/۵) (۳۸۰۵)، تہذیب الکمال: ۳۲۶/۱۶ (۳۶۶۸)، الکاشف: ۶۰۹/۱ (۳۰۶۵)، تقریب التہذیب: ۳۳۰ (۳۷۱۷) لیکن اس کی سند میں ”جابر بن یزید الجعفی“ راوی ”متروک“ ہے۔ (التاریخ الکبیر: ۲/۲۱۰، الضعفاء للنسائی: ۲۸ (۹۸) تہذیب الکمال: ۴/۴۶۵ (۸۷۹)، تہذیب التہذیب (۴۱/۲) لہذا یہ اثر سخت ”ضعیف“ ہے۔

② صحیح البخاری: کتاب العلم، باب کتابۃ العلم، رقم الحدیث (۱۱۱)

”إذا أردتكم العلم فانثروا القرآن فإن فيه علم الأولين
والآخرين“ (تذکرہ: ۱۵)

”جب تم علم چاہو تو قرآن کو پھیلاؤ، اس میں غور و فکر کرو، کیونکہ اس میں
اولین اور آخرین کا علم موجود ہے۔“^①

جواب:

روایت کے الفاظ ہی سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اثر حدیث کے خلاف نہیں پیش
ہو سکتا، کیونکہ اس میں قرآن کی فضیلت ہے، حدیث کا انکار نہیں!

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اثر:

❖ آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دربار میں گئے۔ انہوں نے آپ سے احادیث کی
فرمائش کی۔ آپ نے چند احادیث سنائیں اور غشی دربار ساتھ ساتھ لکھتا گیا۔
آپ نے وہ کاغذ لیکر چیر ڈالا اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث کے لکھنے
سے منع کیا ہے۔^②

جواب:

❶ یہ حدیث ابوداؤد کی ہے، مگر اس کی سند صحیح نہیں۔

❷ زید اور مطلب بن عبد اللہ قابل وثوق نہیں۔^③

① المعجم الكبير: ۱۳۶/۹ (۸۶۶۶) مصنف ابن أبي شيبة: ۱۲۶/۶ (۳۰۰۱۸)، الزهد لابن
المبارك: ۲۸۰، اس کی سند ”صحیح“ ہے۔

② سنن أبي داود: كتاب العلم، باب في كتاب العلم، رقم الحديث (۳۶۴۷)

③ اس کی سند میں دو راوی ”کثیر بن زید“ اور ”المطلب بن عبد اللہ“ ہیں، ”کثیر بن زید
السهمي المدني“ حسن الحديث ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ”صدوق بخطی“ نیز دیکھیں
:الجرح والتعديل: ۱۵۰/۷، الثقات لابن حبان: ۳۵۴/۷ (۱۰۴۱۱) تہذیب الکمال: ❧

ج: اس کتاب میں اس کے راوی کی دلیل بھی موجود ہے، لکھا ہے:

”زید بن ثابت کہتے ہیں: کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”مجھے یہودی کتابت پر اعتبار نہیں، تم یہودی کتابت سیکھ لو،“ پس میں نے آدھے مہینے میں ان کی کتابت سیکھ لی، پھر آنحضرت ﷺ کوئی خط ان کو لکھواتے تو میں ہی لکھتا۔“ اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ”صحیح“ کہا ہے اور بخاری میں حلیقاً موجود ہے۔^①

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرائض (علم میراث) میں ایک کتاب لکھی تھی۔^②
(توجیہ النظر)

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث:

❖ یہ حدیث یوں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے۔ تین آوازیں دیں اور واپس چل دیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ باہر نکلے، واپس

← ۱۱۳/۲۴ (۹۹۴۱) اور ”المطلب بن عبد اللہ بن حنطب“ ثقہ ہے۔ (مشاہیر علماء الأمصار: ۷۴ (۵۲۱)، الثقات لابن حبان: ۴۵۰/۵ (۵۶۶۷)، تہذیب الکمال: ۸۱/۲۸ (۶۰۰۶)، الکاشف: ۲۷۰/۲ (۵۴۸۳)
اس اثر میں وجہ ضعف ”المطلب بن عبد اللہ بن حنطب“ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے درمیان ”انقطاع“ ہے۔ (جامع التحصیل: ۲۸۱ (۷۷۴)

① صحیح البخاری - تعلیقاً مجزوماً بہ۔ کتاب الأحکام، باب ترجمة الحکام، سنن أبي داود: کتاب العلم، باب رواية حديث أهل الكتاب، رقم الحديث (۳۶۴۵)، سنن الترمذی: کتاب الاستئذان، باب ما جاء في تعليم السريانية، رقم الحديث (۲۷۱۵) اسے امام ترمذی، حاکم اور ذہبی رحمہم اللہ نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

② توجیہ النظر: ۵۰/۱، نیز دیکھیں: سنن سعید بن منصور: ۴۵/۱، سنن البيهقي: ۲۱۰/۶، المعرفة والتاريخ للفسوي: ۴۸۶/۱، سير أعلام النبلاء: ۴۳۶/۲۔

جانے کا سبب پوچھا، تو کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم گھر پر تین آوازیں دو۔ اگر صاحب خانہ نہ بولے، تو لوٹ جاؤ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس حدیث کی شہادت پیش کرو، ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔ وہ گھبرائے ہوئے مسجد نبوی میں پہنچے اور خوش قسمتی سے انہیں شہادت مل گئی۔^① ورنہ پٹ جاتے۔“ (تذکرہ: ۶/۱)^②

جواب:

یہ حدیث منکرین حدیث پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حدیث مشہدین کی زبردست دلیل ہے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث کے حجت ہونے کا انکار نہیں کیا، بلکہ احتیاط کیلئے اس پر شہادت طلب کی اور شہادت ملنے پر فرمایا: ”میں نے تم کو متہم نہیں سمجھا، شہادت اس لئے طلب کی ہے، تاکہ لوگ حدیث میں دلیری نہ کریں۔“ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ حدیث کے متعلق سخت احتیاط کرتے تھے۔ حکومت خاص طور پر اس طرف متوجہ تھی۔

قرآن مجید میں جو ذکر ہے:

﴿وَلْيُمَكِّنْ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ﴾^③

”(ان خلفاء کی معرفت) ان کے اس دین کو جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے، زمین میں نافذ کرے“

① صحیح البخاری: کتاب الاستئذان، باب التسلیم والاستئذان ثلاثاً، رقم الحدیث

(۵۸۹۱)، صحیح مسلم: کتاب الآداب، باب الاستئذان، رقم الحدیث (۲۱۵۳)

② تذکرہ الحفاظ: ۶/۱، ”ورنہ پٹ جاتے“ کے الفاظ معترض کی خانہ ساز تفریع ہے، روایت میں

ایسے کوئی الفاظ نہیں ہیں۔

③ النور: ۵۵

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی انہی مساعی جمیلہ اور حزم و احتیاط کی طرف اشارہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم حدیث کو حجت سمجھتے ہیں۔

ضحاک بن مزاحم کا اثر:

ضحاک فرمایا کرتے تھے:

”وہ زمانہ چلا آ رہا ہے کہ جب احادیث کی کثرت ہو جائے گی، لوگ کتاب الہی کو ترک کر دیں گے، کڑیاں اس پر جالے تنیں گی اور وہ گرد و غبار کے نیچے یوں دب جائے گی کہ نظر تک نہیں آ سکے گی۔“^① (جامع: ۳۳)

جواب:

یہ اثر بلحاظ سند کے نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں، بلکہ باطل ہے۔ کیونکہ:

۱۔ اس کی سند میں سیف بن ہارون ہے۔ جو ”ضعیف“ اور ”متروک الحدیث“

① جامع بیان العلم: ۱۰۲۴/۲ (۱۹۵۴) اس کی سند میں ”سیف بن ہارون البرجمی“ ضعیف ہے۔ ابن معین نے اسے ”لیس بشی“، نسائی نے ”ضعیف“ دارقطنی نے ”ضعیف متروک“ اور امام ابو داؤد نے ”لیس بشی“ کہا ہے۔ امام ابن حبان فرماتے ہیں: ”یروی عن الأئبات الموضوعات“ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ”ضعیف أفحش ابن حبان القول فیہ“ (تاریخ ابن معین - روایۃ الدور: ۱/۴۲۱ (۲۰۶۴) الضعفاء للنسائی: ۴۹ (۲۵۴)، سوالات البرقانی للدارقطنی: ۳۴ (۲۰۳) المعجروحين لابن حبان: ۱/۳۴۶ (۴۴۴)، تہذیب الکمال: ۱۲/۳۳۲ (۲۶۷۹)، تقریب التہذیب: ۲۶۲ (۲۷۲۷) مزید برآں سیف بن ہارون کا استاد بھی اس سند میں ”مجہول“ ہے۔

حافظ ابن عبد البر نے انہی معنوں میں ضحاک بن مزاحم کا ایک دوسرا قول بھی نقل کیا ہے۔ (جامع بیان العلم: ۱/۲۷۹ (۳۵۱) لیکن اس کی سند میں ”سنان بن ہارون أخو سیف بن ہارون البرجمی“ ضعیف ہے۔ (المعجروحين لابن حبان: ۱/۳۵۴ (۴۶۱) الضعفاء للعقيلي

۲/۱۷۱ (۶۸۸)، تہذیب الکمال: ۱۲/۱۵۵ (۲۵۹۸) تہذیب التہذیب: ۴/۲۱۳

یہاں تک کہ ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جھوٹی روایتیں نقل کیا کرتا ہے۔

جریر کا اثر:

❖ وہ کہتے ہیں کہ ”منصور، مغیرہ اور اعمش محدثین کی کتابت احادیث کو گناہ سمجھتے تھے۔“

جواب:

اس کا ترجمہ ”گناہ سمجھتے تھے“ ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ خیال کرتے تھے، حدیث کا یاد رکھنا بہتر ہے اور لکھنا مکروہ ہے۔

اثر کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”کانوا یکرہون کتابۃ الحدیث“^① (جامع: ۳۴)

ابن عبدالبر نے یہ آثار اپنی کتاب ”جامع“ میں نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ لکھا ہے کہ یہ لوگ جو کمال درجہ کا حفظ رکھتے تھے، پیدائشی طور پر ان کا حافظہ بہت قوی تھا، جیسے عربوں کی حالت تھی کہ ایک دفعہ بات کو سن کر یاد کر لیتے تھے، جیسے ابن شہاب سے مروی ہے کہ:

”میں بقیع میں کان بند کر کے گذرتا ہوں، تاکہ میرے کان میں کوئی بری

بات نہ داخل ہو جائے، اللہ کی قسم! میرے کان میں کوئی چیز پڑ جائے، تو

میں اس کو کبھی بھی نہیں بھولا۔“^②

اور شعبی سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ یہ لوگ عرب تھے^③ اور عرب کا

① جامع بیان العلم: ۲۹۰/۱ (۳۷۰) تقييد العلم: ۴۸ اس کی سند میں ”عمر بن محمد

الجمحي“ مجہول الحال ہے۔ الجرح والتعديل: ۱۲۷/۶، لسان الميزان: ۴/۳۲۰ (۹۰۴)

② جامع بیان العلم: ۱۹۶/۱ (۳۸۲)

③ جامع بیان العلم: ۲۹۶/۱ (۳۸۳)

حافظ بہت قوی تھا، کتنے کتنے اشعار بعض عرب ایک دفعہ سننے سے یاد کر لیتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عمر بن ابی ربیعہ کا قصیدہ ایک ہی دفعہ سن کر یاد کر لیا تھا^① مگر آج کل حافظ اتنا قوی نہیں۔ اگر کتاب نہ ہو، تو علم ضائع ہو جائے۔ اسی لئے بہت سے علماء نے کتابت حدیث کی رخصت دی ہے۔ ابراہیم نخعی کے حافظ میں اخیر عمر میں کچھ نقص پیدا ہو گیا تھا۔ منصور کہتے ہیں کہ ابراہیم حدیث حذف کر دیتے تھے۔ میں نے ان سے کہا: سالم بن ابی الجعد حدیث یوں بیان کرتا ہے۔ ابراہیم نے کہا: سالم لکھتا تھا اور میں لکھتا نہیں تھا۔^②

امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ نخعی باوجودیکہ وہ کتابت کو مکروہ جانتے تھے، اخیر وہ بھی کتابت کی فضیلت کے قائل ہو گئے۔^③

ابو خالد احمر کا اثر

◆ کہتے تھے:

”يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ تَعْطَلُ فِيهَا الْمَصَاحِفُ لَا يَقْرَأُ فِيهَا وَيَطْلُبُ الْحَدِيثَ وَالرَّأْيَ“^④

① جامع بیان العلم: ۱/ ۲۹۶

② جامع بیان العلم: ۱/ ۲۹۷ (۳۸۵)

③ جامع بیان العلم: ۱/ ۲۹۷

④ جامع بیان العلم: ۲/ ۱۰۲۱ (۱۹۴۷) سیر أعلام النبلاء: ۹/ ۲۱۱ اس کی سند میں ”عبد الباقي

بن قانع“ ضعیف ہے۔ (تاریخ بغداد: ۱۱/ ۸۸ (۵۷۷۵)، لسان المیزان: ۳/ ۳۸۳ (۱۵۳۶)،

الکواکب النیرات: ۷۰ (۴۶) حافظ ابن عبدالبر کے استاد ”عبد اللہ بن محمد بن عبد المومن“

کے متعلق حافظ ذہبی فرماتے ہیں: من قدماء شیوخ أبي عمر بن عبد البر كان تاجرا صدوقا لقي

ابن داسه والكبار ، قال ابن الفرضي: لم يكن ضبطه جيدا وربما أخل بالهجة“ میزان

الاعتدال: ۴/ ۱۹۱، لسان المیزان: ۳/ ۳۵۳ (۱۴۲۸) ابن الفرضي کے اصل الفاظ یہ ہیں: ➔

”ایک زمانہ ایسا بھی آرہا ہے، کہ لوگ قرآن شریف نہ پڑھیں گے، حدیث اور رائے کو طلب کریں گے۔“

جواب:

① یہ اثر بھی حدیث کی صحت اور کتابت کے منافی نہیں، کیونکہ اس میں قرآن نہ پڑھنے کی مذمت ہے۔ کیونکہ أبو خالد احمر کے زمانہ میں حدیث اور رائے کی کتابت اور پڑھنے کا بہت رواج تھا۔

② اس کی سند میں ”عبداللہ بن محمد“ ہے اور اس کا حافظہ بہت خراب تھا۔

③ اس میں لکھا ہے کہ اس کے دو راوی ہیں، جن میں ایک ”ضعیف“ ہے اور دوسرا ”زندیق“۔^①

④ قرآن اس وقت معطل نہیں، پڑھا جاتا تھا، ہاں ان کے خیال میں ایک ایسا زمانہ آنے والا تھا، جس میں قرآن معطل ہو جائے گا اور اس کا پڑھنا ختم ہو جائے گا۔

”دو اسلام“ میں لکھا ہے کہ وہ زمانہ دوسری صدی سے شروع ہوتا ہے۔

(ص ۶۲)

اور کہنے والے کی وفات ۱۹۰ھ بتا رہے ہیں اور کہنے والا کہتا ہے کہ وہ زمانہ ابھی نہیں بلکہ آئندہ آئیگا، پھر دوسری صدی سے کیسے شروع ہوا؟

﴿”کان کثیر الحدیث مسندا صحیحا للسمع، صدوقا فی روايته إلا أن ضبطه لم یکن جیذا، وکان ضعیف الخط ربما أخل بالهجة“ (تاریخ علماء الأندلس: ۱/ ۴۲۳ (۷۵۵)۔

① اس کلام کا مرتفع و مفہوم معلوم نہیں ہو سکا، کیونکہ اس اثر کی سند میں ایسا کوئی راوی نہیں جس کو کسی محدث نے ”زندیق“ کہا ہو۔ واللہ اعلم

شعبہ کا اثر

❖ ”لیس شیء أبغض إلي من أن أرى واحدا منهم“^❶

(جامع: ۱۸۶)

❶ جامع بیان العلم: ۱۰۲۸/۲ (۱۹۶۸) اس اثر کی سند یہ ہے: قال ابن عبد البر: أخبرنا أحمد بن محمد بن أحمد، نا أحمد بن الفضل، نا محمد بن جرير الطبري قال ثنا عبد الله بن النورقي ثنا محمد بن بكار العيشي قال سمعت ابن أبي عدي يقول قال شعبه..... ”رواة کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

❷ أحمد بن محمد بن بن أحمد بن سعيد بن الحباب بن الجصور أبو عمر القرطبي حافظ ذہبی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں: ”کان خیرا فاضلاً شاعرا عالی الإسناد مکترا“، حمیدی فرماتے ہیں: ”محدث مکر“ (جنوة المقتبس في ذكر ولاية الأندلس: ۳۹۔ من اسم أحمد تاریخ الإسلام للذهبي، تاریخ الأدب الأندلسي: ۲۵۵)

❸ ”أحمد بن الفضل بن العباس البهراني الخفاف أبو بكر الدينوري“ ابن الفرضي کہتے ہیں: لزم محمد بن جرير الطبري وخدمه و تحق به و سمع منه مصنفاته فيما زعم، و لم يكن ضابطا لما روى و كان إذا أتني بكتاب من كتب الطبري، قال: قد سمعته منه و سمعته يقرأ عليه و يحدث به عنه..... و كان عنده مناكير قد تسهل الناس فيه و سمعوا منه كثيرا۔

ابن الفرضي، محمد بن يحيى سے نقل کرتے ہیں: وما كان ممن يكذب عنه بحال“ (تاریخ علماء الأندلس: ۲۵/۱ (۲۰۳) جنوة المقتبس: ۵۱، تاریخ دمشق: ۱۶۴/۵ (۷۹)، میزان الاعتدال: ۲۷۲/۱، لسان الميزان: ۲۴۶/۱ (۷۶۹)

❹ ”محمد بن جرير أبو جعفر الطبري“ الإمام الجليل المفسر، ثقة صادق فيه تشيع يسير و موالاة لاتضر (تاریخ بغداد: ۱۶۲/۲ (۵۸۹)، تاریخ دمشق: ۵۲/۱۸۸ (۶۱۶۰) تذكرة الحفاظ: ۷۱۰/۲ (۷۲۸)، لسان الميزان: ۱۰۰/۵ (۳۴۴)

❺ ”عبد الله بن أحمد بن إبراهيم الدورقي“ بعض مطبوعات نسخوں میں غلطی سے ”محمد بن عبد اللہ دورقي“ لکھا گیا ہے، (یکھیں: جامع بیان العلم: ۱۰۲۸/۲۔ حاشیہ: ۳۔ طبعہ دار ابن الجوزي) ←

یعنی ”سب سے زیادہ قابلِ نفرت یہی لوگ ہیں۔“

جواب:

یہ اثر باطل ہے:

- ❶ اس کی سند میں أحمد بن محمد ”متهم“ ہے۔
- ❷ دوسرا محمد بن فضل ”منکر الحدیث“ ہے۔
- ❸ تیسرا محمد بن عبد اللہ دورقی ”مجهول“ ہے۔^①

شعبہ کا دوسرا اثر:

❹ ”إن هذا الحديث ليصدكم عن ذكر الله فهل أنتم متتهون“^②

← ابن ابی حاتم فرماتے ہیں: ”صدوق“ امام دارقطنی نے انھیں ”ثقة“ قرار دیا ہے۔ (الجرح والتعديل: ۶/۵، سوالات الحاکم للدارقطني: ۱۲۱، ۱۲۰)

❺ محمد بن بکار بن الزبیر العیثی الصیرفی ”ثقة“ ہے اور صحیح مسلم کے رواۃ سے ہے۔ (تقریب التہذیب: ۴۷۰: ۵۷۵۹)

❻ محمد بن ابراہیم بن ابی عدی أبو عمرو السلمي ”ثقة“ (تہذیب الکمال: ۳۲۲/۲۴، ۵۰۲۹) تذکرۃ الحفاظ: ۳۲۴/۱، تہذیب التہذیب: ۱۲/۹)

① اس سند میں مذکور ”أحمد بن محمد بن أحمد“ متهم نہیں ہے۔ جیسا کہ گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم!! اسی طرح سند میں مذکور ”أحمد بن الفضل“ راوی بھی ”منکر الحدیث“ نہیں ہے۔ لیکن قابلِ احتجاج بھی نہیں ہے۔ اور ”عبد اللہ بن أحمد الدورقی“ کو ابن ابی حاتم نے ”صدوق“ اور دارقطنی نے ”ثقة“ قرار دیا ہے۔

② جامع بیان العلم: ۱۰۲۹/۲، ۱۹۶۹، شرف أصحاب الحديث (۱۱۴)۔ حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے یہ اثر اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے:

قال ابن عبد البر أخبرنا عبد الوارث بن سفيان أنا قاسم بن أصبغ ثنا أحمد بن زهير حدثنا عبيد الله بن عمر قال نا يحيى بن سعيد القطان قال سمعت شعبه يقول.....“

”یہ حدیث تمہیں اللہ کے ذکر سے روکتی ہے، کیا تم باز نہیں آؤ گے؟“

① ”عبد الوارث بن سفیان بن جبرون“ روى عن قاسم بن أصبغ فأكثر..... و روى عنه ابن عبد البر و أثنى عليه ، و قال: كان من ألزم الناس لأبي محمد قاسم بن أصبغ و من أشهر أهل قرطبة بصحته ، حتى يقال إنه قلما فاته شيء مما قرئ عليه..... و قال ابن عبد البر: رأيت كثيرا من أصول قاسم بن أصبغ، فرأيت سماعه في جميعها و حدث بعلم جَم (جذوة المقتبس في ذكر وفاة الأندلس: ١٠٦)

② ”قاسم بن أصبغ بن محمد بن يوسف الأندلسي القرطبي“ الامام الحافظ محدث الأندلس ، صدوق (تذكرة الحفاظ: ٨٥٣/٣ (٨٣١)، لسان الميزان: ٤٥٨/٤ (١٤١٥)

③ أحمد بن زهير بن حرب أبو بكر بن أبي خيثمة النسائي “ امام دارقطني فرماتے ہیں: ”ثقة مامون“ حافظ خطیب بغدادی لکھتے ہیں: ”كان ثقة عالما متقنا حافظا بصيرا بأيام الناس..... و له كتاب التاريخ الذي أحسن تصنيفه و أكثر فائدته..... ولا أعرف أغزر فوائد من كتاب التاريخ.....“ (سوالرات الحاكم للدارقطني: ٨٨/١١) ، تاريخ بغداد: ١٦٢/٤ (١٨٤٠)، لسان الميزان: ١٧٤/١ (٥٥٦)

④ عبيد الله بن عمر بن ميسرة أبو سعيد القواريري البصري ”ثقة ثبت ، حافظ“ حجتین کے راوی ہیں (الجرح والتعديل: ٣٢٧/٥، التعديل والتجريح: ٨٩١/٢، (٩٤٠)، تهذيب الكمال: ١٩/١٣٠ (٣٦٦٩)، تقريب التهذيب: ٣٧٣ (٤٣٢٥)

⑤ ” يحيى بن سعيد القطان التميمي ”ثقة متقن حافظ إمام قدوة ، كان رأسا في العلم والعمل (تهذيب الكمال: ٣١/٣٢٩ (٦٨٣٤)، تقريب التهذيب: ٥٩١ (٧٥٥٧) خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا یہی اثر اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے:

”قال الخطيب أخبرنا أبو الحسن محمد بن أحمد بن رزق البزار حدثنا عثمان بن أحمد الدقاق حدثنا الحسن بن مكرم حدثنا أبو الوليد، قال ح وأخبرنا أحمد بن محمد بن غالب الفقيه قال قرئ على إسحاق النعماني، و أنا أسمع حدثكم أبو خليفة قال سمعت أبا الوليد يقول سمعت شعبة يقول.....“ یہ سند بھی ”صحیح“ ہے۔ اور ابو الولید کا نام ”ہشام بن عبد الملک الباہلی الطیالسی“ ہے۔

جواب:

یہ اثر بھی باطل ہے:

① اس کی سند میں عبدالوارث ”مجہول“ ہے۔

② دوسرا راوی زہیر ہے، جو آخر مختل ہے۔

شرف أصحاب الحديث میں اس کی ایک اور سند ہے، جس میں ”محمد بن محمد“ ہے۔ امام ابوداؤد کہتے ہیں: ”اس کی چار سو روایتیں ذکر کی گئی ہیں اور سب کی سب باطل ہیں۔“^①

③ اگر انہوں نے ایسا کہا بھی، تو اس کا مخاطب کوئی خاص آدمی یا شاگرد ہوگا، نہ کہ سب محدث! یا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ حدیث میں اتنا منہمک نہیں ہونا چاہئے کہ نماز کا بھی خیال نہ رہے۔ ایسا انہماک تو قرآن میں بھی جائز نہیں کہ آدمی قرآن پڑھتے پڑھتے نماز سے بھی غافل ہو جائے۔^②

① عبد الوارث بن سفیان ”مجہول“ نہیں ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اسی طرح اس کی سند میں ”احمد بن زہیر“ ہے، جو کہ ”ثقة“ ہے۔ اسے کسی نے ”مختل“ نہیں کہا ہے۔ خطیب بغدادی کی سند میں ”محمد بن محمد“ نام کا کوئی راوی نہیں ہے۔ واللہ اعلم

② مذکورہ بالا اثر کے راوی ابوخلیفہ کہتے ہیں: امام شعبہ بن حجاج کا مقصد یہ ہے کہ حدیث کے طلباء جو کچھ سنتے ہیں، اس پر عمل کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ احادیث سننے کے لالچ میں عمل کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ حدیث اللہ کے ذکر سے نہیں روکتی، بلکہ وہ تو اس کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ امام احمد بن حنبل سے شعبہ بن حجاج رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے متعلق سوال کیا گیا، تو فرمانے لگے: شاید شعبہ روزہ رکھتے ہو، اور طلب حدیث میں لگن رہنے کی وجہ سے مکان محسوس کرتے ہو، اسی وجہ سے روزہ یا نیکی کا کوئی دوسرا عمل بجالانے سے عاجز رہ جاتے ہو۔ حافظ خطیب بغدادی فرماتے ہیں: کسی شخص کے لیے یہ کہنا رواں نہیں کہ شعبہ رحمۃ اللہ علیہ طلب حدیث کو بوجہ خیال کرتے تھے، یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ جب کہ حدیث میں ان کے مرتبہ و مقام ←

ایاس بن معاویہ کا اثر:

﴿اللہ کی قسم میں بدمعاشوں سے اتنا نہیں ڈرتا، جتنا حدیث والوں سے ڈرتا ہوں۔﴾^①

جواب:

اصل بات یہ ہے کہ حدیث پڑھنا پڑھانا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس میں اگر غلطی ہو جائے، تو اس کا اثر سنانے والے پر بھی پڑتا ہے۔ جب حدیث سننے والے آتے، تو وہ ڈر جاتے کہ کہیں مجھ سے غلطی نہ ہو جائے۔ بدمعاش سے توبیخ کر بھی رہا جا سکتا ہے، مگر حدیث سننے کی درخواست پر خاموش رہنا مشکل ہے۔ لہذا اس کا یہ

﴿کی بدولت ہی ”امیر المومنین فی الحدیث“ ان کا نام رکھا گیا؟ یہ مرتبہ ان کو صرف حدیث کی طلب میں تک و دو کرنے کی وجہ سے دیا گیا، اور تمام عمران کا یہی مشغلہ رہا، یہاں تک کہ حدیث کے جمع و طلب کے لالچ میں ہی انھیں موت نے آیا۔

اس کے بعد خطیب بغدادی امام شعبہ بن حجاج کا قول نقل کرتے ہیں: بسا اوقات میں حدیث یاد کرتا ہوں، جب مجھے بھول جاتی ہے، تو اسی وجہ سے بیمار پڑ جاتا ہوں۔ اسی طرح امام شعبہ کے سامنے ایک ایسی حدیث ذکر کی گئی، جو اس سے پہلے انھوں نے نہیں سنی تھی، تو فرمانے لگے: ”واحرزناہ“ ہائے افسوس!! شرف أصحاب الحدیث (۱۶۴)

امام شعبہ بن حجاج کے طلب حدیث میں شدتِ حرص کا اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ خالد حذاء کے پاس گئے، جبکہ خالد اس وقت بیمار تھے۔ امام شعبہ بن حجاج ان کو کہنے لگے: آپ کے پاس ایک حدیث ہے، وہ مجھے بیان کر دیں، خالد نے جواب دیا: میں بیمار ہوں شعبہ نے کہا: صرف ایک حدیث کی تو بات ہے! لہذا خالد نے ان کو بیان کر دی، جب فارغ ہوئے تو شعبہ ان کو کہنے لگے: اب مرنا بھی چاہتے ہیں، تو بے شک مرجائے۔ شرف أصحاب الحدیث (۱۶۶)

① جامع بیان العلم: ۱۰۳۱/۲ (۱۹۷۷) یہ اثر ایاس بن معاویہ کی بجائے ”مغیرۃ الضبی“ سے مروی ہے، اس کی سند میں اسحاق بن ابراہیم بن نعمان کا ترجمہ و توثیق نہیں مل سکی۔ واللہ اعلم

مطلب نہیں کہ وہ پڑھنے یا پڑھانے کو برا سمجھ رہے ہیں، اگر ایسا ہوتا، تو حدیث کا مشغلہ ہی چھوڑ دیتے۔

امام داؤد طائی کا اثر:

❖ امام داؤد طائی سے کسی نے پوچھا کہ آپ احادیث کی روایت کیوں نہیں کرتے؟ فرمایا ”میں بچوں کا کھلونا نہیں بننا چاہتا۔“

جواب:

اصل الفاظ یہ ہیں:

”قيل لداود الطائي ألا تحدث؟ قال ما راحتي في ذلك
أكون مستمليا على الصبيان فيأخذون علي سقطي فإذا
قاموا من عندي يقول قائل منهم أخطأ في كذا ويقول آخر
غلط في كذا“^❶

”یعنی داؤد طائی سے پوچھا گیا کہ کیا آپ حدیث نہیں سناتے؟ آپ نے فرمایا: مجھے بچوں پر حدیث پڑھنے میں کیا راحت ہے؟ وہ میری غلطیاں نکالیں گے۔ جب چلے جائیں گے، تو کوئی کہے گا کہ اس نے فلاں کلمہ میں خطا کی، دوسرا کہے گا: اس نے فلاں کلمے میں غلطی کی۔“

اس اثر میں داؤد طائی نے حدیث لکھنے یا پڑھنے پڑھانے کو منع نہیں بتایا بلکہ آپ نے ان کی درخواست نہ قبول کرنے کی معذرت بیان فرمائی ہے۔

❶ جامع بیان العلم: ۱۰۲۱/۲ (۱۹۴۸) اس کی سند میں بھی إسحاق بن إبراهيم بن نعمان ہے جس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔ واللہ اعلم۔

فصیل بن عیاض کا اثر:

﴿ ”إنکم قد ضیعتم کتاب اللہ ولو طلبتم کتاب اللہ لو جدتم فیہ شفاء ثم قرأ ﴿۱﴾ یا أیہا الناس قد جاء تکم موعظة من ربکم وشفاء لما فی الصدور وهدی ورحمة للمؤمنین قل بفضل اللہ وبرحمته فبذلک فلیفرحوا هو خیر مما یجمعون﴾ ” [یونس: ۵۷-۵۸]

”تم لوگوں نے کتاب اللہ کو ضائع کر دیا ہے۔ اگر تم کتاب الہی کی تلاش کرتے تو اس میں تمہیں شفاء مل جاتی..... اور اس کے بعد یہ آیت پڑھی (جس کا مطلب یہ ہے کہ ”اے لوگو! اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ضابطہ حیات آچکا ہے۔ جس میں دل کی تمام بیماریوں کا علاج ہے اور جو اہل ایمان کیلئے ہدایت کلی اور رحمت ہے۔ اے رسول! مسلمانوں سے فرما دیجئے اللہ تعالیٰ کے اس فضل اور رحمت پر خوش ہو جاؤ۔ اور یہ قرآن اس چیز سے اچھا ہے، جسے وہ جمع کر رہے ہیں۔“

جواب:

۱: اس کی سند میں تین راوی ہیں:

۱؎ إسحاق بن ابراہیم۔

۲؎ محمد بن علی۔

۳؎ أبو عبد الرحمن۔

یہ تینوں کے تینوں مجہول ہیں، لہذا یہ اثر سند کے لحاظ سے باطل ہے۔^۱

۱ اس اثر کی سند میں یہ تینوں راوی نہیں ہیں۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

ب: اس اثر میں بھی صرف قرآن کی مدح و تعریف اور جامعیت کا ذکر ہے۔ اس سے پہلے تفصیل کے یہ لفظ ہیں:

”ما هكذا كنا نطلب العلم ولكننا كنا نأتي المشيخة فلا نرى أنفسنا أهلاً للجلوس معهم فنجلس دونهم ونسترق السمع فإذا مر الحديث سألنا إعادته وقيدناه وأنتم تطلبون العلم بالجهل“ (ص ۱۸۱) ①

① جامع بیان العلم: ۱۰۲۳/۲ (۱۹۵۳) حافظ ابن عبد البر نے اس اثر کی یہ سند ذکر کی ہے:

”قال ابن عبد البر أخيراً أحمد بن محمد قال أنا أحمد بن سعيد ثنا أبو عمرو عثمان بن عبد الرحمن قال نا إبراهيم بن نصر أبو إسحاق السرقسطي ثنا أحمد بن مندوس ثنا أبي الحواري قال أتينا فضيل بن عياض.....“ رواة کا ترجمہ یہ ہے:

② أحمد بن محمد بن أحمد بن الحباب بن الجصور أبو عمر القرطبي کے متعلق تفصیل گزر چکی ہے۔ دیکھیں:

③ أحمد بن سعيد بن حزم بن يونس أبو عمر الصديقي الأندلسي قال ابن الفرضي: عني بالآثار والسنن و جمع الحديث“ اس کے متعلق جرح و تعدیل نہیں مل سکی۔ (تاریخ علماء الأندلس: ۱۷/۱، جذوة المقتبس: ۴۶، تاریخ الإسلام للذهبي۔

④ ”عثمان بن عبد الرحمن بن عبد الحميد أبو عمرو القرطبي“ قال ابن الفرضي: ”كان فاضلاً خيراً و قوراً ضابطاً لكتبه مثقفاً لروايته و كان حافظاً للفقہ مشاوراً للأحكام، سمعت محمد بن محمد بن علي و غيرهما ممن حدثنا عنه يثنون عليه و يوثقونه“ (تاریخ علماء الأندلس: ۱۱۲/۱، تاریخ الإسلام للذهبي)۔

⑤ إبراهيم بن نصر السرقسطي أبو إسحاق، قال ابن الفرضي: كان عالماً بالحديث بصيراً بطلعه حدث عنه عثمان بن عبد الرحمن بن أبي زيد..... و كان ثقة“ (تاریخ علماء الأندلس: ۵/۱، جذوة المقتبس: ۵۸)۔

⑥ ”أحمد بن مندوس“ اس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔

⑦ أحمد بن عبد الله بن أبي الحواري أبو الحسن الدمشقي ”ثقة“۔ (الجرح والتعديل: ۴۷/۲، الثقات لابن حبان: ۲۴/۸، تقريب التهذيب: ۸۱ (۶۱))

”ہم تمہاری طرح علم نہیں طلب کرتے تھے، لیکن ہم مشائخ کے پاس آتے اور اپنے تئیں ان کے پاس بیٹھنے کا اہل خیال نہ کرتے، ان سے درے بیٹھ جاتے اور چھپ کر سنتے۔ جب حدیث کا ذکر آتا، تو اس کے اعادہ کی درخواست کرتے اور اس کو لکھ لیتے..... اور تم علم کو جہالت کے ساتھ طلب کر رہے ہو۔“

یہ اثر حدیث کے لکھنے لکھانے اور پڑھنے پڑھانے کا موید ہے اور ”دو اسلام“ میں قطع و برید سے کام لیا گیا ہے اور اپنی طرف سے کچھ اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ نیز یہ اثر بلحاظ سند ”صحیح“ نہیں:

① اس کی سند میں ”عثمان بن عبدالرحمن ابو عمرو“ ہے، جس کو کتب رجال میں ”متروک الروایۃ“ جھوٹا لکھا گیا ہے۔

② اس کا دوسرا راوی ابراہیم اور تیسرا راوی أحمد دونوں مجہول ہیں۔

① عثمان بن عبد الرحمن أبو عمرو کی توثیق گزر چکی ہے۔ جس کو ”متروک اور جھوٹا“ کہا گیا ہے وہ ”عثمان بن عبد الرحمن بن عمر بن سعد بن أبي وقاص الوقاصي المدني“ ہے، اس اثر کی سند میں یہ راوی نہیں ہے۔

اسی طرح ابراہیم بن نصر أبو إسحاق السرقسطي ”ثقہ“ ہے، جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ أحمد بن مندوس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔ اسی طرح مؤلف ثلاث نے جو پہلے تین رواۃ ذکر کیے ہیں: (۱) اسحاق بن ابراہیم (۲) محمد بن علي (۳) ابو عبد الرحمن یہ رواۃ اس اثر کی سند کے بجائے اس سے ما قبل تفصیل بن عیاض سے ہی مروی ایک دوسرے اثر کی سند کے رواۃ ہیں۔ (جامع بیان العلم: ۱۰۸۲/۲: ۱۹۵۲)

① اسحاق بن ابراہیم بن نعمان کے متعلق جرح و تعدیل نہیں مل سکی، جیسا کہ گزر چکا ہے۔

② محمد بن علی، اس کا صحیح نام ”محمد بن علي بن مروان القاضي“ ہے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

”كان محمود السيرة شديد الهيبه سريع الفصل موصوفا بالعدل ذا ثوده و سؤدد“ (تاریخ الاسلام)

③ ”ابو عبد الرحمن الضرير أحمد بن جعفر الوكيعي“ اسے امام دارقطني وغیرہ نے ”ثقہ“

اور ”حافظ“ قرار دیا ہے۔ (تاریخ بغداد: ۵۸/۴: ۱۶۷۵)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اثر:

❖ ”قال أبو هريرة لقد حدثتكم بأحاديث لو حدثت بها في زمن عمر بن الخطاب لضربني بالدرّة“ (تذکرہ: ۸)
 ”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تم کو ایسی حدیثیں سنائی ہیں کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں سناتا، تو وہ مجھے درّہ سے پیٹتے۔“

جواب:

تذکرہ (۷:) میں اس اثر کے یہ لفظ ہیں:
 ”وقلت له أكنت تحدث في زمان عمر هكذا فقال لو كنت أحدث في زمان عمر مثل ما أحدثكم لضربني بمخفقتة“
 ”ابو سلمہ کہتے ہیں: میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی اس کثرت سے حدیث بیان کیا کرتے تھے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں میں اسی طرح حدیث سناتا، تو وہ مجھے درّے سے پیٹتے۔“❶

اس کا مطلب یہ ہے کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کثرت سے حدیثیں بیان نہیں کیا کرتا تھا، بلکہ کم بیان کرتا تھا، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زیادہ احادیث بیان کرنے سے منع فرمایا تھا کہ مبادا کہیں غلطی واقع ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس احتیاط پر عمل کرنے سے احادیث محفوظ ہو گئیں، تو بعد میں بیان کرنے سے وہ مانع مرتفع ہو گیا۔ اس واسطے اب میں زیادہ حدیثیں بیان کرتا ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ احادیث بیان کرنے کے خلاف نہ تھے، صرف احتیاط کی تاکید

❶ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ اثر پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا، تفصیل گزر چکی ہے۔

کرتے تھے، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”أَقْلُوا الرِّوَايَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ“^①

”آنحضرت ﷺ سے حدیثیں کم بیان کیا کرو،“

پھر خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی بکثرت احادیث مروی ہیں۔

سفیان ثوری رضی اللہ عنہ کا اثر:

❖ ”لو كان في هذا الحديث خير لنقص كما ينقص الخير

ولكنه شر فأراه يزيد كما يزيد الشر“ (جامع: ۱۷۸)

”اگر حدیث کوئی اچھی چیز ہوتی، تو باقی نیکیوں کی طرح گھٹتی جاتی، لیکن یہ

بڑھ رہی ہے، اس لئے شر ہے۔“^②

① سنن ابن ماجہ: باب التوقي في الحديث عن النبي صلى الله عليه وسلم ، رقم

الحديث (۲۸)، المستدرک: ۱/۱۸۳ (۳۴۷) اسے امام حاکم اور ذہبی رحمہما نے ”صحیح“ قرار

دیا ہے۔

② جامع بیان العلم: ۲/۱۰۱۵ (۱۹۳۶)، نیز دیکھیں: شرف أصحاب الحديث (۱۲۳)، حلیۃ

الاولیاء: ۶/۳۶۹۔ حافظ ابن عبد البر کی سند میں ”إسحاق بن إبراهيم بن نعبان“ ہے، جس کا

ترجمہ نہیں مل سکا۔ خطیب بغدادی نے یہ اثر دو اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ پہلی سند میں الخضر

بن أبان الهاشمي “ ضعیف ہے۔ (لسان المیزان: ۲/۳۹۹ (۱۶۳۴)، اور دوسری سند میں

”خلف بن خلیفہ“ ہے، جو کہ آخری عمر میں اختلاط کا فکار ہو گئے تھے۔ امام أحمد بن حنبل فرماتے

ہیں: جس نے اس سے اول وقت میں لکھا ہے، اس کا سماع صحیح ہے۔ (الکواکب النیرات: ۲۹)

(۲۰) اس سند میں ”علی بن حجر“ اس سے روایت کرتے ہیں، ان کے متعلق معلوم نہیں کہ

”خلف بن خلیفہ“ سے ان کا سماع اختلاط سے پہلے تھا یا بعد میں۔ واللہ اعلم

حافظ ابو نعیم اصبہانی نے اس کی تیسری سند بھی ذکر کی ہے، لیکن اس میں ”إبراهيم بن عبد

الله بن إسحاق أبو إسحاق الأصبهاني“ مستور ہے۔ (تاریخ بغداد: ۶/۱۲۷ (۳۱۵۹)،

أخبار أصبهان: ۱/۲۰۱)

جواب:

یہ اثر صحیح نہیں:

۱ اس کا راوی علی بن حسین "کذاب" ہے۔^①

۲ عام امت کا عمل اس کے خلاف ہے۔

۳ سفیان ثوری سے صحاح ستہ میں صدہا احادیث تو اتر سے ثابت ہیں۔

سفیان بن عیینہ کا اثر:

❖ حدیث کی فرمائش کی گئی، تو آپ نے فرمایا:

”ما أدري الذي تطلبونه من الخير ولو كان من الخير لنقص
كما ينقص الخير“^②

① حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے اس اثر کی یہ سند ذکر کی ہے: قال ابن عبد البر أخبرنا عبد الرحمن بن يحيى ثنا أحمد بن سعيد ثنا إسحاق بن إبراهيم بن نعمان ثنا أبو بكر محمد بن علي بن مروان قال حدثنا علي بن جميل قال ثنا علي بن سعيد قال ثنا شعيب بن حرب قال كنا عند سفیان..... اس کی سند میں ”علی بن حسین“ کی بجائے ”علی بن جميل“ ہے اور وہ کذاب اور وضاع ہے۔ (الکامل: ۲۱۵/۵، المجروحین: ۱۱۶/۲، لسان المیزان: ۱۸۵/۱، الكشف للحیث: ۱۸۵) (۵۰۰)، الضعفاء للأصبهانی: ۱۱۷)

② جامع بیان العلم: ۱۰۱۶/۲ (۱۹۳۸) قال ابن عبد البر: أخبرنا عبد الله بن محمد بن يوسف ثنا يحيى بن مالك ثنا محمد بن سليمان بن أبي شريف قال حدثني محمد بن موسى قال سمعت زكريا القطان يقول رأيت سفیان بن عیینة.....

③ عبد الله بن محمد بن يوسف أبو الوليد القاضي المعروف بابن الفريسي، ”كان حافظا متقنا عالما ذا حظ من الأدب وافر“ (جذوة المقتبس: ۹۰، نفع الطيب للتلمساني: ۱۷۰/۳) حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”الحافظ الإمام الحجة“ وقال ابن حبان: لم نر مثله ابن الفريسي بقرطبة في سعة الرواية وحفظ الحديث ومعرفة الرجال“ (تذكرة الحفاظ: ۱۰۷۶/۳) حافظ ذہبی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: عبد الله بن محمد بن يوسف ←

”تم جس چیز کی تلاش میں ہو، وہ کوئی نیکی نہیں، اگر نیکی ہوتی تو باقی نیکیوں کی طرح کم ہو جاتی۔“

جواب:

اس کے متعلق حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں:

”یہ بات سفیان نے طلبہ سے تنگ آ کر کہی (کیونکہ طلباء نے صفا و مروہ کے درمیان چلتے چلتے ان کو حدیث سنانے پر مجبور کیا) اور اہل علم اس اثر میں کلام کرتے ہیں (یعنی یہ اثر بلحاظ سند ”صحیح“ نہیں) ^①

← شیخ لأبی عمر بن عبد البر، جہلہ ابن القطان، قلت: و هو عجیب فهو أبو الولید بن الفرضی الحافظ الکبیر و لیس هو ممن یجہل مثله۔ (میزان الاعتدال: ۱۳۹/۸، لسان المیزان: ۳/۳۵۵)

② یحییٰ بن مالک بن عائذ أبو زکریا الأندلسی: حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ”الحافظ الکبیر أبو زکریا الأندلسی“ لہ رحلۃ و حفظ و اشتہار“ و قال ابن الفرضی: کان صحیح الکتاب صحیح القلم و کان حلیماً کریماً جواداً صواماً دیناً مع سلامۃ دینہ و حسن یقینہ“ (تذکرۃ الحفاظ: ۳/۱۰۰۳، تاریخ الإسلام للذہبی، تاریخ علماء الأندلس: ۲۱۰، نفع الطیب: ۲/۱۵۱)

③ محمد بن سلیمان بن أبی الشریف أبو بکر المالکی، قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ ذکر کیا ہے۔ لیکن جرح و تعدیل نقل نہیں کی۔ (ترتیب المدارک: ۱/۳۵۵)

④ محمد بن موسیٰ - واللہ أعلم

⑤ زکریا القطان: سفیان بن عیینہ سے زکریا بن یحییٰ بن أسد المروزی روایت کرتے ہیں۔ جو کہ ”صدوق“ ہے۔ (تاریخ بغداد: ۸/۴۶۰، الثقات لابن حبان: ۸/۲۵۵، لسان المیزان: ۲/۴۸۵)

① جامع بیان العلم: ۲/۱۰۱۶، حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ کے اصل الفاظ یہ ہیں: ”هذا کلام خرج علی ضجر، وفيه لأولي العلم نظر!“

نیز یہ اثر باطل ہے:

- ① اس کی سند میں ”عبداللہ بن محمد بن یوسف“ مجروح ہے۔
 - ② اس میں یحییٰ بن مالک ہے، یہ بھی مجروح ہے۔
 - ③ محمد بن سلیمان بن محمد مجہول ہے۔
 - ④ زکریا قطان، یہ بھی مجہول ہے۔
 - ⑤ محمد بن موسیٰ بہت ہیں، بعض مجروح اور بعض غیر مجروح۔^①
- گویا عام سلسلہ ہی وہی تباہی ہے۔

بکر بن حماد کے شعر:

❖ أرى الخير في الدنيا يقل كثيره
وينقص نقصا والحديث يزيد
فلو كان خيرا قل كالخير كله
و أحسب أن الخير منه بعيد
”میں دیکھ رہا ہوں، نیکی کم ہو رہی ہے، لیکن حدیث بڑھ رہی ہے۔ اگر
حدیث اچھی چیز ہوتی، تو باقی نیکیوں کی طرح گھٹتی جاتی، اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ خیر اس سے بعید ہے۔“^② (توجیہ ص ۲۱)

جواب:

اس کا جواب شعروں ہی میں لیجئے، جس پر ایک جماعت کا اتفاق ہے:

- ① اس کی سند میں مذکور عبد اللہ بن محمد بن یوسف ابن الفرضی صاحب تاریخ علماء
الاندلس پر کسی نے جرح نہیں کی، عبداللہ بن محمد بن یوسف مجروح دوسرا راوی ہے۔ اس طرح یحییٰ
بن مالک بن عائد پر کوئی جرح نہیں، یحییٰ بن مالک بن انس مجروح ہے۔ (لسان المیزان:
۲۷۴/۶)

- ② جامع بیان العلم ۱۰۱۶/۲ (۱۹۳۹) شرف أصحاب الحديث (۱۲۳)،

وقول رسول الله يعرف حده
فليس له عند الرواة مزيد
ولولم يقيم أهل الحديث بديننا
فمن كان يروي علمه ويفيد
”آنحضرت ﷺ کے قول کی حد معروف ہے، راویوں نے اس پر کچھ
اضافہ نہیں کیا۔ اگر اہل حدیث ہمارے دین کے لیے کوشش نہ کرتے تو
آنحضرت ﷺ کا علم کون بیان کرتا اور کیونکر ہمارے لئے مفید ہوتا؟“^①

(مختصر جامع ابن عبدالبر: ۱۷۰)

سفیان ثوری کا ایک اثر:

”میں گزشتہ ساٹھ برس سے حدیث میں ہوں، چاہتا ہوں کہ اس سے نکل
جاؤں، نہ مجھے نفع ہو، نہ نقصان!“^②

جواب:

یہ اثر بھی بلحاظ سند باطل ہے:

① ایک راوی قطبہ بن علاء بن منہال غنوی ”کثیر الخطا“ غیر معتبر ہے۔

① جامع بیان العلم: ۲/۱۰۱۸

② جامع بیان العلم: ۲/۱۰۲۵ (۱۹۵۷) نیز دیکھیں: مقدمة الجرح و التعديل: ۶۱، حلیۃ

ملاولیا: ۶/۳۶۳، ۷/۵۷، ۶۳، شرف أصحاب الحديث (۱۱۶) یہ اثر امام سفیان ثوری سے کئی
اسانید سے مروی ہے، امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں:

”حدثنا عبد الله بن محمد بن عمرو الغزي قال سمعت الفريابي و قال ابن أبي حاتم
حدثني أبي نا أبو عمر عيسى بن محمد النحاس الرحلي قال قال ضمرة سمعت سفیان
الثوري.....“ یہ سند ”صحیح“ ہے۔

② احمد بن زہیر مجہول ہے۔

③ احمد بن صالح بھی مجہول ہے۔

④ ابن منادی، یہ بھی مجہول ہے۔

⑤ احمد بن محمد بن عبدالحق مجہول نامقبول ہے۔^①

اس کے علاوہ اس کی باقی سندیں بھی صحیح نہیں۔ ایک سند میں ”علی بن قادم“ ”منکر الحدیث“ ہے۔ دوسری میں ”خضر بن أبان ہاشمی“ مجروح ثقہ نہیں۔

① قطبہ بن علاء بن منہال أبو سفیان الغنوی الکوفی ”یہ ”ضعیف“ ہے۔ (التاریخ الکبیر: ۱۹۱/۷، الضعفاء للبخاری: ۹۶، الجرح والتعديل: ۱۴۱/۷، الکامل فی الضعفاء: ۵۳/۶، لسان المیزان: ۴/۴۷۳)۔

لیکن اس کی فریابی، قبیصہ، ضمرہ بن ربیعہ“ اور دیگر کئی رواۃ نے متابعت کی ہے۔ لہذا اس پر جرح سے مذکور اثر کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

② أحمد بن زہیر بن حرب بن شداد أبو بکر النسائي البغدادي المعروف بابن أبي خيثمة، صاحب التاريخ یہ ”ثقہ حافظ“ ہیں، ان پر کوئی جرح نہیں۔ ان کا تفصیلی تذکرہ گزر چکا ہے۔

③ أحمد بن صالح بن عمر أبو بکر المقرئ البغدادي: ”کان ثقة ضابطا مشهورا“ (تاریخ الإسلام للذهبي)

④ أحمد بن جعفر بن محمد بن عبيد الله بن الصادي أبو الحسين۔ خطیب بغدادی فرماتے ہیں: ”کان ثقة أمينا ثبتا صدوقاً ورعاً حجة ورعاً فيما يرويه مخلصاً لما عليه صنف كتب كثيرة و جمع علومها جمعة۔ قال الداني: غاية في الإتقان ثقة مأمون صاحب سنة“ (تاریخ بغداد: ۶۹/۴) (۱۶۹۰)، معرفة القراء الکبار للذهبي: ۲۸۵/۱ (۱۹۸)

⑤ ”أحمد بن محمد بن عبد الخالق أبو بکر الوراق“ قال الخطيب: کان ثقة معروفا بالخیر والصلاح و قال الأذنوني: لا بأس به، و قال الأزدي: صدوق (تاریخ بغداد: ۵/۵) (۲۴۲۲) مذکورہ بالا پانچ راوی ایک سند کے نہیں بلکہ دواسانید کے ہیں۔

محمد بن حسین بن فضل قطان، یہ بھی نامقبول ہیں۔^①

سفیان کی طرف منسوب ایک اثر:

② سفیان نے ایک دفعہ کہا: خدا کرے، دشمن کو محدث بنادے۔“

① علی بن قادم اسے ابو حاتم نے ”محلہ الصدق“ ابن حبان، محلی، یعقوب بن سفیان اور ابن خلّوفون نے ”ثقة“ قرار دیا ہے۔ ابن قانع نے کہا ہے: ”کوفي صالح“ زکریا ساجی نے ”صدوق و فیہ ضعف“ کہا ہے۔ قال ابن سعد: کان ممتنعاً، منکر الحدیث شدید التشیع و قال ابن معین ”ضعیف“ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”صدوق یشیع“ امام ابن عدی فرماتے ہیں: و نقم علی علی بن قادم أحادیث رواها عن الثوري غير محفوظة و هو ممن یکتب حدیثہ“ اور مذکورہ بالا اثر سفیان ثوری سے ہی مروی ہے، (الثقات لابن حبان: ۴۵۹/۸، الثقات للعجلي: ۱۵۲/۲، المعرفة والتاريخ: ۴۳۶/۲، الكامل لابن عدي: ۲۰۱/۵، تہذیب التہذیب: ۳۲۷/۷، تقریب التہذیب: ۴۰۴ (۴۷۸۵))

② خضر بن أبان الهاشمي ”ضعیف“ ہے۔ (لسان المیزان: ۳۹۹/۲)

③ محمد بن حسین بن محمد بن الفضل أبو الحسن الأزرق القطان ”خطیب بغدادی“ فرماتے ہیں: ”کتبتا عنہ و کان ثقة“ ان کی أبو سعید الصیرفی نے متابعت کی ہے۔ (شرف أصحاب الحدیث (۱۱۶))

② جامع، بیان العلم: ۱۰۲۷/۲ (۱۹۶۵)، حلیۃ الأولیاء: ۲۱۶/۷) سفیان بن عیینہ نے یہ اثر مسعر بن کدام سے نقل کیا ہے۔ قال ابن عبد البر: حدثنا خلف بن القاسم نا الحسن بن رشيق نا علي بن سعيد نا محمد بن خلاد الباهلي نا سفیان بن عیینہ قال سمعت مسعراً رواة کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

① خلف بن القاسم بن سهل - قال الذهبي: الحافظ الإمام المتقن، کان من بحور الرواية“ (سير أعلام النبلاء: ۱۱۳/۱۷، تذکرة الحفاظ: ۱۰۲۵/۳) نیز دیکھیں: تاریخ علماء الأندلس: ۱۳۶/۱، جذوة المقتبس: ۲۰۹، تاریخ دمشق: ۱۳/۱۷)

② ”الحسن بن رشيق العسکری“ یہ ثقہ ہے۔ (لسان المیزان: ۲۰۷/۲، تذکرة الحفاظ:



جواب:

① یہ سفیان کا کلام نہیں اور سند کے اعتبار سے یہ بھی اثرِ باطل ہے۔ (یہ کلام مسعر کا ہے)

② اس میں ایک راوی خلف بن قاسم مجہول ہے۔

③ علی بن سعید بن بشیر رازی مجروح ہے۔^①

سفیان کا ایک اور اثر:

④ ”اگر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) ہوتے، تو تم کو درے لگاتے۔“^②

جواب:

یہ بھی باعتبار سند باطل ہے۔ اس میں مسلمہ بن قاسم، احمد بن عیسیٰ اور ابراہیم بن سعید تینوں مجروح ہیں۔

⑤ ”علی بن سعید“ اس کی ”ابو القاسم البغوي“ نے متابعت کی ہے۔ (حلیۃ الأولیاء:

(۲۱۶/۷)

⑥ محمد بن خلاد بن کثیر الباہلی البصري“ اسے مسدد، ابن حبان اور مسلمہ بن قاسم

نے ”ثقة“ قرار دیا ہے۔ (الثقات لابن حبان: ۸۷/۹، تہذیب التہذیب: ۱۳۳/۹)

① خلف بن قاسم ”ثقة“ ہے، جیسا کہ گزرا ہے۔ علی بن سعید بن بشیر الرازی ”مختلف فیہ“ ہے، لیکن ابو القاسم البغوي نے اس کی متابعت کی ہے۔

② جامع بیان العلم: ۱۰۲۸/۲ (۱۹۶۶) قال ابن عبد البر: أخبرنا أحمد بن عبد اللہ نا مسلمہ

بن قاسم نا أحمد بن عیسیٰ نا ابراہیم بن أحمد نا ابراہیم بن سعید قال سمعت سفیان بن

عیینہ..... اس کی سند میں ”مسلمہ بن قاسم“ ضعیف ہے۔ (لسان المیزان: ۳۵/۶) ابراہیم

بن سعید أبو إسحاق الجوهري ”ثقة“ ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ثقة حافظ تکلم

فیہ بلا حجة“ دیکھیں: تہذیب الکمال: ۹۵/۲، تقریب التہذیب: ۸۹ (۱۷۹)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی عمر:

﴿۸﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سینکڑوں احادیث کے راوی ہیں، لیکن علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ رحلت رسول (ﷺ) کے وقت ان کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی۔

جواب:

اس سے لازم نہیں آتا کہ سب کی سب ان کی مسوع ہیں، بلکہ دوسرے صحابہ سے سب سن کر بیان کرتے ہیں۔^۱ اور تیرہ برس کا لڑکا ہوشیار ہوتا ہے۔ بعض افراد

۱ اس بات کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس اثر سے بھی ہوتی ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ وفات پا گئے، تو میں نے قبیلہ انصار کے ایک آدمی سے کہا: آج صحابہ کرام کی کثیر تعداد ہم میں موجود ہے، چلو آؤ ان سے علم حاصل کرتے ہیں! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: وہ آدمی میری بات سن کر تعجب سے کہنے لگا: تم سمجھتے ہو کہ صحابہ کرام کی موجودگی میں لوگ تمہارے علم کے محتاج ہوں گے!! لہذا وہ انصاری دوست تو یہ کہہ کر چلا گیا اور میں طلب علم میں گمن ہو گیا، کسی آدمی کی طرف سے مجھے کوئی حدیث پہنچتی، تو بسا اوقات میں اس وقت آتا، جب وہ آدمی سو رہا ہوتا، میں بھی اس آدمی کے دروازے پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا جبکہ تیز ہوا میرے چہرے پر دھول اور گرد و غبار ڈالتی رہتی۔

جب وہ آدمی باہر نکل کر مجھے دیکھتا، تو کہتا: اے رسول خدا کے چچا زاد! آپ نے کیوں آنے کی تکلیف کی، مجھے پیغام بھیج دیا ہوتا، میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا؟ میں جواب دیتا: نہیں! آپ کے پاس میرا آنا ہی ضروری تھا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں:

تو ایک وقت آیا، جب وہ انصاری آدمی میرے پاس سے گزرا اور لوگ میرے ارد گرد بیٹھ کر مجھ سے سوالات کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ انصاری دوست کہنے لگا: یہ نوجوان مجھ سے زیادہ عقل مند تھا۔

امام حاکم اس اثر کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: یہ حدیث بخاری کی شرط پر ”صحیح“ اور طلب حدیث اور محدث کی توقیر و تعظیم میں اصل بنیاد ہے، نیز اس اثر کو امام ذہبی نے بھی ”صحیح“ قرار

دیا ہے۔ (سنن الدارمی: ۱/۱۵۰، (۵۷۰) المستدرک: ۱/۱۸۸، (۳۶۳)، المعجم الکبیر:

۱۰/۲۴۴ (۱۰۵۹۲)، فضائل الصحابة للإمام أحمد: ۲/۹۷۶ (۱۹۲۵)، الإصابة: ۴/۱۴۵

عقل و تمیز میں بالغوں کی طرح ہوتے ہیں۔^①

محدثین پر الزام تراشی:

④ ”ہمارے سوانح نگاروں میں ایک خاص نقص تھا کہ وہ کسی کردار پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے عادی نہیں تھے، ہمیشہ حسن ظن سے کام لیتے تھے اور مبالغہ آمیز مدح سرائی پر اتر آتے تھے۔ اس وقت ”تذکرۃ الحفاظ“ میرے سامنے پڑا ہے، جس میں ہزار ہا راویان اور حفاظ حدیث کے حالات مرقوم ہیں۔ میں ایک ہی دور کے چند راوی لے کر ان کی زبانی ان کی کہانی سناتا ہوں، جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ہمارے بزرگوں کا اندازِ کردار نویسی کیا تھا؟

مثلاً ”علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب“ کے متعلق لکھتے ہیں: آپ رات دن میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ اگر سونے، کھانے، ضروری حاجات اور وضو کیلئے کم از کم آٹھ گھنٹے الگ کر لئے جائیں، تو باقی سولہ گھنٹے بچتے ہیں۔ اگر ہر رکعت پر اوسطاً دو منٹ صرف ہوں، تو یہ تینتیس گھنٹے اور ۲۰ منٹ بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سولہ گھنٹوں میں

● حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ وہ سوال کرنے والی زبان اور عقل و تمیز کرنے والے دل کا مالک ہے۔ (تاریخ جرجان: ۴۸۳، الاستیعاب: ۲۸۴/۱، البدایہ والنہایہ: ۲۹۹/۸) اسی طرح جب حضرت عبد اللہ بن عباس سے یہ پوچھا جاتا کہ آپ نے کیسے یہ علم حاصل کیا تو فرمایا کرتے تھے: سوال کرنے والی زبان اور سمجھنے والے دل کے ساتھ (فضائل الصحابة: ۲/۹۷۰، ۱۹۰۳)، البدایہ والنہایہ: (۲۹۹/۸) حضرت ابن عباس کے طلب علم میں شوق و جذبہ اور شدتِ حرص کا یہ عالم تھا کہ فرماتے ہیں: بسا اوقات ایک ہی بات کے متعلق میں تیس صحابہ کرام سے سوال کیا کرتا تھا۔ (البدایہ والنہایہ: ۲۹۹/۸)

تینتیس گھنٹوں کا کام سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔“

جواب:

اس کا جواب لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ ایک رکعت ایک منٹ میں بھی پڑھی جاسکتی ہے اور کھانے سونے اور دیگر ضروریات کیلئے بجائے آٹھ گھنٹوں کے چھ گھنٹے بھی لگائے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ نیند کی طبعی مقدار ہر شخص کیلئے الگ الگ ہے۔ بعض آدمی صرف دو گھنٹہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہم نے ایک آدمی دیکھا، جس کی نیند طبعی اس سے بھی کم ہے۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہے اور اس کی صحت بھی بالکل ٹھیک ہے۔ پھر اس میں ذہبی رحمہ اللہ کا کیا قصور ہے۔ وہ تو ناقل ہے، امام مالک سے نقل کر رہا ہے۔ امام مالک نے بھی ”بَلَّغْنِي“ سے بیان کیا ہے۔^① اور محدثین کے طریق پر یہ اثر ”صحیح“ نہیں۔ اگرچہ جو کچھ بیان کیا ہے، عقلاً ممکن ہے۔

الزام تراشی کی حقیقت:

❖ ”اس سے آگے ”دو اسلام“ میں آٹھ آدمیوں کا ذکر ہے، جن کے متعلق ذہبی نے نقل کیا ہے، وہ اعلیٰ درجے کے عالم تھے، ہم نے ان کو جدول میں بیان کر دیا ہے۔

نام	عربی عبارت	ترجمہ
مطرف بن عبداللہ۔ (وفات ۹۵ھ)	كان رأساً في العلم والعمل	علم و عمل میں سردار تھے ^②

① ویکس: تذکرۃ الحفاظ: ۷۵/۱

② تذکرۃ الحفاظ: ۶۴/۱

محمد بن سیرین وفات (۱۱۰ھ)	عزیز العلم ثقة راس في الورع	علم میں بے مثال، قابل اعتماد اور عمل یعنی تقویٰ میں سردار ^①
---------------------------	--------------------------------	--

اعتراض یہ ہے کہ دونوں ہم عصر اور دونوں علم و عمل میں سردار یہ کیسے ممکن ہے؟

جواب:

بالکل فضول اعتراض ہے کہ دو آدمی علم اور عمل میں سردار نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ یہ کوئی مستبعد نہیں۔ علم میں سردار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مرتبہ علم میں بلند تھا۔ ایک سے زیادہ آدمیوں کا مرتبہ علم میں بلند ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً﴾^②

”ہم نے ان کو امام بنایا۔“

دونوں کی وفات میں بھی فرق ہے، سرداری کی نوعیت میں بھی اختلاف ہے۔ مطرف کے متعلق علم و عمل میں سردار لکھا ہے۔ محمد بن سیرین کے متعلق پرہیزگاری میں سردار لکھا ہے وغیرہ وغیرہ

ج: طاؤس بن کیسان	کان رأساً في العلم	علم اور پرہیزگاری
وفات ۱۰۸ھ	والورع	میں سردار تھے۔ ^③
د: ابوصالح ذکوان	من أجل الناس	سب سے زیادہ

① تذكرة الحفاظ: ۷۸/۱

② الأنبياء: ۷۳

③ تذكرة الحفاظ: ۹۰/۱، حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”فاتق موتہ بمكة قبل التروية بيوم“

سنة ست و مائة“

بزرگ اور بڑا قاتل
اعتماد^①

وفات ۱۱۰ھ وأوثقہم

شعی سے بڑا عالم
اور فقیہ میں نے نہیں
دیکھا۔^②

ما رأیت أعلم وأفقہ
من الشعبي

شعی

عکرمہ سے بڑھ کر
کتاب اللہ کا عالم
باقی نہیں رہا۔^③

ما بقی أحد أعلم
بکتاب اللہ من عکرمہ
(یہ شعی کا قول ہے)

س: عکرمہ

وفات ۱۰۷ھ

میں نے قاسم سے
کوئی فقیہ بڑا عالم
نہیں دیکھا۔^④

ما رأیت فقیہا أعلم
من القاسم

ح: قاسم بن محمد بن ابی بکر

وفات ۱۰۶ھ

میں نے عطاء سے
افضل کوئی نہیں
دیکھا۔^⑤

ما رأیت أفضل
من عطاء

و: عطاء بن ابی رباح

وفات ۱۱۴ھ

① تذکرۃ الحفاظ: ۸۹/۱۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”توفي سنة إحدى و مائة رحمه الله“
، مذکورہ بالا قول امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مروی ہے۔

② تذکرۃ الحفاظ: ۸۱/۱ اس میں دو اقوال کو جمع کیا گیا ہے پہلا قول: ”ما رأیت أعلم من الشعبي“ امام کھول شامی سے مروی ہے، جب کہ دوسرا قول: ”ما رأیت أفقہ من الشعبي“ ابو حصین اور ابو مجلہ بیان کرتے ہیں۔ امام عامر بن شراحیل شعی نے ۱۰۳ھ کو وفات پائی۔ (طبقات خلیفۃ بن خیاط: ۱۵۷، طبقات ابن سعد: ۶/۲۵۵)

③ تذکرۃ الحفاظ: ۹۶/۱

④ تذکرۃ الحفاظ: ۹۷/۱، یہ قول ابوالزناد سے مروی ہے۔

⑤ تذکرۃ الحفاظ: ۹۸/۱۔ یہ قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے۔

اعتراض:

”دیکھا آپ نے سوانح نویسی کا انداز، یہ سب محدثین ہم عصر تھے۔ ذہبی نے ہر ایک کو بے مثال سب سے بڑا عالم سردار قرار دے رکھا ہے۔“

جواب:

یہ ہے تنقید! آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ بڑا عالم اور سردار کے معنی ہیں بے نظیر، اور غلط فہمی کی یہی وجہ ہے۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ کہنے والا ایک شخص نہیں۔ ہر ایک شخص اپنے علم کے مطابق کہہ رہا ہے۔ نیز افضل، أعلم میں فرق ہے۔ علاوہ ازیں ”بڑا عالم“ اور ”بڑا فقیہ عالم“ ان میں بھی فرق ہے۔ اسی طرح بڑا عالم، قرآن سے بڑا واقف، ان میں بھی فرق ہے، سردار اسم تفصیل نہیں، ”أعلم“ اسم تفصیل ہے، مگر اثبات اور نفی میں فرق ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ پر الزام تراشی:

❖ رحلت حضور سے صرف تین برس پہلے حضرت ابو ہریرہؓ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے،^① لیکن روایت احادیث میں سب سے بازی لے گئے اور

① حضرت ابو ہریرہؓ ۷ھ میں غزوہ خیبر کے موقع پر نبی اکرم ﷺ کے پاس تشریف لائے تھے۔ لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے قبل ہی اپنے قبیلہ میں اسلام قبول کر چکے تھے، حضرت طفیل بن عمرو دوسی نے جب مکہ میں اسلام قبول کر لیا، تو واپس جا کر اپنے قبیلہ دوس میں دعوت اسلام میں مگن ہو گئے، جس کی بناء پر ان کی قوم نے اسلام قبول کر لیا، جن میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی شامل تھے۔ دیکھیں: المستدرک ۲۹۰/۳، (۵۱۳۱)، الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۳۵۳/۱، فتح الباری: ۱۰۲/۸

مزید برآں حضرت ابو ہریرہؓ نے چار سال سے زیادہ عرصہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں گزارا ہے۔ کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ ۷ھ صفر کے مہینہ میں غزوہ خیبر کے موقع پر تشریف لائے تھے اور حضور اکرم ﷺ نے ربیع الاول ۱۱ھ کو وفات پائی اس لحاظ سے چار سال سے زیادہ بنتا ہے۔ (فتح الباری: ۶۰۸/۶، سیر أعلام النبلا: ۵۹۰/۲) اسی طرح حضرت حمید بن عبد الرحمن الحمیریؓ

احادیث بھی ایسی کہ سارا قرآن ایک طرف اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی احادیث دوسری طرف! یہ ایک مرتبہ پڑھے بھی۔ لیکن روایت سے باز نہ آئے۔
واقعہ یوں ہے کہ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں تشریف لے گئے۔ حضور نے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ! جا اور ہر اس شخص کو جنت کی بشارت دے دے، جس نے زبان سے ”لا إله إلا الله“ کہہ دیا ہو، اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ باہر نکلے، تو سب سے پہلے حضرت عمر بن خطاب سے ملاقات ہوئی اور یہ بشارت سنائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو زور کا ایک تھپڑ رسید کیا۔ ابو ہریرہ روتے ہوئے دربار رسالت میں پہنچے، پیچھے پیچھے عمر رضی اللہ عنہ بھی پہنچ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اسے کیوں پیٹا ہے؟ کہا: کیا آپ نے صرف ”لا إله إلا الله“ کہنے پر جنت کی بشارت دی ہے؟ فرمایا: ہاں! عمر نے کہا: ازراہ نوازش ایسا نہ کیجئے، ورنہ لوگ تمام اعمال ترک کر دیں گے۔ ”فخلهم يعملون“ (آپ لوگوں کو کام کرنے دیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

◀ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے چار سال کا عرصہ صحبت نبوی میں گزارا۔ (مسند أحمد: ۱۱۱/۴، سنن أبي داود (۸۱)، سنن النسائي (۲۳۸) لیکن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ خود بیان کرتے ہیں: میں نے تین سال کا عرصہ صحبت نبوی میں گزارا۔ صحیح البخاری (۳۳۹۶)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: گویا حضرت ابو ہریرہ نے صرف اس مدت کو شمار کیا ہے، جس میں انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید ملازمت اختیار کیے رکھی، یا انھوں نے اس مدت کو شمار نہیں کیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج، عمرہ یا غزوات کے لیے سفر پر نکلتے تھے، کیونکہ سفر کے اندر ایسی شدید ملازمت باقی نہیں رہتی، جس طرح طلب حدیث میں شدت مدینہ میں قیام کے دوران ممکن ہوتی تھی۔ (فتح الباری: ۶/۶۰۸) یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس مدت کو شمار نہیں کیا، جب وہ بحرین روانہ ہوئے تھے۔ (دفاع عن أبي هريرة: ۲۶) نیز دیکھیں: الأنوار الكاشفة: ۱۴۴

فرمایا: بہت اچھا لوگوں کو کہہ دو کہ کام کریں۔“^①

(صحیح مسلم: ۲۰۵، کتاب الایمان مطبع مجتہائی)

ملاحظہ کیا کتنی دلچسپ حدیث ہے! صرف دو لفظ منہ سے نکالو اور جنت لے لو۔ نہ صوم و صلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدان جہاد میں لہو بہانے کی حاجت، نہ صدقہ زکوٰۃ کے جھیلے اور نہ جہاد اکبر و اصغر کے جھگڑے۔ دوسری دلچسپی یہ کہ حضرت فاروق بارگاہ رسالت کو حکم دیتے ہیں۔ ”فلا تفعل فخلہم یعملون“ آپ لوگوں کو ایسی احادیث نہ سنایا کیجئے۔ مطلب یہ کہ ایسی احادیث سنا کر انہیں خراب نہ کیجئے اور لوگوں کو کام کرنے دیجئے۔ یعنی مذہب کے معاملہ میں حضرت فاروق سرور کائنات کی راہنمائی فرما رہے ہیں اور لطف یہ کہ حضور اس حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتے اور فرماتے ہیں۔ ”فخلہم“ (بہت اچھا لوگوں کو کام کرنے دو۔)

بدیگر الفاظ رسول اکرم ﷺ نے اعتراف فرمایا کہ ان کی حدیث ”من قال لا الہ الا اللہ“ سے لوگ بے عمل ہو سکتے تھے۔ غور فرمائیے کہ اس حدیث نے حضور پر نور کی منزلت کو کتنا کم کر دیا کہ ان کا طفل کتب ان کو سیدھا راستہ دکھا رہا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس قسم کی احادیث تراشا کرتے تھے۔ بلکہ یہ ہے کہ یار لوگ گھڑ کر ان کا نام جڑ دیتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ خود بھی روایت میں قدرے غیر محتاط واقع ہوئے ہوں۔ (دوا سلام: ۵۶-۵۸)

① صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب الدلیل علی أن من مات علی التوحید دخل الجنة قطعاً، رقم الحدیث (۴۱) مقرر نے حدیث میں قطع و برید سے کام لیا ہے، جس کی تفصیل مولف ﷺ نے آگے ذکر کر دی ہے۔

جواب:

ا: معترض نے حدیث میں کچھ قطع و برید سے کام لیا ہے۔

ب: آنحضرت ﷺ کے متعلق کچھ غلط نہیں ہوئی ہے۔

ج: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب نہیں سمجھے۔

حدیث میں قطع و برید:

حدیث میں قطع و برید اس طرح کیا گیا ہے، کہتے ہیں: ”صرف دو لفظ منہ سے نکالو اور جنت لے لو، نہ صوم و صلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدان جہاد میں جانے کی حاجت الخ“

حالانکہ حدیث میں صرف منہ سے کہنے کا ذکر نہیں، بلکہ یہ لفظ بھی ہیں: ”مستیقناً بہا قلبہ“ اس پر دل سے یقین کرے۔ جب دل سے یقین کرے گا، تو یقین کے لوازمات کا ہونا بھی اس میں ضروری ہے۔ یعنی جو اس امر کا دل سے یقین کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تو لامحالہ غیر اللہ کی عبادت سے الگ رہے گا اور اللہ کی عبادت کرنے پر آمادہ ہوگا۔ اور جو اللہ کی عبادت پر آمادہ ہوگا، تو اس کے متعلق یہ فرض کر لینا کہ ”وہ بالکل صوم و صلوٰۃ وغیرہ سے عاری ہوگا“ آپ جیسوں کا ہی کام ہے۔

دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اپنی طرف سے ”ہر اس شخص کو جنت کی بشارت دے“ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ حدیث کا مفہوم یہ ہے، ”جو شخص تجھے اس باغ کے آگے لے اور صدق دل سے ”لا إله إلا الله“ کہتا ہو، اس کو جنت کی بشارت دو۔ غالباً یہ اشارہ انہی لوگوں کی طرف تھا، جو آنحضرت ﷺ کی ملاقات کیلئے آ رہے تھے، جن کے آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ یا آپ ﷺ کا اشارہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف ہو اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بشارت دے دی، تو

آنحضرت ﷺ کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات کو سمجھ گئے کہ آنحضرت ﷺ کی مراد یہی تھی، مگر لفظ میں چونکہ کوئی قید نہ تھی، جس سے صرف وہی لوگ سمجھ جائیں، جو آرہے تھے یا صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی مراد لئے جائیں۔ اور دل سے ”لا إله إلا الله“ پڑھنا، اگرچہ بظاہر عملی کوتاہی سے بند کرتا ہے۔ مگر سب لوگ سمجھ میں اتنے نکتہ رس نہیں ہوتے کہ بات کی تہہ تک پہنچ جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غالباً یہی سمجھا ہو گا کہ آنحضرت ﷺ کی یہ بشارت میری آزمائش کیلئے ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ بھی نکتہ رس ہیں یا نہیں۔ سو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی روش سے اپنی نکتہ رسی کا ثبوت دے دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ بھی کیا، نبی کریم ﷺ کے مقصد کو پا کر کیا۔

نبی کریم ﷺ کے متعلق غلط فہمی:

اگر آپ کا وہ مقصد نہ ہوتا، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا، تو آپ ﷺ اس کی تردید کرتے، جیسے حدیبیہ میں کی۔^① نبی کریم ﷺ کی موافقت اس بناء پر نہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے سے پہلے آپ ﷺ اس مصلحت سے واقف نہ تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو موقع شناسی کی تربیت:

اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ چونکہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے

① یعنی جب صلح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس صلح کو مسلمانوں کی ذلت و خواری سمجھا، تو نبی اکرم ﷺ نے انھیں فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور اللہ تعالیٰ مجھے کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا اور آپ ﷺ نے اس صلح کو ”فتح“ قرار دیا۔ (صحیح البخاری: أبواب الجزية والموادعة، باب اثم من عاهد ثم غدر، رقم الحديث (۳۰۱۱))

حدیث کے مبلغ تھے اور مبلغ کے لئے موقع شناسی بھی ضروری ہے۔ اس واقعہ سے ان کو موقع شناسی کا واقف بنایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو قسم کی کتابیں پڑھی ہیں۔ ایک کتاب تو سنا چکا ہوں، اگر دوسری کتاب کی حدیثیں بھی سناؤں تو میری رگ کاٹ دی جائے۔“ (بخاری) ^①

یہ موقع شناسی کا ملکہ انہیں پیدا ہو گیا اور یہ سمجھ گئے کہ سامعین ان احادیث کے متحمل نہیں ہو سکتے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظالم بادشاہوں کے متعلق نام لے کر فرمائی تھیں ^② کیونکہ خطرہ تھا کہ لوگ ان کا نام سن کر کہیں بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

حدیث کا صحیح مفہوم:

اگر بالفرض حدیث مذکور میں یہ الفاظ ”مستیقنا بها قلبہ“ نہ ہوں، صرف یہی لفظ ہوں ”من قال لا إله إلا الله“ اس کا مطلب بھی یہی ہو گا کہ جو لا إله إلا الله کا قائل یعنی معتقد ہو، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ جیسے قرآن میں ہے کہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ﴾ ^③

”جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر جمے رہے، ان پر نہ ڈر ہے، نہ غم کھائیں گے، یہ لوگ جنتی ہیں۔“

اب ظاہر ہے کہ قرآن مجید کا مقصد اس جگہ یہی ہے کہ جس نے یہ اعتقاد رکھا

① صحیح البخاری: کتاب العلم، باب حفظ العلم، رقم الحدیث (۱۲۰)، ولفظہ: ”حفظت

من رسول الله ﷺ وعائین فأما أحدهما فبشئته وأما الآخر فلو بشئته قطع هذا البلعوم“

② دیکھیں: فتح الباری: ۱/۲۱۶۔

③ الأحقاف: ۱۳

کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر جمارہا (اور اپنے اس عقیدے کا ثبوت عملی طور پر بھی پیش کیا) وہ جنت میں داخل ہوگا۔ مذکورہ حدیث میں بھی ”لا اِلهَ اِلاَ اللّٰہ“ کہنے کا یہی مطلب ہے۔!

اگر کوئی منکر قرآن یہ کہے کہ ”عجیب آیت قرآنی ہے، صرف دو لفظ ”ربنا اللّٰہ“ منہ سے نکالو اور جنت لے لو، نہ صوم و صلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدان جہاد میں لہو بہانے کی حاجت، نہ زکوٰۃ و صدقات کے جھیلے، نہ جہاد اکبر و اصغر کے جھگڑے.....“ تو کیا یہ بات آپ کے نزدیک معقولیت پر مبنی ہوگی؟ یقیناً آپ کا جواب نفی میں ہوگا۔

اسی طرح جو منکر قرآن اس آیت کو سنے، جو قرآن مجید میں دو جگہ وارد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾^①

”اللہ تعالیٰ شرک معاف نہیں کرتا، اس کے سوا جسے چاہے معاف کر دے!“

تو کہہ سکتا ہے کہ یہ عجیب قرآن ہے، جو ہر گناہ کی چھٹی دیتا ہے، زنا کرو، شراب پیو، سب برے کام، صرف شرک نہ کرو، تو کیا اس آیت قرآنی کی صحیح تفسیر ہوگی؟ غرض یہ ہے کہ ہر کلمہ کو عصبيت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے، بلکہ تحقیقی نظر سے دیکھنا چاہئے، پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ یہ اعتراض میری مسلمانی پر تو نہیں پڑتا۔ مگر جس شخص کی غرض محض تخریب ہو، اسے ان باتوں سے کیا مطلب؟!

نبی اکرم ﷺ کا اندازِ تربیت:

رسول اکرم ﷺ کبھی کبھی بطور امتحان بھی کوئی بات کہہ دیتے تھے، جس سے مقصد تعمیلِ حکم نہ ہوتا، بلکہ صحابہ کرام کی عقل و تربیت کا امتحان مقصود ہوتا۔ ایسی

صورتوں میں صحابہ کو مشورہ اور اس کی وجہ معلوم کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بسا اوقات آپ ﷺ کی رائے کے خلاف مشورہ دیتے تھے (اور اس کیلئے مشورہ دینے والے کو مطعون نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ مشورہ خلوص نیت سے دینا اور اپنی رائے کے مطابق دینا ضروری ہوتا ہے) اس قسم کے واقعات بہت ہیں، جہاں رسول اللہ ﷺ کی رائے کے خلاف لوگوں نے رائے دی۔ اور آنحضرت ﷺ نے ان کی رائے پر عمل بھی کیا، جیسے غزوہ احد میں آپ ﷺ کی رائے تھی کہ مدینہ میں رہ کر لڑنا بہتر ہے، مگر صحابہ کرام مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کے حق میں تھے اور اسی پر عمل بھی ہوا تھا۔^①

اسی طرح بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے جہاں پہلے قیام کیا، صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے اس مقام کو چھوڑ کر دوسری جگہ قیام فرمایا۔^② اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خصوصی اجازت آپ ﷺ نے مرحمت فرمائی تھی کہ اگر میری نرمی سے کوئی فائدہ اٹھائے، تو تم اس پر سختی کر لیا کرو، جب تک میں منع نہ کروں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ کی تربیت نہایت اعلیٰ اور مؤثر تھی۔

علماء پر الزام تراشی:

❖ اور فرماتے ہیں: ”ہمارے موجودہ علماء میں ایک دو بڑی خوبیاں موجود ہیں:

اول: ان کا دامن وضع احادیث کے داغ سے ملوث نہیں۔

دوم: انہیں سرور کائنات ﷺ سے گہری محبت ہے۔

① سیرۃ ابن ہشام: ۸/۴، سیرۃ ابن کثیر: ۱۹/۳، فتح الباری: ۲۴۶/۷، السیرۃ النبویۃ

الصحیحۃ: ۳۸۰/۲، فقہ السیرۃ: ۲۵۰

② المستدرک: ۴۸۲/۳، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے ”منکر“ قرار دیا ہے۔ یہ حدیث عروہ بن زبیر سے

مرسل بھی مروی ہے۔ (الإصابة: ۱۰/۲)

اور ایک دو خرابیاں بھی ہیں:

اول کہ ملکہ تنقید سے بے بہرہ ہیں، اس وجہ سے وہ صحیح و غلط میں تمیز نہیں کر سکتے۔ دوسرے وہ اسلاف کی اندھی تقلید کے مرض میں مبتلا ہیں۔ چونکہ ہمارے اسلاف کہہ بیٹھے ہیں کہ صحیح بخاری کی ہر حدیث صحیح ہے، اس لئے ہمارے علماء بخاری کی کسی حدیث کو ناقدانہ نظر سے دیکھنا یا درایت کے معیار پر پرکھنا کفر سے کم نہیں سمجھتے۔ شیخ عبدالحق دہلوی لاکھ چلائیں کہ صحاح ستہ میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے، علامہ ابن حجر ہزار کہیں کہ صحیح بخاری کی چالیس احادیث جھوٹی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: مولانا عبید اللہ سندھی کا مضمون، رسالہ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۲۶۸، ۲۷۶) اور شیخ حمید الدین فراہی پیشک کہتے پھریں کہ صحاح میں بعض احادیث ایسی ہیں، جو قرآن کا صفایا کر دیتی ہیں۔ ہم اس عقیدہ سے پناہ مانگتے ہیں کہ کلام رسول، کلام خدا کو منسوخ کر سکتا ہے (نظام القرآن) لیکن ہمارے علماء یہی کہے جائیں کہ حدیث وحی خفی ہے۔ جو شخص صحاح ستہ کے ہر شوشے پر ایمان نہیں لائے گا، وہ کافر ہے۔“ (دوامِ اسلام: ۵۹، ۶۰)

جواب:

مگر اہل قرآن نے اب موضوع احادیث کے بیان کرنے کا کام شروع کر دیا ہے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ اتنا لگاؤ نہیں رہا، جس کی بناء پر وہ آنحضرت ﷺ کے کلام کی قدر کرتے۔ اور اسلاف کے اتنے مخالف ہوئے کہ ان کی خدمت کے صلہ میں ان کو کوسنا شروع کر دیا اور درایت پر حدیثوں کو پرکھنے کیلئے میدان میں آ گئے۔

پھر تحقیق کے دعویٰ کے باوجود نہ اصل کتابیں پڑھیں، نہ قرآن کو دیکھا، جو کسی رسالہ میں کپ شب دیکھی، اسی کو دستاویزات بنا کر اعتراضات شروع کر دیئے۔ نہ شیخ عبدالحق کی عبارت کو سمجھے، نہ اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا کی۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے کلام کو حجت قرار دیا اور شیخ حمید الدین فراہی کے کلام سے بے سوچے سمجھے استدلال کرنا شروع کر دیا۔

احادیث کی شرعی حیثیت:

امت میں سے کسی محدث یا مجتہد یا فقیہ کا یہ مسلک نہیں کہ صحاح کے ہر شوشہ پر ایمان لانا فرض ہے، بلکہ وہی احادیث ان کے نزدیک قائل عمل ہیں، جو صحیح غیر منسوخ ہوں اور صحاح کی بعض احادیث غیر صحیح اور بعض منسوخ ہیں۔ اور ایمان کا تعلق تو عقیدیات سے ہوتا ہے۔ ہاں دلیل کا علم کے لحاظ سے جو مرتبہ ہوگا، اس کے مطابق اس کا اعتقاد ضروری ہے۔ جو احادیث متواتر ہیں یا ان کی صحت پر اجماع ہے، ان پر ایمان لانا فرض ہے اور ان پر اعتراض کرنا کفر ہے۔ اور صحیح حدیث کو بہ نظر حقارت دیکھنا گمراہی اور بے ایمانی ہے۔

وحی خفی کا یہ مطلب ہے کہ دین کے بارہ میں جو حدیث پایہ ثبوت کو پہنچ جائے، وہ ہمارے لئے حجت ہے، اگرچہ وہ حدیث استنباطی ہو یا وحی کی شکل میں آئی ہو۔ کیونکہ اللہ کی رضا اس کے متعلق ثابت ہو چکی ہے۔ یہی معنی وحی خفی کا ہے۔ ہاں جو مشورے اپنی اپنی رائے سے دیئے ہوں اور ان کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو، اس صورت میں ہم اپنی رائے پر عمل کرنے کے مجاز ہیں۔



دوسرا باب:

تدوین حدیث

تدوین حدیث کے مراحل:

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے شریعت کے مسائل کا ہے بگاڑے مکاتیب کی صورت میں لکھائے تھے اور وہ لوگوں کے پاس محفوظ تھے۔ اور بعض صحابہ نے احادیث کو قلمبند کیا اور جو صحابہ قلمبند نہیں کرتے تھے، ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ یہی حال جمہور کا ہے، بعض احادیث لکھتے تھے، جو نہیں لکھتے تھے، ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ مگر پھر بھی وہ اخیر عمر میں کتابت کو ترجیح دینے لگے تھے۔ صفار تابعین کے زمانہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے حکم سے دفتروں کے دفتر قلمبند کئے گئے۔ اور دوسری صدی میں تدوین کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا، یعنی پہلے مجموعوں کو ایک ترتیب دیدی، اور بعض احادیث جو دماغوں میں محفوظ تھیں، ان کو بھی قلمبند کیا۔ اس میں اتنی توسیع ہوئی کہ عام دارالاسلام کے مجموعوں کو قلمبند کر لیا گیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صرف ان مجموعوں سے ایک ایسی کتاب لکھی، جو بالاتفاق تسلیم کر لی گئی۔ صرف ۱۱۰ حدیثوں پر بعض علماء نے تنقید کی، ان کے جوابات دیئے گئے، اب جو احادیث بخاری میں ہیں، چند شاذ الفاظ کے سوائے ان کی صحت قطعی تسلیم کی جاتی ہے۔

۴۔

● جامع بیان العلم ۱/۳۳۱ (۴۳۸) نیز دیکھیں: صحیح البخاری: کتاب العلم، باب کیف

یقبض العلم: ۱/۴۹

منکرین کتابت حدیث کے دلائل اور ان کی حقیقت:

اور جس حدیث میں کتابت کی مخالفت وارد ہوئی ہے، وہ اتنی صحیح نہیں، جتنی اجازت کی حدیثیں صحیح ہیں، پھر ممانعت والی حدیث کا یہ مطلب ہے کہ قرآن میں ملا کر نہ لکھو، جیسا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر اور باقی صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو بعض لکھی احادیث کے مٹانے یا جلانے کی روایات وارد ہوئی ہیں، بلحاظ سند قابل اعتبار نہیں، بلکہ انہی صحابہ رضی اللہ عنہم سے جواز کتابت کی روایات صحیح سندوں سے ثابت ہیں۔ بعض صحابہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں آپ ﷺ کی اجازت سے حدیثیں لکھا کرتے تھے، اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی وفات کے بعد حدیثیں لکھوائی تھیں یا خود لکھی تھیں۔^① اس کے پہلے دو مجموعے تھے، پھر تین، پھر پانچ۔

برق صاحب کی غلطی:

برق صاحب جابجا ”عبداللہ بن عمر“ لکھتے ہیں اور یہ ان کی غلطی ہے بلکہ ”عبداللہ بن عمرو“ ہے

اور پھر کہتے ہیں: ”ابو داود میں یہ حدیث ملتی ہے، ”عبداللہ بن عمر“ لکھا کرتے تھے^② اور مسلم کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کتابت سے منع فرمایا۔“^③

حالانکہ مطلق کتابت سے منع نہیں فرمایا۔ بلکہ قرآن میں لکھنے سے منع فرمایا اور

① جامع بیان العلم ۱/۳۲۴ (۴۲۲) نیز دیکھیں: فتح الباری: ۱/۲۰۷

② سنن أبي داود: كتاب العلم، باب في كتاب العلم، رقم الحديث (۳۶۴۶) نیز دیکھیں:

صحيح البخاري: كتاب العلم، باب كتابة العلم، رقم الحديث (۱۱۳)

③ صحيح مسلم: كتاب الزهد والرفائق، باب الثبوت في الحديث و حكم كتابة العلم، رقم

الحديث (۳۰۰۴)

عبداللہ بن عمرو کے لکھنے کا ذکر بخاری میں بھی ہے۔^①

حضرت انس رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی:

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے متعلق کہتے ہیں:

”اندازہ لگائیے کہ کیا کوئی لڑکا اٹھارہ انیس برس تک کی عمر میں کسی قسم کی کوئی ذمہ داری محسوس کرتا ہے! ممکن ہے ارشاد بالفاظہ نہ یاد رہا ہو، اور بعض دیگر کا خاکہ مکمل کر لیا ہو۔ بہر حال جو احادیث آپ سے مروی ہیں، ان کی تعداد (۱۲۸۶) ہے،^② جن میں (۱۶۸) کی صحت پر آئمہ کا اتفاق ہے اور باقی (۱۱۱۸) کو ناقابل توجہ سمجھا جاتا ہے۔ امام بخاری نے ان متفقہ روایات سے صرف (۸۳) نقل کی ہیں۔ مسلم نے (۷۱) اور باقی کو مشکوٰۃ سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔“

حقیقت حال:

یہ انداز تحقیق جس کی بناء پر علماء کو اندھے مقلد کہہ رہے ہیں، نہ ”متفق علیہ“ کا معنی سمجھا، نہ بخاری کی تعداد صحیح لکھی، نہ مسلم کی۔ ”متفق علیہ“ کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر آئمہ حدیث کا اتفاق ہے، بلکہ بخاری اور مسلم دونوں کتابوں میں جو احادیث ہیں، ان کی تعداد یہ (۱۶۸) ہے۔ اور جو صرف بخاری میں ہیں اور مسلم میں نہیں، ان کی تعداد (۸۰) ہے۔ اور جو صرف مسلم میں ہیں اور بخاری میں نہیں ان کی تعداد

① صحیح البخاری: کتاب العلم، باب کتابہ العلم، رقم الحدیث (۱۱۳)

② برق صاحب نے اپنی کتاب میں یہی تعداد لکھی ہے، جب کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث کی

تعداد دو ہزار دو سو چھیالیس (۲۲۸۶) ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی احادیث کی تعداد

تین سو اٹھارہ (۳۱۸) ہے۔

(۷۰) ہے۔ اور بخاری میں جو انس کی حدیثیں ہیں، ان کی تعداد (۲۷۰) ہے۔ اور جو دونوں کتابوں میں مشترک ہیں، ان کی تعداد (۱۲۸) ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی احادیث صحیح ہیں۔

”متفق علیہ“ کا معنی:

”متفق علیہ“ ان احادیث کو کہتے ہیں، جو بخاری اور مسلم دونوں میں ہوں، کیونکہ ان کی صحت پر امت کا اتفاق ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کے علاوہ باقی احادیث صحیح نہیں یا ان کی صحت پر اتفاق نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بعض احادیث پر اعتراض:

پھر اس کے بعد دوسری تنقید پڑھے اور ناقد کی قدر کیجئے کہ کیسے کیسے بے سوچے سمجھے نکتے بیان فرما رہے ہیں، کہتے ہیں:

”اتنی کانٹ چھانٹ کے بعد بھی آپ کی بعض احادیث بدستور محل نظر ہیں۔ مثلاً عثمان بن مالک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضور ﷺ سے التماس کی کہ وہ میرے گھر میں آ کر نماز پڑھیں۔ آپ ﷺ نے یہ التجا قبول فرما لی۔ آپ ﷺ کے ہمراہ چند صحابہ بھی تشریف لائے، صحابہ نے منافقین کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ کہنے لگے، کتنا اچھا ہو، اگر حضور مالک بن دشمن کی ہلاکت کی دعا کریں، حضور ﷺ نے فرمایا: وہ کلمہ نہیں پڑھتا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: زبان سے تو پڑھتا ہے، لیکن اس کا دل بے ایمان ہے۔ فرمایا: جو شخص کلمہ پڑھتا ہے، وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث عجیب معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے اپنے بیٹے کو کہا کہ

لکھ لے اور اس نے لکھ لی۔“^① (صحیح مسلم کتاب الایمان)
 اگر ابنِ دشمن واقعی منافق تھا اور اتنے صحابہ کی شہادت غلط سمجھنے کی کوئی وجہ
 نظر نہیں آتی اور خود حضور ﷺ نے بھی اس کی تردید نہیں فرمائی، تو پھر اس
 کی مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ منافقین کے متعلق صریح
 ارشاد ہے:

﴿وإن تستغفرلهم سبعین مرة فلن یغفر الله لهم﴾ (التوبة: ۸۰)
 ”اے رسول! اگر تو ان منافقین کیلئے ستر مرتبہ بھی مغفرت طلب کرے، پھر
 بھی ہم ان کی بدکاریوں کو معاف نہیں کریں گے۔“

جواب:

حدیث میں یہ لفظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو لا إله إلا الله کہے اور
 اس کا مقصد رضائے الہی ہو، تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔^② جب آپ ﷺ نے یہ
 فرمایا، تو صحابہ نے شہادت تسلیم کی اور اپنی شہادت کی وجہ یہ بیان کی کہ وہ منافقین کی
 خیر خواہی کرتا ہے۔ صحابہ کے پاس اس کے منافق ہونے کی یہی شہادت تھی اور اس کی
 توجیہ ظاہر ہے کہ بعض آدمی مومن ہوتے ہیں، مگر رشتہ کی وجہ سے بعض منافقوں کے
 ساتھ ان کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کی بناء پر وہ چاہتے ہیں کہ ان کا
 خاتمہ ٹھیک ہو جائے اور اس لئے وہ ان کی خیر خواہی کرتے ہیں۔ پس آنحضرت ﷺ

● صحیح مسلم: کتاب الایمان : باب اللیل علی أن من مات علی التوحید دخل الجنة
 قطعاً، رقم الحدیث (۳۳)

● دیکھیں: صحیح البخاری: أبواب المساجد فی البیوت، رقم الحدیث (۴۱۵)، و کتاب
 الأطعمة، باب الخزیرة، رقم الحدیث (۵۰۸۶)

کی شہادت کی بناء پر ان کو اپنی بات واپس لینا پڑی۔ اور اگر یہ لفظ جو میں نے ذکر کئے ہیں، نہ ہوں، تب بھی اس کی مراد وہی ہے، جو میں نے بیان کی ہے اور قرآن مجید سے اس کی شہادت ذکر کی ہے۔ قرآن مجید نے منافقوں کے اس قول کی تردید کی ہے، جو وہ کہتے تھے:

﴿نشهد إنك لرسول الله﴾

فرمایا:

﴿والله يعلم إنك لرسوله والله يشهد إن المنافقين لكاذبون﴾^①

یعنی ”اللہ جانتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کی شہادت یہ ہے کہ منافق (اپنے اس قول میں کہ ہم دل سے اقرار کرتے ہیں) جھوٹے ہیں۔“

شق صدر والی حدیث:

پھر کہتے ہیں: ایک اور حدیث ملاحظہ ہو:

”انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول کریم بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ آپ کے پاس جبرائیل آیا، آپ کو پکڑا، زمین پر گرایا، سینہ چیر کر دل نکالا، پھر دل کو چیرا اور ایک ٹکڑے کے متعلق کہا کہ یہ شیطان والا حصہ ہے، اس حصہ کو سونے کے ٹشت میں آب زمزم سے دھویا، پھر دوسرے ٹکڑے کے ساتھ جوڑ کر دوبارہ سینہ میں رکھ دیا اور اس زخم کا نشان تادم آخریں باقی رہا۔“^② (صحیح مسلم: ۳۲۳)

① المنافقون ۱

② صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب الإسماء، رقم الحدیث (۱۶۲)

یہ حدیث کئی طرح سے مشکوک ہے:

☆ **اول:** جب بچپن میں حضور بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، تو حضرت انس کہاں تھے؟

☆ **دوم:** دل کے دو حصے ہیں: دایاں حصہ خون کو پھینک دینے میں بھیجتا ہے، جو وہاں سے صاف ہو کر دل کے بائیں حصے میں داخل ہوتا ہے۔ پھر جسم میں چلا جاتا ہے۔ دل ایک پمپ ہے، جو ہاتھ اور پاؤں کی طرح لذت و الم کا احساس نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہ خیر و شر کا محرک ہے۔ تمام افکار و جذبات، خیالات، تصورات کا مرکز دماغ ہے۔ خیر و شر کی تحریک بھی یہیں پیدا ہوتی ہے اور ارادے یہیں بندھتے ہیں۔ اگر جبریل کا مقصد منع شر کو مٹانا تھا، تو دماغ کو چیرتا، نہ دل کو۔ اس میں کلام نہیں کہ بیچارے صوفیاء شعراء دل ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جذبات کا مرکز دل ہے، لیکن غلط فہمی سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ دماغ کو مجازاً دل کہہ دیں۔ بہر حال آپ دماغ کو دماغ کہیں یا دل، حقیقت یہی ہے کہ خیر و شر کی تمام تحریکات دماغ سے ابھرتی ہیں اور دماغ کا مسکن کھوپڑی ہے نہ کہ سینہ۔ چونکہ اس کا واضع دل ہی کو سمجھتا تھا، اس لئے اس نے یہ حدیث گھڑتے وقت قطعاً نہ سوچا کہ جب علم ترقی کر جائے گا، تو اس وقت لوگ اس حدیث کو پڑھ کر خدا، رسول، جبرائیل کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ یہی کہ خاتم بدہن ہر سہ دل و دماغ کی ساخت اور ان کے اعمال سے نا آشنا تھے۔

☆ **سوم:** گناہ کی دنیا حسین بھی ہے اور لذیذ بھی۔ انسان اسی صورت میں کامل بن سکتا ہے کہ وہ گناہ کی تمام تر رغیبات کو جھٹک کر نیکی کی اجاڑ راہوں پر بڑھتا چلا جائے۔ ایک حسین نوجوان کا تیز نگاہ سے بچ جانا، اس کا کمال ہے، لیکن اگر

کوئی پیر صد سالہ یہ کہے میں عورتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا، نگاہ کی توہین سمجھتا ہوں، تو لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے۔ اس لئے ہمیں اس رسول پر ناز ہے، جو بشر ہوتے ہوئے بھی ہر ترغیب، ہر کشش اور ہر گناہ سے دامن بچا کر نکل گیا تھا۔ نہ اس رسول پر جسے آپریشن کر کے خطا کاری کی استعداد ہی سے محروم کر دیا گیا تھا۔

☆ **چہارم:** اگر اللہ کی منشا یہی تھی کہ ہر نبی معصوم ہو، تو وہ ماں کے پیٹ میں ان کے دماغ کی ویسی ساخت بنا سکتا تھا کہ گناہ کا ارادہ بھی پیدا نہ ہو سکتا اور بعد میں جبرائیل سے آپریشن (اور وہ بھی غلط مقام پر) کرانے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

☆ **پنجم:** یہ زحرم کے پانی سے دھونے کی بھی خوب کہی۔ اگر کوئی شخص بجلی کی تاروں کو پانی سے دھونا شروع کر دے اور کہے میں ان تاروں سے بجلی ختم کر کے رہوں گا، تو اس کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ دل یا دماغ میں نیکی یا گناہ کا صرف ارادہ پیدا ہوگا۔ اگر ہم دماغ سے بھیجا نکال کر اسے پانی سے دھونا شروع کر دیں اور کہیں کہ آج ارادوں کا تمام مواد ختم کر کے ہی دم لیں گے، تو ہر شخص ہمیں دیوانہ سمجھے گا۔“ (دوا سلام: ۷۵، ۷۶، ۷۷)

جواب:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عام روایات کو غیر معتبر قرار دینے کیلئے آپ نے اس روایت کا انتخاب کیا ہے۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ انس رضی اللہ عنہ عینی شاہد نہیں اور یہ اعتراض نہایت ہی کمزور ہے، کیونکہ انس رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ عینی شاہد کی بناء پر ذکر نہیں کیا، بلکہ اس واقعہ کو جیسے سنا، بیان کر دیا۔ ایسی روایات کو ”مراسیل صحابہ“ کہتے

ہیں اور محدثین ان کو ”صحیح“ سمجھتے ہیں^① کیونکہ یہاں جو واسطہ محذوف ہے، وہ معتبر ہے، کیونکہ وہ واسطہ یا تو حضور ﷺ خود ہیں، یا کوئی صحابی ہے۔^②

افکار و جذبات کا محل:

دوسرا اعتراض محاورات اور حقیقت سے غفلت پر مبنی ہے۔ معترض نے یہ سمجھا ہے کہ اس واقعہ میں دل کو محل افکار و جذبات وغیرہ تصور کیا گیا ہے اور یہ نفس الامر کے خلاف ہے۔ یہ اعتراض محاورات سے غفلت پر مبنی ہے۔ عرف میں چونکہ محل ارادہ دل کو ہی خیال کیا جاتا ہے، اگرچہ واقعہ میں اس کے خلاف ہو، مگر کلام عرف پر ہی کی جائے گی۔ یعنی یہی کہا جائے گا، میرا دل کرتا ہے، میرا جی چاہتا ہے، میرے دل میں تیری محبت ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ میرا دماغ چاہتا ہے، میرے دماغ میں تیری محبت ہے۔ قرآن مجید نے بھی جذبات کی نسبت دل ہی کی طرف کی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾^③

① الکفایۃ: ۳۸۵، مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۱، توضیح الافکار: ۱/۲۹۵

② حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: خدا کی قسم! جو احادیث ہم تم سے بیان کرتے ہیں، وہ ساری احادیث ہم نے رسول اللہ ﷺ سے نہیں سنی ہوتی، لیکن ہم ایک دوسرے کو احادیث سناتے وقت جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے۔ (المعجم الکبیر: ۱/۲۴۶) وقال الهیثمی: ”رجالہ رجال الصصحیح“ مجمع الزوائد: ۱/۳۸۳، المستدرک: ۳/۶۶۵ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث بیان کی، تو ان سے ایک آدمی نے پوچھا: کیا آپ نے خود یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! مجھے یہ حدیث ایسے شخص نے بیان کی ہے، جو جھوٹ نہیں بولتا، خدا کی قسم! ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے، بلکہ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ جھوٹ ہوتی کیا چیز ہے؟! (مفتاح الجنة للسیوطی: ۷۷)

③ الحج: ۴۶

”آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ دل اندھے ہوتے ہیں، جو سینوں میں ہیں۔“

﴿فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ﴾^①

”اللہ نے ان کے دلی افکار و جذبات کو جانا۔“

اسی طرح فرمایا:

﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ﴾^②

”اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔“

اور بھی بہت سی آیات ایسی ہیں، جن میں دل کا محل افکار ہونا بتایا گیا ہے۔ پھر سینے کا بھی ذکر ہے۔ اصل میں یہ محاورات جب مستعمل ہو جاتے ہیں، پھر متکلم کی کلام ان کے تابع ہوتی ہیں۔

شق صدر کی حقیقت:

رہی بات آپریشن کی کہ آپریشن بے محل ہوا، اس کا جواب تو اتنا ہی کافی ہے کہ جب عرف میں دل اور سینہ ہی محل افکار ہے، تو شق اور شرح کی نسبت بھی سینے کی طرف ہونی چاہئے۔ قرآن مجید میں جا بجا شرح کی نسبت سینے ہی کی طرف کی گئی ہے:

﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾^③

”کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھولا؟“

یہاں بھی دماغ کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

① الفتح: ۱۸

② البقرة: ۷

③ الإنشراح: ۱

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی کہا تھا:

﴿رب اشرح لي صدري﴾^①

”اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے۔“

یہ نہیں کہا کہ میرا دماغ کھولا جائے۔

اسی طرح ایک جگہ فرمایا:

﴿أفمن شرح الله صدره﴾^②

”کیا پس جس کا اللہ سینہ کھول دے۔“

یہ نہیں کہا کہ جس کا اللہ دماغ کھول دے۔ پھر پاک کرنے کی نسبت بھی دل ہی کی طرف کی گئی:

﴿أولئك الذين لم يرد الله أن يطهر قلوبهم﴾^③

”اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ ان کے دل پاک کرے۔“

﴿كتب في قلوبهم الإيمان﴾^④

”ان کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا۔“

﴿ولما يدخل الإيمان في قلوبكم﴾^⑤

”ابھی تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں!“

غالباً اتنی بات تو سمجھ میں آگئی ہوگی کہ عرف کے مطابق ہی بات کی جاتی ہے،

① طہ: ۲۵

② الزمر: ۲۲

③ المائدة: ۴۱

④ المجادلة: ۲۲

⑤ الحجرات: ۱۴

حقیقت کی طرف بول چال اور محاورہ میں التفات نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں یہ آپریشن کا معاملہ عالم شہادت کا نہیں، بلکہ عالم مثال کا ہے، جو نفس الامر ہونے کے باوجود کشف اور خواب کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اصل مقصد اس سے معنوی شرح صدر ہے، جس کا قرآن نے بار بار ذکر کیا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ پر یہ جو واقعہ گذرا، یہ ایک نفس الامری مثالی واقعہ ہے اور مثالی واقعات میں عرف اور اعتقاد کا لحاظ ہوتا ہے، کیونکہ اس سے مقصود صاحب واقعہ نہیں، تاثیر پیدا کرنا ہوتا ہے اور ایک قسم کی تنبیہ کرنی مقصود ہوتی ہے۔ جیسے کسی شخص کو خواب میں یہ محسوس ہو کہ میرا سینہ چیرا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو معنوی وسعت صدر حاصل ہوگی، خواہ یہ وسعت صدر بعض ظاہری اسباب کی بناء پر ہو۔ اسی طرح اس واقعہ کی حقیقت صرف یہ ہے کہ بچپن میں جیسے اور بچوں کے دل میں کھیل کود کی الفت ہوتی ہے، آپ ﷺ میں نہیں رہے گی۔

تیسرا اعتراض بھی لغو ہے، کیونکہ یہ واقعہ آپ ﷺ کے اخلاق کی ایک تصویر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ کی فطرت سے جذبات کو نکال دیا گیا تھا، جیسا کہ معترض نے سمجھا ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ کے جذبات پر آپ ﷺ کی عقل اور آپ ﷺ کا ایمان غالب ہوگا۔

چوتھا اعتراض بھی اسی قسم کا ہے، کیونکہ اس کی بنیاد اس امر پر ہے کہ شاید آپ ﷺ سے جذبات کو نکالا گیا ہے۔ یہ غلط ہے، بلکہ اس واقعہ میں یہ اشارہ ہے کہ آپ ضبط نفس کا ملکہ رکھتے ہیں۔

پانچواں اعتراض بھی اسی قسم کا ہے، کیونکہ اس کی بنیاد بھی اس بات پر ہے کہ یہ واقعہ عالم شہادت کا ہے۔ حالانکہ واقعہ مثالی نفس الامری ہے اور پانی کی طرف نسبت

اسی طرح ہے، جیسے کوئی خواب میں اپنا دل دھلتا ہوا دیکھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ واقعی اس کا دل عالم شہادت میں دھویا گیا ہے، بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس کا دل صاف ہو گیا۔
یہ خواب تو آپ لوگوں کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

شق صدر کا صحیح مفہوم:

اب سنئے کہ اس واقعہ کو ظاہر پر محمول کرنے سے بھی کوئی خرابی لازم نہیں آتی، کیونکہ یہاں آپریشن کرنے والے جبرائیل علیہ السلام ہیں، کوئی ابن آدم نہیں۔ وہ اس چیز سے واقف ہیں کہ کس مقام کی اصلاح سے جذبات پر اثر پڑیگا۔ قرآن مجید نے بھی جبرائیل علیہ السلام کے نازل کرنے کے ذکر میں دل کا ہی بیان فرمایا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

﴿فَإِنَّا نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾^①

”جبرائیل علیہ السلام نے اس (قرآن) کو آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے۔“

لو! اب اللہ بھی اس امر میں شریک ہو گئے کہ دل ہی محل نزول ہے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ دماغ منبع ہے۔ مظہر نہیں، تو پھر بھی اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ دل کی اصلاح کو دماغی اصلاح میں دخل ہو۔ بعض اعضاء ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا بہ ظاہر ایک دوسرے سے تعلق نہیں ہوتا، مگر تجربہ سے ان کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً مویشی کے تھن اگر پک جائیں، تو ان کے سینک پر مالش کرنے سے آرام آ جاتا ہے۔ جب مویشیوں کو اچھارہ ہوتا ہے، تو ان کا کان

چیرا جاتا ہے۔ اسی طرح مراق کے مرض میں، جس کا تعلق جگر اور پیٹ کے پردے سے ہوتا ہے، مگر دماغ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ مالی خولیا میں جس کا تعلق دماغ سے ہے، دل کا بھی علاج کیا جاتا ہے۔

طبی نقطہ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دل ایک پمپ ہے، جو خون صاف کرتا ہے، جس قدر یہ آلہ قوی ہوگا اسی قدر خون کی صفائی میں مدد ملے گی اور خون کی صفائی کا اثر دماغ پر بھی پڑتا ہے۔ بلکہ تمام بدن کے اجزاء ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ طبیب نبض دیکھ کر، جس کا تعلق براہ راست صرف دل سے ہے، تمام اعضاء کی کیفیت اس سے معلوم کر لیتے ہیں۔ چوتز پریکٹک لگانے سے دماغ ٹھیک ہو جاتا ہے اور باسلیق کے فصد سے خاص اعضاء متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسلیم کے فصد سے طحال پر اثر پڑتا ہے۔ پس دل کے آپریشن سے دماغ پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ اور مرکزی حصہ جو حرکات پر کنٹرول رکھتا ہے، وہ بھی دل کے پیچھے وسط میں واقع ہے۔

اور پانی اگرچہ فی نفسہ دل کی اندرونی صفائی کیلئے کافی معلوم نہیں ہوتا۔ مگر جو لوگ اس جہان کی چیزوں سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ استعمال کرنے والے کی لیاقت کے ساتھ ایک ادنیٰ چیز بھی اعلیٰ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ استعداد اسی وقت ہے، جب تک کہ اپنے مشاہدہ یا علم میں نہیں ہیں۔ پھر آج کل کے حکماء کی تحقیق کو انتہائی تحقیق خیال کرنا، کہاں کی دانشمندی ہے؟

آج کل کی تحقیق کی بنیاد تجربہ پر ہے اور تجربہ سے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حس، خیال، حافظہ اور واہمہ کا مظہر دماغ ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ دل کو بھی ان قوی کے منشا ہونے میں دخل ہے؟ اب تک اس کی نفی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی۔

احادیث کی تعداد کے متعلق غلط فہمی:

اس کے بعد (صفحہ: ۷۸) پر لکھتے ہیں:

ابن حنبل نے چالیس ہزار احادیث جمع کیں، ان کے راویوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ ان احادیث کو روایت و درایت کے معیار پر پرکھنے کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ امام بخاری پہلے متحقق ہیں، جنہوں نے ۶ لاکھ احادیث (امام بخاری تک صرف چھ لاکھ پچہنچ تھیں، ورنہ یحییٰ بن معین کو ۱۳ لاکھ احادیث کا علم تھا) میں سے صحیح احادیث کا انتخاب کرنے کے لئے انتہائی کوشش کی۔ بعض اوقات ایک ایک حدیث کیلئے کئی کئی استخارے کئے۔ یعنی جو کچھ انسانی طاقت میں تھا، انہوں نے کیا۔ لیکن جن احادیث کو مشتبہ سمجھ کر فاروق و صدیق رضی اللہ عنہما جلا رہے تھے، وہ اڑھائی سو برس بعد کیسے صحیح بن سکتی تھیں۔“

جواب:

یہ جو کچھ ذکر کیا ہے، جھوٹ کا پلندہ ہے۔ امام احمد بن حنبل نے جو روایات لکھی تھیں، ان کو ان کی صحت و سقم کا حال معلوم تھا۔ اسی لئے فرماتے ہیں: میں نے اس کتاب کو بطور معیار لکھا ہے۔^① ان کے مجموعہ کی یہ اصح حدیثیں تھیں اور ان کا مجموعہ بھی لاکھوں سے متجاوز تھا۔ باقی رہی یہ بات کہ ”یحییٰ بن معین کے نزدیک ۱۳ لاکھ احادیث تھیں اور بخاری کو صرف چھ لاکھ معلوم ہوئیں۔“ اس کا رد پہلے ہو چکا ہے اور صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے

① خصائص مسند أحمد لأبي موسى المديني: ۱۳

احادیث جلانے کی بھی تردید ہو چکی ہے۔

وضع احادیث کا فتنہ:

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ:

”احادیث وضع کرنے والے بہت ہوئے اور ہزاروں احادیث وضع کی گئیں“

جواب:

مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ اگر واضعین اپنی جگہ احادیث کو وضع کرتے تھے، تو ان کے مقابل محدثین کا ایسا گروہ بھی موجود رہا ہے، جو کسی واضع کی دال نہیں گلنے دیتے تھے۔ کیونکہ معروفین اساتذہ کے شاگردوں کی احادیث مرویہ کی گنتی منضبط ہو چکی تھی۔ اسی واسطے دارقطنی نے اپنے زمانہ میں بغداد میں اعلان کیا تھا کہ کوئی شخص ذخیرہ حدیث میں وضعی حدیث داخل نہیں کر سکتا۔^①

کیونکہ وضعی حدیث بنانے والے کیلئے ضروری ہے کہ اس کی سند بنائے اور جب سند بیان کرے گا، تو اس کا کذب ظاہر ہو جائیگا۔

حفاظتِ حدیث کے اسباب:

- ① حدیث چونکہ ایک دینی بات تھی
- ② نیز آنحضرت ﷺ کے وقت سے لیکر اصحاب کتب تک اکثر تحریریں منضبط ہو چکی تھیں۔
- ③ خلفاء اس کی سرپرستی کرتے تھے۔
- ④ اسلامی حکومت کے دفعات میں اس سے مدد لی جاتی تھی۔

① الموضوعات لابن الجوزي: ٤٥/١، فتح المغیث: ٢٦٠/١، اللآلی المصنوعة: ٤٧٢/٢،

تنزیہ الشریعة: ١٦/١

⑤ محدثین کا حافظہ انتہائی درجہ کا تھا۔

⑥ ایک ایک حدیث پر مکمل بحث ہوتی تھی۔

ان وجوہ اور دیگر وجوہ کی بناء پر وضع کرنے والا دین میں ان کو داخل نہیں کر سکا۔ جن احادیث کو امت نے بالاتفاق ”صحیح“ کہا ہے۔ ان میں سے بعض میں بعض کلمات شاذہ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد باقی سب مضامین قطعی ہیں۔ ان کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف اسی طرح ہے، جیسے قرآن کی آنحضرت ﷺ کی طرف۔

قرآن وحدیث دونوں محفوظ ہیں:

امت میں بعض لوگ ایسے گذرے ہیں، جو قرآن کو بھی محرف مانتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ کچھ حصہ قرآن کا ضائع ہو گیا اور آپ نے لکھ مارا ہے کہ عراق کا قرآن مجاز کے قرآن سے الگ ہو گیا تھا۔ مگر باوجود اس کے صحیح بات یہی ہے کہ قرآن میں تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ آج مدارس میں ہزاروں بچے قرآن پڑھتے ہیں اور بہت سے غلطیاں کرتے ہیں اور بہت سے واعظ بہت سے مسائل قرآن کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ قرآن میں نہیں ہوتے۔ ان واعظوں اور غلط قرآن پڑھنے والوں کی تعداد ہزاروں لاکھوں سے متجاوز ہے، مگر پھر بھی قرآن جوں کا توں ہے۔ اسی طرح جو حدیث بالاتفاق محدثین صحیح ہو، اس کے متعلق محض اس بناء پر کہ واضعین بہت ہوئے ہیں اور انہوں نے بہت سی احادیث وضع کی ہیں، یہ خیال نہیں کر سکتے کہ یہ بھی وضعی ہوگی۔

احادیث کی شرعی حیثیت:

صحاح کی ہر حدیث کے متعلق ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے۔ صرف انہی احادیث کے متعلق کہہ سکتے ہیں جن کی صحت پر امت کا اجماع

ہے، جیسے بخاری و مسلم کی غیر تنقید شدہ روایات یا ان کے علاوہ متواتر اور اجماعی الصحت روایات۔ ان کے علاوہ باقی احادیث جن کی صحت پر اتفاق نہیں، بلکہ اختلاف ہے، ان کو قواعد قرآن کے مطابق جن کا محدثین نے ذکر کیا ہے، پرکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔

جن کی صحت کا ہمیں علم ہو، ان پر عمل کرنا فرض ہے، بلکہ قرآن کا یہی حال

ہے۔

قرآن اور تواتر:

قرآن اصل میں اگرچہ متواتر ہے، مگر قرآن کی سب آیات سب کے علم میں تواتر سے نہیں آئیں۔ قرآن کے بہت سے مسائل جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے، ان کے ہاں وہ مسائل متواتر نہیں، اگر کوئی صاحب علم جس پر ان کو اعتماد ہو، قرآن کے وہ مسائل سنائے، تو لامحالہ ان پر عمل کرنا فرض ہوگا۔ اگرچہ وہ مسائل خبر واحد کے حکم میں ہیں۔ ضروری نہیں قرآن کے احکام پر اس وقت عمل کیا جائے، جب ان احکام کو بیان کرنے والے حد تواتر کو پہنچ جائیں۔ خبر واحد کا دروازہ بند کرنے سے سلسلہ تبلیغ بالکل بند ہو جاتا ہے۔ پس اس صورت میں لازم ہو جاتا ہے کہ ایک ایک آدمی کے پاس قرآن کا ہر مسئلہ بیان کرنے کیلئے اتنے مبلغ پہنچیں کہ متواتر کی تعریف ان پر صادق آئے۔

صرف یہ کہہ دینا کہ یہ قرآن کا مسئلہ ہے اور قرآن کی فلاں سورت فلاں رکوع میں ہے، ایک شخص کیلئے متواتر نہیں بنا دیتا۔ اس طرح تو جو بات آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کی جائے اور آنحضرت ﷺ چونکہ معصوم تھے، اسلئے وہ بات یقینی ہو جانی چاہئے۔

محدثین کی مساعی جلیلہ کی ناقدری:

آگے لکھا ہے کہ فلاں کی حدیث جھوٹی ہیں، فلاں کی جھوٹی ہیں۔
مگر یہ بھی جاننا چاہئے کہ آپ کو یہ بات کس نے بتائی کہ فلاں حدیث جھوٹی
ہے، ظاہر ہے بتانے والے محدثین ہی ہیں، پس محدثین کی قدر کرو اور ان کے مجموعوں
کو بہ نظر عزت دیکھو۔

تیسرا باب

چند عجیب راوی و صحابہ

تیسرے باب میں ”چند عجیب راوی و صحابہ“ کا ذکر کیا ہے۔
 راوی وہی جن کو محدثین نے کذاب کہا ہے، چاہئے تو یہ تھا کہ محدثین کی مدح
 اور حدیث کی حفاظت میں ان کا ذکر کرتے۔ مگر افسوس ہے کہ مصنف نے حدیث اور
 محدثین کی توہین میں ان کا ذکر کیا ہے۔

موضوع احادیث کا تذکرہ:

① ایک حدیث بیان کی ہے، جو کسی دشمنِ اسلام نے غسلِ جنابت کی فضیلت میں
 گھڑی ہے۔^①

② اس کے بعد ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ ایک واعظ نے امام احمد اور یحییٰ بن معین
 کے واسطے سے ایک جعلی حدیث بیان کی۔ جب ان دونوں اماموں نے واعظ
 سے اس حدیث کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا، تو اس نے کہا: ”اس وقت سترہ
 احمد بن حنبل اور سترہ یحییٰ بن معین ہیں، تم کیا ہو!“^②

① حدیث یہ ہے کہ ”جو شخص مباشرت کے بعد غسلِ جنابت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بہشت میں اس کے لیے
 سفید موتیوں کے ایک سو محل تیار کر دیتا ہے اور پانی کے جتنے قطرے اس کے جسم سے ٹپکتے ہیں، ہر قطرے
 پر اسے ایک ہزار شہید کا اجر ملتا ہے۔“ یہ حدیث: ”موضوع“ ہے۔ (کشف الخفا ۲۳۸۷)،
 الموضوعات: ۳۱۷ (۴۶۰) الفوائد المجموعۃ: ۹، تذکرۃ الموضوعات: ۳۲)

② الضعفاء لابن حبان: ۷۵/۱، الموضوعات لابن الجوزی: ۴۶/۱، یہ قصہ بھی ”سخت ضعیف“
 ہے۔ اس کی سند میں ”ابراہیم بن عبد الواحد الطبری“ مجہول ہے، حافظ ذہبی نے اس قصہ کو
 ”منکر“ قرار دیا ہے۔ اور فرماتے ہیں: ”ڈر ہے کہ یہ قصہ اس (ابراہیم) کا وضع کردہ نہ ہو۔ (اللسان
 المیزان: ۷۹/۱، الکشف الحثیث: ۳۹)

❖ قیس بن تمیم گیلانی چھٹی صدی ہجری کے راوی تھے۔ آپ کی پیشانی پر ایک داغ تھا، جس کے متعلق آپ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خچر نے آپ کی پیشانی پر لات رسید کی تھی۔^❶

توجیہ: مطلب یہ کہ آپ سوا پانچ سو برس پہلے موجود تھے۔

❖ اسحاق بن ابراہیم طوسی کہتا ہے کہ میں ہندوستان گیا۔ وہاں قنوج میں ہندوستان کے بادشاہ سربانک سے ملا، اس وقت اس کی عمر سات سو ستر برس تھی۔ (الخ)^❷

❖ ابوسعید مظفر کہتا ہے کہ میں بادشاہ ہزار سربانک سے ملا اور اس نے مجھے بتایا کہ میں تین مرتبہ آنحضرت ﷺ سے ملا تھا، دو دفعہ مکہ میں اور ایک مرتبہ مدینہ میں، اس کی عمر ۸۹۴ برس تھی۔^❸ (تذکرۃ الموضوعات: ۱۰۷)

❖ علامہ ابن عسقلانی "لسان المیزان" میں مندرجہ ذیل داستان نقل فرماتے ہیں:
"۳۵۳ھ میں عبدالکریم بن نصر کسی جنگل میں شکار کے لئے گئے اور

❶ الإصابة: ۵۵۶/۵، لسان المیزان: ۴۷۶/۴، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے "من بابۃ رتن" اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "من نمط رتن الہندی" کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ یہ ان کذاب لوگوں میں سے ہے، جنہوں نے کئی صدیاں بعد میں آ کر صحبت نبوی کا دعویٰ کیا تھا اور جھوٹی روایات لوگوں کو سناتے رہے۔

❷ أسد الغابۃ: ۴۲۲/۱، الإصابة: ۲۷۹/۳، لسان المیزان: ۱۰/۳، تذکرۃ الموضوعات: ۱۰۲، حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ واضح جھوٹ ہے۔" علامہ جثی نے بھی اس کو ایسے لوگوں میں ذکر کیا ہے، جنہوں نے کذاب صحبت نبوی کا دعویٰ کیا تھا۔ جب تمام علماء اس واقعہ کو جھوٹ اور غلط قرار دے رہے ہیں، تو اس کو بنیاد بنا کر اعتراض کرنا کہاں کی عظمت دی ہے؟

❸ معترض نے یہ واقعہ "تذکرۃ الموضوعات" سے نقل کیا ہے جس کے مؤلف نے خود اس کو جھوٹ قرار دیا ہے۔

پھرتے پھراتے ایک جنگل میں جا پہنچے، جس کے تمام باشندے اپنے آپ کو جیبر بن حرب کی اولاد بتلاتے تھے اور لطف یہ کہ جیبر بدستور زندہ تھا اور کہتا تھا کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ جنگ خندق میں شامل تھا۔“^①

④ ابن حجر فرماتے ہیں کہ میں ایک شخص ابو عبد اللہ محمد صقلی کو ملا، اس نے مجھے بتایا کہ میرے استاد کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مصافحہ کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور یہ کہ اس کی عمر ۴۰۰ برس سے کچھ زیادہ تھی۔“^② (تذکرۃ الموضوعات: ۱۷)

تعجب ہے کہ شاگرد صاحب ابن حجر کو یہ واقعہ سنانے کیلئے نویں صدی ہجری تک جیتے رہے۔

⑤ علامہ ذہبی ”میزان“ میں لکھتے ہیں کہ بابارتن ہندی کی وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی تھی۔^① لیکن محدثین کی ایک خاص تعداد ان کو صحابی سمجھ کر اس سے احادیث بیان کرتی تھی۔ جب علامہ ذہبی نے بابارتن کی روایات کو جھوٹا قرار دیا، تو قاموس کے مصنف علامہ مجد الدین فیروز آبادی (وفات ۸۱۴ھ) کو اس قدر

① لسان المیزان: ۹۷/۲، تذکرۃ الموضوعات: ۱۰۲، علامہ طاہر پٹی نے اپنی کتاب میں بایں عنوان ایک باب قائم کیا ہے: ”باب فیمن ادعی الصحبة کذبا من المعمرین“ پھر اس باب کے تحت ایسے تمام جھوٹے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، جنہوں نے کئی صدیاں بعد میں آ کر صحبت نبوی کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ جزاء اللہ خیر! اب انہی کذاب لوگوں کو لے کر برقی صاحب محدثین پر اعتراض کر رہے ہیں، جن کو برہنہ پہلے محدثین کرام رحمہم اللہ کذاب و دجال قرار دے چکے ہیں۔

② لسان المیزان: ۶۸/۶، تذکرۃ الموضوعات: ۱۰۷، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اس سے ملا، بلکہ فرماتے ہیں: مغرب میں ایک ایسا آدمی گزرا ہے، جو کہتا ہے میں نے اپنے استاد سے مصافحہ کیا تھا، جس نے نبی اکرم ﷺ سے مصافحہ کیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں: ”کوئی بھی عقلمند آدمی ایسے واقعہ سے خوش نہیں ہو سکتا۔“ جب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ خود ہی اسے کم عقلی کی بات کہہ رہے ہیں، تو پھر اعتراض چہ معنی دار!

③ میزان الاعتدال: ۴۵/۲، لسان المیزان: ۴۵۱/۲

صدمہ پہنچا کہ انہوں نے علامہ ذہبی سے تمام تعلقات توڑ لئے۔ بابارتین تین سو احادیث کے راوی ہیں۔

❶ ایک اور حدیث نماز باجماعت کی فضیلت میں بیان کی ہے۔

❷ ایک اور حدیث اس مضمون کی بیان کی ہے، جو غنی کی غنا کی وجہ سے عزت کرتا ہے، فقیر کی فقر کی بناء پر توہین کرتا ہے، اللہ کی لعنت میں ہمیشہ رہتا ہے۔

❸ جو آل محمد سے بغض کرتا ہو امراء، وہ کافر مرا۔^①

پھر کہتے ہیں، بابارتین کی احادیث بیشک جھوٹی ہیں، مگر مضمون اچھا ہے۔

امام ذہبی کا خیال ہے کہ بابارتین کی تمام روایات موسیٰ بن مہلی نے وضع کی ہیں۔

پھر خود ہی لکھتے ہیں: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ أبو الطفیل عامر بن واثلة آخری صحابی تھا، جس کی وفات ۱۰۲ھ میں مکہ مکرمہ میں ہوئی۔^②

❶ امام ذہبی رحمہ اللہ نے ”رتن ہندی دجال“ کے رد میں مستقل رسالہ لکھا تھا، مذکورہ بالا تینوں حدیثیں اسی ”رتن ہندی“ کی روایت کردہ ہیں، جنہیں حافظ ذہبی نے موضوع قرار دیا ہے۔ (لسان المیزان: ۴۵۰/۲، تذکرۃ الموضوعات: ۱۰۳)

❷ الإصابة: ۷/۲۳۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں ہمیں عشاء کی نماز پڑھائی اور فرمایا: آج کی رات میں جو لوگ زندہ ہیں، ایک سو سال کے بعد ان میں سے کوئی زندہ نہیں رہے گا۔ (صحیح البخاری: کتاب العلم، باب السمر فی العلم، رقم الحدیث (۱۱۶)، صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب قوله صلی اللہ علیہ وسلم لا تأتي مائة سنة و علی الأرض نفس، رقم الحدیث (۲۵۳۷) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان افراد قیس بن قیس، سربا تک، جبیر بن حرب، أبو عبد اللہ معمر، رتن جندی کے متعلق درازی عمر کے جو اقوال گزرے ہیں، وہ اس حدیث کے صریح مخالف ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات ہیں۔

جواب:

اس باب میں جو کچھ بھی ذکر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت حدیث کا کتنا بڑا انتظام کیا کہ جب کسی نے جھوٹ کہا، اس کے جھوٹ کو ظاہر کرنے کیلئے محدثین کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ اور جن محدثین نے یہ داستانیں اور موضوعات لکھی ہیں، صحیح سمجھ کر نہیں لکھیں، بلکہ بطور معرفت لکھی ہیں۔ بعض وقت محدثین بعض واقعات کو جن کا جھوٹ عیاں ہوتا ہے، قلمبند کرتے ہیں اور اس کی سند بھی ساتھ لکھ دیتے ہیں، تاکہ ضرورت کے وقت ان کی اسانید سے ان کا جعلی ہونا ثابت کیا جائے، استدلال کے لئے نہیں لکھتے۔ انہی اسانید کی بناء پر جو ان واقعات کے ساتھ لکھی جاتی ہیں، محدثین ان پر وضع اور جعل کا حکم لگاتے ہیں اور بعض غلط فہمی میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اور اگر کوئی محدث کسی جعل ساز سے کسی وقت متاثر بھی ہوا ہے، تو اس سے فن حدیث کا متاثر ہونا لازم نہیں آتا، خصوصاً وہ محدثین جن کا زمانہ باقاعدہ تدوین حدیث کے بعد کا ہے۔

چوتھا باب

ائمہ حدیث اور راویوں کے متعلق

چوتھے باب میں وہ باتیں بیان کی ہیں، جو علماء نے ایک دوسرے کے بارہ میں کہی ہیں۔

ان اقوال کے اسباب:

ان باتوں کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:
بعض وقت ایک عالم دوسرے عالم کو اپنے سے کم علم پا کر اس کے علم کی نفی کرتا ہے، اس سے حقیقت مراد نہیں ہوتی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول:

جیسے مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:
”انس اور ابوسعید کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا علم نہیں، وہ دونوں چھوٹے بچے تھے۔“^① (مختصر جامع: ۱۹۷)
یعنی جتنا ہمیں علم ہے، اتنا ان کو علم نہیں تھا، یا جتنا اور کبار صحابہ کو علم ہے، اتنا ان کو علم نہیں۔

اور کبھی کبھی ایک عالم دوسرے عالم پر اس لئے طعن کرتا ہے کہ اس نے کوئی

① جامع بیان العلم: ۱۱۰۰/۲ (۲۱۴۶)، تاریخ دمشق: ۳۹۴/۲۰، اس کی سند میں علی بن الہیثم ”مقبول“ ہے۔ (تقریب التہذیب: ۴۰۶) لہذا اس کی سند ”ضعیف“ ہے۔

مسئلہ غلط کہا ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول:

جیسے ذکر ہے کہ جب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث (کہ وتر حتمی چیز نہیں) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے آگے ذکر ہوئی، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابو ہریرہ نے غلطی کی ہے، اور اس کیلئے ”کذب“ کے الفاظ استعمال کئے۔^① کذب عربی زبان میں کبھی غلطی کو کہتے ہیں اور یہاں یہی مراد ہے، یہ کوئی طعن نہیں۔ (جامع: ۱۹۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دوسرا قول:

اور یہی مطلب مندرجہ ذیل واقعہ میں مائی صاحبہ کا ہے، جب ان کے آگے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث پڑھی گئی:

”صلوة اللیل مثنیٰ مثنیٰ وإذا خشیت الصبح فواحدة“^②
 ”رات کی نماز دو دو رکعت ہے اور جب صبح قریب آجائے، تو ایک رکعت وتر کرو۔“

تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

”کذب ابن عمر“ (جامع: ۱۹۷)

”ابن عمر نے غلطی کی ہے۔“^③

① جامع بیان العلم: ۱۱۰/۲ (۲۱۴۸) اس کی سند میں حبیب بن ابی ثابت کا ”عنہ“ ہے اور وہ

”کنز الإرسال والتدلیس“ میں۔ (تقریب التہذیب: ۱۵۰، جامع التحصیل: ۱۵۸)

② السنن الکبریٰ للنسائی: ۱/۱۷۰، (۴۳۸) نیز دیکھیں: صحیح البخاری (۴۶۰)، صحیح

مسلم (۷۴۹)

③ یہ واقعہ مجھے ”جامع بیان العلم“ میں نہیں مل سکا۔ واللہ اعلم!

یہاں بھی ”کذب“ کے معنی غلطی کرنے کے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا تیسرا قول:

اسی طرح جب ان کے آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث کہ:

”إِنَّ الْمَيِّتَ يَعْذِبُ بِكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ“

”میت کو اس پر رونے سے سزا ملتی ہے۔“

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے بیان کی گئی، تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

اللہ عمر رضی اللہ عنہ پر رحم کرے! کیا اس نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾^①

”کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔“^②

اس میں بھی مائی صاحبہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کرنے میں تغلیط کی ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔ مگر قرآن اور اس حدیث میں موافقت اس طرح ہو سکتی ہے کہ حدیث سے مراد وہ صورت لی جائے، جب مرنے والا اپنا فرض نہی عن المنکر نہ ادا کرتا ہو، یا نوحہ کی وصیت کر جائے۔ اس صورت میں اس گناہ میں اس کی شرکت ہوگی۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يَضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾^③

① الأنعام: ۱۶۵

② جامع بیان العلم: ۱۱۰۲/۲ (۲۱۴۹)، نیز دیکھیں: صحیح البخاری: کتاب الجنائز، باب

قول النبی ﷺ يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه، رقم الحديث (۱۲۲۶)، صحیح مسلم:

کتاب الجنائز، باب الميت يعذب ببكاء أهله عليه، رقم الحديث (۹۲۹)

③ النحل: ۲۵

”ان لوگوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے، جن کو گمراہ کرتے ہیں۔“

کیونکہ قرآن مجید کا حکم ہے:

﴿قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾^①

”اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔“

یعنی ان کو برے کام سے روکو، اگر نہ روکے گا، تو فرض میں کوتاہی کی بناء پر قاتل سزا ٹھہرے گا۔^②

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا چوتھا قول:

اسی طرح جب مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث بیان کی گئی:

”اطلع النبي صلى الله عليه وسلم على أهل القليب فقال هل وجدتم ما وعد ربكم حقاً فقليل له أتدعوا أمواتاً فقال ما أنتم بأسمع منهم ولكن لا يجيبون“

”مقتولین بدر کی لاشیں جو ایک گڑھے میں ڈالی گئی تھیں، ان کو خطاب کر کے فرمایا: کیا تم نے اللہ کے وعدے کو صحیح پایا؟ کسی نے کہا: کیا آپ مردوں کو پکار رہے ہیں؟ فرمایا: تم ان سے زیادہ نہیں سنتے، مگر وہ جواب نہیں دیتے!“

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا، بلکہ یہ فرمایا تھا:

① التحريم: ٦

② دیکھیں: صحيح البخاري: كتاب الجنائز، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه إذا كان النوح من سنته..... قبل الحديث (١٢٢٦)

”إنهم ليعلمون الآن أن ما كنت أقول حق“
 ”وہ اب جانتے ہیں کہ جو میں نے انہیں کہا تھا، حق ہے۔“
 اور پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی:

﴿إِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتَى﴾ [النحل: ۸۰]

”تم مردوں کو نہیں سنا تے۔“ (صحیح بخاری) ①

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مطلب یہ تھا کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کے ضبط میں غلطی کی ہے۔ اصل یہ تھا کہ ”وہ جانتے ہیں“ اس نے کہا ”سنتے ہیں۔“ کیونکہ ”سننے“ کا لفظ قرآن کے خلاف ہے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ”سننے“ کا لفظ بھی قرآن کے خلاف نہیں، صرف خاص و عام کا فرق ہوگا، عام اور خاص میں تناقص نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں بہت سے احکام بعض جگہ عام الفاظ سے ادا کئے گئے ہیں اور دوسری جگہ ان کی تخصیص موجود ہے۔ جیسے بیوہ کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے۔ ② اور حاملہ کی عدت، خواہ بیوہ ہی ہو، وضع حمل ہے۔ ③

اسی طرح سورۃ بقرۃ میں مطلقہ کی عدت تین حیض ہے۔ ④ مگر سورۃ احزاب میں جس مطلقہ کے ساتھ خاوند کا تعلق مرد و عورت والا نہ ہو، اس پر کوئی عدت نہیں۔ ⑤

① مولف رحمہ اللہ نے دو روایات کے الفاظ کو جمع کر کے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ دیکھیں: صحیح البخاری: کتاب الجنائز، باب ما جاء في عذاب القبر، رقم الحديث (۱۳۰۴)، و کتاب المغازی: باب قتل أبي جهل، رقم الحديث (۳۷۶۰)

② البقرة: ۲۳۴

③ الطلاق: ۴

④ البقرة: ۲۲۸

⑤ الأحزاب: ۴۹

اس قسم کی بہت سی آیات قرآن مجید میں ہیں۔

اسی طرح قرآن کی آیت عام، مگر حدیث اہل قلب کے ساتھ خاص ہے کہ اللہ نے ان کو سنا دیا، جیسے قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔ (بخاری) ^①

عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قول:

عروہ بن زبیر سے کسی نے کہا کہ بقول ابن عباس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد تیرہ برس مکہ میں رہے تھے۔ وہ بولے ”کذب“ یعنی غلط کہا۔ ^② ”کذب“ اس قول کو بھی کہتے ہیں، جو واقعہ کے خلاف ہو، ہر جگہ اس کے معنی ”جھوٹ“ کرنا مناسب نہیں۔

اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ابن عباس نے ایک شاعر سے یہ بات لی ہے۔ محققین نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بات کو ہی صحیح قرار دیا ہے۔ عروہ تابعی ہے، صحابی نہیں۔ صحابہ کی فہرست میں اس کا ذکر مناسب نہیں، شاید ”دو اسلام“ والے عروہ کو صحابی سمجھ رہے ہیں۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا قول:

حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے کسی نے ﴿شہاد و مشہود﴾ (البروج: ۳) کی تفسیر پوچھی، جب آپ بیان کر چکے، تو کہا کہ ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے غلطی کی ہے۔ ^③

① صحیح البخاری: کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل، رقم الحدیث (۳۷۵۷)

② جامع بیان العلم: ۱۱۰۳/۲ (۲۱۵۴) نیز دیکھیں: صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب کم أقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکہ والمدینۃ، رقم الحدیث (۲۳۵۰)، (اس روایت میں ”کذب“ کی بجائے ”أخطأ غفر الله له“ کے الفاظ ہیں) المستدرک: ۶۸۳/۲ (۴۲۵۵) مصنف عبد الرزاق: ۵۹۹/۳ (۶۷۸۷) الاستیعاب: ۱۱/۱، الإصابۃ: ۴۲۲/۳۔

③ جامع بیان العلم: ۱۱۰۳/۲ (۲۱۵۷) حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کی سند ذکر نہیں کی۔

اس جگہ بھی ”کذبا“ کے معنی غلطی کرنے کے ہیں۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کے خیال میں ان کی تفسیر صحیح نہ تھی۔ اس میں کسی حدیث کی تردید نہیں، بلکہ ان کے قول کی تردید ہے اور آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی معصوم نہیں، ان کے علاوہ ہر شخص سے خطا کا صدور ممکن ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول:

”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ مغیرہ بن شعبہ، عبادہ بن صامت، ابو محمد مسعود بن اوس انصاری بدری رضی اللہ عنہ کی سب روایات جھوٹی ہیں۔“

(دو اسلام: ۹۷)

اس جگہ مصنف نے سخت غلطی کی ہے۔ ”جامع“ میں یہ لفظ نہیں، بلکہ یہ لفظ ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”کذب المغیرة“^① (جامع: ۱۸۹) یعنی مغیرہ نے غلطی کی ہے، صرف مغیرہ کا نام ہے، عبادہ اور ابو محمد کا نام نہیں۔ یہ واقعہ الگ ہے جب ابو محمد نے کہا کہ وتر واجب ہیں، تو عبادہ بن صامت نے کہا:

”کذب أبو محمد“

”ابو محمد نے وتر کو واجب کہنے میں غلطی کی ہے۔“^②

① جامع بیان العلم: ۱۱۰۴/۲ (۲۱۵۸) حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے اس قول کی سند ذکر نہیں کی، مزید برآں ”سب روایات جھوٹی ہیں“ یہ معترض کا خود ساختہ قول ہے، کتاب مذکور میں ایسے الفاظ نہیں ہیں، اسی طرح حضرت عبادہ بن صامت کا نام بھی نہیں ہے، وہ صرف اس قول کے بعد ایک دوسرے قول کے راوی ہیں، معترض نے ان کا نام بھی مذکور بالا قول میں جز دیا ہے!!

② جامع بیان العلم: ۱۲۰۴/۲ (۲۱۵۹) نیز دیکھیں: سنن أبي داود (۴۲۵)، مسند أحمد (۳۲۷۴۵) امام ابن حبان فرماتے ہیں: عبادہ بن صامت کی اپنے اس قول ”کذب“ سے مراد ”اخطا“ [یعنی غلطی کی] ہے۔ (الثقات لابن حبان: ۳۹۷/۳، نیز دیکھیں: تدریب الراوی: ۳۰۶/۱، توجیہ النظر: ۲۶۵/۱)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول:

”محمد بن جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ میں نے امیر معاویہ کو عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث سنائی، جس پر معاویہ رضی اللہ عنہ کو سخت غصہ آیا اور لوگوں کو جمع کر کے کہا:

”بلغني أن رجلاً منكم يتحدثون أحاديث ليست في كتاب الله ولا تؤثر عن رسول الله ﷺ فأولئك جهالكم فإياكم والأمانى التي تضل أهلها“ (بخاری) ^①

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ ایسی احادیث بیان کرتے ہیں جو نہ تو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں اور نہ ہی تعلیمات قرآنی کے مطابق ہیں، خبردار، تم ان جاہلوں سے بچو اور گمراہ کن آرزوؤں سے دور رہو۔“ (دو اسلام: ۹۸)

اس واقعہ میں بھی مصنف نے ”عبد اللہ بن عمر“ ہی کا نام لیا ہے، حالانکہ یہ ”عبد اللہ بن عمرو“ ہے، خیر یہ تو علمی بات ہے، ان کو اس سے کیا تعلق!

اب سنئے! عبد اللہ بن عمرو نے ایک حدیث بیان کی تھی، جس میں ایک قحطانی کی امارت کا ذکر تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ بات پہلی دفعہ سنی اور ان کو یہ حدیث یاد تھی کہ

① صحیح البخاری: کتاب المناقب، باب مناقب قریش، رقم الحديث (۳۳۰۹) اس حدیث میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ محمد بن جبیر بن مطعم کہتے ہیں: ”میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو حدیث سنائی“ بلکہ اصل الفاظ ہیں: ”أنه بلغ معاوية وهو عنده في وفد من قريش“ کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو حدیث پہنچی اور وہ (محمد بن جبیر) قریش کے ایک وفد کے ساتھ ان کے پاس موجود تھے۔ یعنی حدیث سنانے والا کوئی دوسرا شخص تھا، اسی لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے حدیث پہنچانے والے کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ (فتح الباری: ۱۳/۱۱۴) مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباری: ۱۳/۱۱۵۔

امارت قریش میں رہے گی، جب تک وہ دین کو قائم رکھیں گے۔ عبداللہ بن عمرو کی حدیث آپ نے اس حدیث کے معارض پائی، جو ان کی اپنی سنی ہوئی تھی۔ اور یہ فطری امر ہے کہ انسان اپنی سنی ہوئی بات کو زیادہ قوی سمجھتا ہے اور عبداللہ بن عمرو کی حدیث کے بیان میں ایک سیاسی نقصان بھی تھا کہ سننے والے اگر قحطانی ہوں گے، تو ان کے دل میں بھی امارت کا خیال پیدا ہونا شروع ہو جائے گا۔ قریش اور قحطان میں لڑائی شروع ہو جائے گی۔ اس مصلحت کی بناء پر بیان کرنے والے کو ناعاقبت اندیش کہا، یعنی ایک تو بات غلط کہی، دوسرا اس امر کا خیال نہ کیا کہ اس پر کیا مفسدہ مرتب ہو گا۔ مگر عبداللہ بن عمرو کی حدیث ٹھیک ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے معارض نہیں، کیونکہ قریش کی امارت مؤقت امارت ہے، ابدی امارت نہیں۔ کیونکہ اس میں یہ شرط ہے، جب تک وہ دین کو قائم رکھیں۔ جب یہ شرط نہ رہے گی، تو امارت بھی ان سے جاتی رہے گی۔ اس کے بعد قحطانی کی نوبت آسکتی ہے۔ اس واقعہ میں صرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خطا اجتہادی ہے اور نبی کے بعد کوئی معصوم نہیں، ہر ایک سے خطا ہو سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حدیث جھوٹی تھی یا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے جھوٹ بولا اور امیر معاویہ نے عبداللہ بن عمرو کا نام نہیں لیا، بلکہ ”رجالا“ کہا ہے، جس کا مطلب ہے، چند مرد، کیونکہ نام لینے میں تو بہن ہوتی ہے، تعریض سے کام لیا۔ ایسے خطابات میں جمع مفرد کی طرف خیال نہیں ہوتا۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا قول:

”جب سرہ کی یہ حدیث:

”کانت للنبي سكتتان عند قرأته في الصلوة“

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرأت نماز میں دو مرتبہ سکتہ (ٹھہرنا، وقفہ کرنا) فرمایا

کرتے تھے۔“

حضرت عمران بن حصین (وفات ۵۲ھ) نے سنی، تو کہا:
”کذب سمرۃ“ کہ ”سمرہ جھوٹا ہے۔“^①

جواب:

اس میں دو غلطیاں ہیں:

ایک یہ کہ دو سکتے سے مراد ایک سکتہ قرأت سے پہلے کا اور دوسرا قرأت کے بعد
یا فاتحہ کے بعد کا ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ ”کذب“ کا ترجمہ ”جھوٹا“ کیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ
ہے کہ ”اس نے غلطی کی ہے۔“ مگر ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ دونوں نے ابی بن کعب
کو حکم بنایا، آپ نے فیصلہ کیا کہ سمرہ کی یادداشت درست ہے۔ (بخاری)^②

آگے لکھتے ہیں کہ ”یہ تو تھے صحابہ کرام..... الخ“ (دو اسلام: ۹۸)

مگر آپ نے جو کچھ بھی ذکر کیا، ہماری تائید میں ہے کہ حدیث کو اندھا دھند
قبول نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ اس پر بہت بحث ہوتی تھی۔ جب پایہ ثبوت کو پہنچ
جائے، تو قبول کر لیا کرتے تھے۔ قرآن کے معارضہ کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔

امام مالک رحمہ اللہ کا قول:

اس کے بعد کہتے ہیں:

”اب ذرا آئیے اور دیکھئے کہ بڑے بڑے آئمہ حدیث ایک دوسرے کو کیا
سمجھتے تھے۔“

① جامع بیان العلم: ۱/۲، ۱۱۰ (۲۱۴۷)

② جزء: إلقاء الفہام البخاری: ۲۳۔ أبو ذرؤد (۷۷۷) یہ حدیث ”صحیح البخاری“ میں نہیں
ہے۔ اس حدیث کے بارے میں تفصیلی بحث کے لیے دیکھیں: إرواء الغلیل: ۲/۲۸۵ (۵۰۵)

حضرت امام مالک بن انس کے متعلق محمد بن اسحاق کہا کرتے تھے، وہ جھوٹا ہے اور امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ ابن اسحاق دجال ہے۔“^①

(جامع: ۹۸، دو اسلام: ۹۹)

جواب:

اس میں ایک جھوٹ ہے، یعنی محمد بن اسحاق اور امام مالک کی اس ترشروئی کی

① امام مالک نے ابن اسحاق پر دو وجہ سے کلام کیا ہے: (۱) امام ابن اسحاق نے کہا: میرے پاس مالک کا علم (موطا) لاؤ، میں اس کا علاج کرتا ہوں، یہ سن کر امام مالک نے فرمایا: وہ ”دجال“ ہے۔ (۲) امام محمد بن اسحاق نے امام مالک کے نسب کے متعلق کلام کیا تھا۔

مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کلام محمد بن اسحاق کے صدق و عدالت اور حدیث میں حفظ و ضبط کے متعلق نہیں تھا، بلکہ زیادہ سے زیادہ اسے معاصرانہ چشمک ہی کہا جاسکتا ہے، جس کا فن روایت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے امام ابن عبد البر فرماتے ہیں: ”جہاں تک صدق و حفظ کی بات ہے، تو محمد بن اسحاق صدوق اور حافظ ہیں، ابن شہاب نے ان کی تعریف کی ہے اور شعبہ، ثوری، ابن عیینہ اور ایک بڑی جماعت نے ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے۔ (جامع بیان العلم: ۱۱۰/۲، ۲۱۶۲)

امام مالک سے ابن اسحاق کے متعلق ”کذاب“ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ جب امام مالک سے اس کا سبب دریافت کیا گیا، تو انھوں نے کہا: میں نے ہشام بن عروہ کو کہتے ہوئے سنا ہے۔ حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں: یہ نری تقلید ہے، جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ جب ہشام بن عروہ سے اس قول کا سبب دریافت کیا گیا، تو کہنے لگے وہ (ابن اسحاق) میری بیوی سے روایت کرتا ہے، حالانکہ اس نے میری بیوی کو کبھی نہیں دیکھا!

امام علی بن مدینی اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ہشام کی بات اگر درست بھی ہو، تب بھی ابن اسحاق کو صرف اس وجہ سے ”کذاب“ نہیں کہا جائے گا، کیونکہ ممکن ہے فاطمہ (ہشام کی بیوی) نے احادیث لکھ کر ابن اسحاق کو بھیجی ہو، یا پردہ کے پیچھے سے یا پھر بیچ میں سنا ہو، (تہذیب: ۳۷/۹) اسی طرح امام احمد نے بھی ہشام بن عروہ کے قول کا یہی جواب دیا ہے۔ (جامع بیان العلم: ۱۱۰/۲، تہذیب التہذیب: ۳۶/۹)

وجہ یہ ہے کہ محمد بن اسحاق نے یہ کہا تھا: ”مالک کا علم میرے آگے پیش کرو، میں اس کا معالج ہوں“ یہ بات چیت جب امام مالک کو پہنچی، تو انہوں نے غصہ میں کہا: معالج و جال ہے۔ اور امام مالک نے ”کذاب“ کہا ہے۔ محمد بن اسحاق نے امام مالک کو ”کذاب“ نہیں کہا، اس قسم کی جذباتی بات کا اعتبار نہیں ہوتا، پھر امام مالک نے محمد بن اسحاق کے ساتھ مصالحت کی اور اس کو تحفہ بھیجا۔^①

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول:

”امام ابو حنیفہ سے کسی نے پوچھا: جابر جعفی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا: ”ہو کذاب“ (وہ بڑا جھوٹا ہے) (جامع: ۱۹۵، دو اسلام: ۹۸)

جواب:

امام ابو حنیفہ کی کلام کا یہ مطلب ہے کہ اس کی کلام حقیقت کے خلاف ہوتی ہے اور مقدمہ مسلم میں بھی جابر پر جرح موجود ہے۔^② یہ ایسی جرح نہیں جو ایک

① دیکھیں: الثقات لابن حبان: ۳۸۲/۷ (۱۰۵۳۴) جامع بیان العلم: ۱۰۹۶/۲ (۲۱۳۶)

② امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصل الفاظ یہ ہیں: ولا رأیت أحدا أكذب من جابر الجعفی“ نیز دیکھیں:

تاریخ ابن معین رواية الدوري: ۲۹۶/۳ (۱۳۹۸)، المجروحین لابن حبان: ۲۰۹/۱

الضعفاء للعقيلي: ۱۹۵/۱، الکامل فی الضعفاء: ۱۱۳/۲، امام ابو حنیفہ جابر الجعفی پر جرح

کرنے میں متقدم نہیں ہیں، بلکہ کئی دیگر محدثین جیسے زائدہ، ابن معین نے بھی اسے ”کذاب“ کہا ہے

اور کئی محدثین نے جابر پر ان الفاظ: ”متروک الحدیث، ذاهب الحدیث، ليس بثقة، اتهم

بالکذب“ کے ساتھ جرح کی ہے۔ دیکھیں: (تہذیب الکمال: ۴۷۸/۴) مزید برآں ایسی جرح

کو محدثین کی خدمت حدیث میں مخلصانہ جدوجہد کے خلاف دلیل نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ ایسی جرح تو

حفاظت حدیث کی زبردست دلیل ہے کہ انھوں نے کسی جھوٹے شخص کا بن نہیں چلنے دیا اور اس کی

کذب بیانی کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ رحمہم اللہ و تقبل منهم و حشرنا فی زمرتهم!

③ صحیح مسلم، المقدمة: ۱۲/۱

عادل، عادل پر کرتا ہے، بلکہ ایک عادل کی مجروح پر جرح ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کا قول:

”ایک دفعہ اعظم بیمار پڑ گئے، تو فضل اور امام ابوحنیفہ ان کی عیادت کو گئے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اگر میرا آنا آپ کو ناگوار نہ گذرتا، تو میں ہر روز آتا۔ اعظم نے جھٹ کہا: مجھے تو تیرا اپنے گھر میں بھی رہنا گوارا نہیں۔^①

(جامع: ۱۹۸، دو اسلام: ۹۸)

جواب:

اس کا مطلب تو صرف اتنا ہی ہے کہ اعظم کو امام ابوحنیفہ کے ساتھ کچھ اختلاف تھا۔ جیسا کہ بعض علماء کا بعض کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنی جگہ جو حق ہوتا ہے، بیان کرتے ہیں اور کبھی کبھی وہ حق کے مخالف سے نفرت بھی کرتے ہیں اور دوسرا عالم بھی ایک حد تک معذور ہوتا ہے۔ بعض وقت مخالفت کے بڑھنے سے کچھ دوسرے امور بھی مدد و معاون ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان چیزوں کو خطا سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاسکتی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول:

”اعظم کے متعلق امام ابوحنیفہ کی یہ رائے تھی کہ وہ نہ روزہ رکھتا ہے، نہ جنابت کے بعد غسل کیا کرتا ہے (یعنی ایک فاسق نجس آدمی ہے۔)

(جامع: ۱۹۹، دو اسلام: ۹۹)

جواب:

امام اعظم کا یہ مذہب تھا کہ فجر کے ظاہر ہونے کے بعد بھی کھانا کھانا جائز

① جامع بیان العلم: ۱۱۰/۲ (۲۶۶۴) نیز دیکھیں: السنة لعبد اللہ بن أحمد: ۱/۱۹۰ (۲۵۷)

ہے۔^① اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ امام اعش کے نزدیک جب تک انزال نہ ہو، جماع کرنے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔^② امام ابوحنیفہ کے نزدیک مجرد جماع سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔ اور یہ اختلاف اجتہادی تھا۔ امام ابوحنیفہ کی طعن اپنے مسلک کی بناء پر تھی، حالانکہ اجتہادی امور میں ایک دوسرے پر طعن روا نہیں، مگر امام ابوحنیفہ نے غصہ میں آ کر یہ بات کہی ہوگی۔

سعید بن مسیب، حسن بصری اور عکرمہ رضی اللہ عنہ کا قول:

”سعید بن مسیب مدنی (وفات ۱۰۵ھ) اور حسن بصری، عکرمہ (وفات

۱۰۷ھ) کو ”جھوٹا“ کہا کرتے تھے اور یہ ان کو ”کذاب“ سمجھتا تھا۔“

(جامع: ۱۹۷، ۱۹۸، دو اسلام: ۹۹)

جواب:

یہ بھی جھوٹ پر مشتمل ہے۔ سعید بن مسیب نے عکرمہ کے بارے میں صرف یہ

① امام اعش کا یہ عمل حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے مطابق تھا کہ میں نے رسول اللہ کے ساتھ

سحری کھائی، وہ دن تھا، لیکن سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ (نسائی (۲۱۵۲)، ابن ماجہ (۱۶۹۵)،

مسند أحمد: ۴/۵۰۰) اس حدیث سے مراد آخری وقت میں سحری کرنا ہے۔ (حاشیہ السندی

علی النسائی: ۴/۱۴۲، شرح سنن ابن ماجہ: ۱۲۲، طبعہ قدیمی کتب خانہ کراتشی)

واللہ اعلم

② امام سلیمان بن مهران اعش کا یہ فتویٰ اس حدیث کے مطابق تھا کہ ”إنما الماء من الماء“ صحیح

مسلم (۳۴۳) لیکن یہ حدیث منسوخ ہے۔ یا احکام کے متعلق ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت ابی بن

کعب نے اس حدیث کے منسوخ ہونے کی تصریح کی ہے۔ اس حدیث کی تاریخ دوسری مرفوع

حدیث ہے: ((إذا جلس بين شعبها الأربع ثم جهدها فقد وجب عليه الغسل)) و فی

حدیث مطر: وإن لم ينزل (صحیح مسلم: ۳۴۸) لہذا اس مقام پر امام اعش کے فتاویٰ

اجتہادی غلطی پر محمول ہیں، جس پر ان کو ایک گنہ اجر حاصل ہوگا۔ إن شاء اللہ۔ اور معترض کا اپنی طرف

سے ”فاسق و نجس“ کے الفاظ لکھنا، بدینتی اور کم ظرفی کی دلیل ہیں۔

کہا کہ وہ ابن عباس پر غلط بیانی کرتا ہے۔^① مگر حسن بصری سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے عکرمہ کو جھوٹا کہا ہو۔^②

قنادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

قنادہ (وفات ۱۱۸ھ) یحییٰ بن ابی کثیر (وفات ۱۲۹ھ) کو جھوٹا سمجھتا تھا، اور یہ اسے۔^③ (جامع: ۱۹۹، دو اسلام: ۱۰۰)

جواب:

مصنف کی یہ بات غلط ہے۔ ”جامع“ میں یہ بات نہیں ہے، نہ قنادہ نے اسے جھوٹا کہا، نہ یحییٰ بن ابی کثیر نے اسے۔

سلیمان تیمی رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

”اصمعی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلیمان (وفات ۱۳۳ھ) کے ہاں ”ابن عروبة“ کا ذکر ہوا، تو اصمعی نے کہا: ”ابن عروبة اور اس کا استاد دونوں جھوٹے ہیں۔“ (جامع: ۲۰۰، دو اسلام: ۱۰۰)

جواب:

یہ بات ہی جھوٹ ہے۔ اول تو اصمعی کا ”ابن عروبة“ کے متعلق کوئی قول

① جامع بیان العلم: ۱۱۰/۲، (۲۱۶۱)

② اس طرح معترض کے مذکور مصدر میں یہ بات کہیں نہیں کہ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سعید بن مسیب اور حسن بصری کو ”کذاب“ سمجھتے تھے!

③ جامع بیان العلم: ۱۱۰/۲، (۲۱۶۸) معترض نے عبارت ذکر کرنے میں دیانت کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ اپنے ذہن سے خود ساختہ مطلب بیان کر دیا ہے، مذکورہ بالا مصدر میں ”جھوٹا“ کے الفاظ کہیں موجود نہیں ہیں، دونوں آئمہ نے ایک دوسری کے متعلق کلام کیا ہے، لیکن اس کی سند میں ”جبر بن دینار“ کے متعلق کوئی توثیق و ترجمہ نہیں ہے۔ (الجرح والتعديل: ۵۱۴/۲)

نہیں۔ سلیمان تمی کا قول ہے۔ اس میں بھی جھوٹ کا لفظ نہیں، بلکہ یہ ذکر ہے کہ چونکہ وہ قدر کے بارہ میں کچھ باتیں کرتے تھے، اس لئے میں شہادت قبول نہیں کرتا۔^①

یحییٰ بن معین کا قول

”یحییٰ بن معین پہلا محدث ہے، جس نے راویوں کے حالات قلمبند کئے تھے۔ آپ امام شافعی کے متعلق فرماتے ہیں:

”هو ليس بثقة“^② (جامع: ۲۰۰، دو اسلام: ۱۰۰)

”آپ کی روایات قابل اعتماد نہیں۔“

جواب:

یحییٰ بن معین کی یہ بات غلط ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض آئمہ جرح نے مبہم جرحیں بھی کی ہیں، ان کے اسباب بیان نہیں کئے۔ اس واسطے ان کی ایسی جرحیں ان راویوں میں معتبر نہیں، جن کی توثیق ہوئی ہو۔ جب امام احمد نے ابن

① اصل قول اس طرح ہے کہ ”سلیمان تمی“ کے پاس سعید بن ابی عروبہ کا ذکر ہوا، تو سلیمان تمی کہنے لگے: بخدا نہ تو میں سعید کی گواہی کو جائز قرار دیتا ہوں، اور نہ ہی اس کے استاوقادہ کی گواہی کو درست سمجھتا ہوں، امام اسمعی نے کہا ہے کہ یہ کلام مسئلہ قدر کی وجہ سے ہے ”جھوٹ کا کوئی ذکر نہیں۔“ (جامع بیان العلم: ۱۱۱۰/۲) لیکن اس تفصیل سے قطع نظر اس اثر کی سند ”ضعیف جدا“ ہے۔ اس کی سند میں ”عبد اللہ بن أحمد بن زبر أبو محمد القاضي“ ضعیف ہے۔ (تاریخ بغداد: ۳۸۶/۹، تاریخ دمشق: ۲۳/۲۷، لسان المیزان: ۲۵۳/۳) اور اسی طرح: ”أحمد بن الخلیل“ کذاب ہے۔ (الحرج والتعديل: ۵۰/۲، لسان المیزان: ۱۶۷/۱، السیر: ۵۳۲/۱۱، تقریب التہذیب: ۷۹)

اور اس کی سند میں ”زہیر بن إسحاق السلولي“ بھی ضعیف ہے۔ (الضعفاء للعقيلي: ۹۱/۲)

تعجيل المنفعة: ۱/۱۳۹)

② جامع بیان العلم: ۱۱۱۴/۲

معین کو منع کیا، تو رک گئے اور بعض نے کہا ہے کہ ابن معین سے یہ قول ثابت نہیں۔^① (جامع ص ۲۰۱)

امام مالک رحمہ اللہ کے متعلق چند اقوال:-

”حضرت امام مالک پر ابراہیم بن سعد اور ابراہیم بن ابی یحییٰ نے سخت نکتہ چینی کی ہے۔ ساجی ”کتاب العلل“ میں لکھتا ہے کہ عبدالعزیز بن سلمہ، عبدالرحمن بن زید بن اسلم، ابن اسحاق، ابن ابی الزناد امام مالک کی حدیث کو اس لئے قابل اعتماد نہیں سمجھتے کہ آپ نے ثور بن زید اور سعد بن ابراہیم جیسے راویوں سے بھی احادیث روایت کی ہیں۔“

(جامع، صفحہ: ۲۰۱، دو اسلام، صفحہ: ۱۰۰)

جواب:

”جامع“ میں یہ ہے: بعض نے یہ کلام کی ہے کہ مالک نے سعد بن ابراہیم کی روایت ذکر نہیں کی۔ داؤد اور ثور بن زید سے روایت لی ہے۔ اس کتاب میں جھوٹے زاویوں کا لفظ کوئی نہیں۔ اور یہ لفظ ”قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے“۔ بھی ”جامع“ میں نہیں۔ مصنف نے جھوٹ بولا ہے۔ صرف یہ لکھا ہے، بعض امور میں امام مالک پر مواخذہ کیا ہے۔^②

حماد بن ابی سلیمان کا قول:

”امام ابوحنیفہ کے استاد حماد سے کسی نے پوچھا کہ حجاز کے محدثین عطاء و طاؤس اور مجاہد کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ تو کہا:

① جامع بیان العلم: ۱۱۱۵/۲ (۲۱۸۳)

② جامع بیان العلم: ۱۱۱۵/۲ (۲۱۸۴)

”وصیائکم أعلم منهم“ (جامع: ۱۹۶)
 کہ ”تمہارے نادان بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔“^①

جواب:

اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ کوفہ میں فقہ کا رواج تھا، جزئیات مسائل سے وہ لوگ خوب واقف تھے۔ اس لئے حماد کوفہ والوں کو خوشخبری دے رہے ہیں۔ تمہارے بچے وہ مسائل جانتے ہیں، جن کو مکہ کے بڑے بڑے عالم بھی نہیں جانتے۔ بعض جزئیات کی واقفیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ باقی علوم میں بھی کافی دسترس ہے۔ پھر یہ بات بہر حال جذباتی ہے۔

امام شععی اور نخعی کا قول:

”امام شععی کوفی کے ہاں امام ابراہیم نخعی کوفی (وفات ۹۵ھ) کا ذکر آیا، تو کہنے لگے: یہ یک چشم رات کے وقت ہر مسئلہ مجھ سے پوچھ جاتا ہے اور دن کے وقت لوگوں پر اپنی علمیت کا رعب جماتا ہے۔ نخعی کو یہ بات پہنچی، تو اس نے کہا:

”ہو کذاب“^②

کہ ”وہ جھوٹا ہے۔“ (جامع: ۱۹۶، دو اسلام: ۱۹۷)

① جامع بیان العلم: ۱۰۹۵/۲۔ مغیرہ اس قول کو حماد سے روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں: ”یہ حماد کی سرکشی ہے!“ حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں: ”مغیرہ نے درست کہا ہے!“ حالانکہ امام ابو حنیفہ جو حماد کے خصوصی شاگرد ہیں، وہ عطاء بن ابی رباح کو حماد پر ترجیح و فوقیت دیتے تھے۔

② جامع بیان العلم: ۱۱۰۰/۲۔ اس کی سند میں ”قاسم بن محمد بن ابی شیبہ“ ضعیف ہے۔ (الجرح والتعديل: ۱۲۰/۷، ضعفاء العقيلي: ۴۸۱/۳، لسان الميزان: ۴۶۵/۴، الكشف

الحديث (۲۱۱)

جواب:

یہ باتیں غصہ کی حالت کی ہیں، جرح و تعدیل میں ان کا اعتبار نہیں ہوتا، کیونکہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی معصوم نہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو باتیں کتب جرح و تعدیل میں ہیں، ان کا بھی اعتبار نہ ہو۔ کیونکہ غصہ کی حالت کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور جرح مبہم و مفسر میں فرق ہوتا ہے۔

جرح و تعدیل بھی ایک فن ہے، اس کے بھی ضوابط اور قواعد ہیں۔ عدم واقفیت کی بناء پر اس قسم کی باتوں سے انسان متاثر ہو جاتا ہے۔ یہ سب جہالت کے کرشمے ہیں۔

جابر بن یزید کا قول:

”جابر بن یزید کا قول ہے کہ میرے پاس ستر ہزار احادیث ایسی ہیں، جن کا راوی صرف ابو جعفر ہے۔“^① (دواۓ اسلام: ۱۰۱)

جواب:

یہ قول تو امام مسلم نے بصورت جرح ذکر کیا ہے کہ یہ شخص قابل اعتماد نہیں۔ ایسی باتوں سے محدثین کی خدمات پر روشنی پڑتی ہے کہ ان لوگوں نے کس طرح کذابین کو الگ کیا ہے۔

ابو جعفر ہاشمی کا قول:

”ابو جعفر ہاشمی کی یہ رائے تھی کہ عمرو بن عبید جھوٹا ہے“^② (دواۓ اسلام: ۱۰۱)

① صحیح مسلم: المقدمة: ۱۲/۱۔ جابر بن یزید الجعفی مشہور کذاب و ضعیف راوی ہے۔

② صحیح مسلم۔ المقدمة: ۱۲/۱۔ اصل الفاظ یہ ہیں کہ رقبہ کہتے ہیں: ”ابو جعفر ہاشمی مدائینی“ احادیث وضع کرتا ہے، اس کے بعد امام مسلم نے یونس بن عبید سے نقل کیا ہے کہ ←

جواب:

معلوم نہیں، اس قول سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ اگر یہ مقصد ہے کہ بعض راویوں کو محدثین نے کذاب یا جھوٹا کہا ہے، تو یہ بات کوئی نئی نہیں۔ یہی تو ان کی خدمت حدیث تھی کہ جو لوگ کذاب تھے، ان کا کذب بیان کر دیا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ بعض باتیں ان سے غصہ کی حالت میں بھی صادر ہوئیں۔ سو ایسی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ جو اس فن سے واقف ہو، اس کیلئے تمیز کوئی مشکل نہیں۔

شعبہ بن حجاج کا قول:

”عبید اللہ بن معاذ عنبری کہتے ہیں کہ میں نے شعبہ (وفات ۱۶۰ھ) کو لکھا کہ واسطہ کے قاضی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ جواب میں کہا: ”لا تکتب عنه“

”اس کی کوئی حدیث نہ لکھو۔“^① (دواۓ اسلام: ۱۰۱)

جواب:

یہ جو کچھ بھی انہوں نے لکھا، حق تحقیق ادا کیا۔ اپنے علم کا مقام پہچانا، اس کے لئے عمرو بن عبید حدیث میں جھوٹ بولتا ہے۔ ”عمرو بن عبید“ متروک الحدیث ہے اور کئی محدثین نے کہا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ (تہذیب الکمال: ۱۲۷/۲۲)

① صحیح مسلم - المقدمة: ۱/۱۲ - مذکورہ مصدر میں یہ ہے کہ ”عبید اللہ بن معاذ العنبري“ کے والد ”معاذ العنبري“ نے شعبہ کو خط لکھا۔ اور اس قاضی سے مراد ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان العبسی ہیں، جن کو کئی دیگر محدثین نے بھی ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے، لہذا ضعیف پر جرح کرنا اور لوگوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کر چنداں عیب نہیں ہے۔

قاضی ہونے کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ یہ تو ان کی صاف گوئی تھی، جو قابل ستائش ہے۔
آپ مذمت میں ذکر کر رہے ہیں!

صالح المری کا قول:

”عفان کہتے ہیں کہ میں نے صالح المری کے سامنے حماد بن سلمہ بصری (وفات ۱۶۷ھ) کی بیان کردہ احادیث پیش کیں، تو اس نے کہا کہ وہ جھوٹا ہے۔“^① (دوا سلام: ۱۰۲)

جواب:

اس میں بھی کوئی قباحت نہیں، انہوں نے جو جرح کی ہے، اپنے علم کا اظہار کیا اور حق علم ادا کیا۔

یزید بن ہارون کا قول:

”یزید بن ہارون کہتا ہے کہ زیاد بن میمون نے ایک ہی حدیث مجھے تین موقعوں پر سنائی اور ہر مرتبہ نئے راوی جڑ دیئے۔ چنانچہ میں نے قسم کھائی کہ آئندہ اس کی کوئی حدیث بیان نہیں کروں گا۔“^② (دوا سلام: ۱۰۲)

① صحیح مسلم، المقدمة: ۱۲/۱۔ اصل مصدر میں یہ ہے کہ عفان کہتے ہیں: ”میں نے حماد بن سلمہ کو صالح المری سے حدیث سنائی، تو انھوں نے کہا صالح نے جھوٹ بولا ہے“ اور صالح المری کو دیگر محدثین نے بھی ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے، لہذا حماد بن سلمہ کا قول درست ہے، جو کہ محدثین کی حق گوئی اور عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

② صحیح مسلم۔ المقدمة: ۱۲/۱۔ یہاں بھی جھوٹے کو جھوٹا کہنے والی بات ہے، کیونکہ زیاد بن میمون کو دیگر محدثین نے بھی واہی الحدیث اور متروک قرار دیا ہے۔ دیکھیں: لسان

(المیزان: ۴۹۷/۲)

جواب:

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ محدثین حدیث کے بارہ میں سخت احتیاط سے کام لیتے تھے، جو غلط بیانی کرے، اس سے حدیث نہیں لیتے تھے۔ اسی وجہ سے حدیث کی حفاظت ہوئی۔

حمزۃ الزیات کا قول:

”علی بن مسہر کوئی کہتا ہے کہ میں نے اور حمزہ نے أبان بن أبی عیاش سے قریباً ایک ہزار احادیث سنی تھیں۔ حمزہ بیان کرتا ہے، ایک رات خواب میں حضور ﷺ کے دیدار نصیب ہوئے۔ میں نے وہ تمام احادیث آنحضرت ﷺ کو سنائیں۔ حضور ﷺ نے صرف پانچ چھ احادیث کو صحیح قرار دیا اور باقی کے متعلق فرمایا: میں انہیں نہیں پہچانتا۔“^① (دوا سلام: ۱۰۲)

جواب:

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹے راویوں کا جھوٹ جسے محدثین واقعات سے ثابت کرتے تھے۔ اسی طرح کچھ غیبی اشارات سے بھی ان کی تائید ہوتی تھی۔ اور ان غیبی اشارات کے بعد اپنی جستجو کو تیز کر دیتے تھے۔

ابو اسحاق الفزاری کا قول:

”ابو اسحاق فرازی فرماتے ہیں کہ صرف مشہور اور معتبر راویوں کی احادیث بیان کرو، لیکن اسماعیل بن عیاش کہتے ہیں کہ مشہور راویوں سے بھی کوئی

① صحیح مسلم۔ المقدمة: ۱۲/۱۔ یہاں بھی علی بن مسہر اور حمزہ الزیات نے ضعیف آدمی کے متعلق ایسی بات کہی ہے، جس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں ہے۔ أبان بن أبی عیاش کو دیگر محدثین نے بھی متروک اور ضعیف قرار دیا ہے۔ دیکھیں: تہذیب الکمال (۱۹/۲)

حدیث روایت کرے تو مت مانو۔ لیکن یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اسماعیل ثقہ ہے۔“ (دو اسلام: ۱۰۲)

جواب:

آپ فن جرح و تعدیل جب کسی استاد سے پڑھیں گے، تو آپ کی حیرت کم ہو جائے گی اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ باتیں کس بناء پر کہی گئیں۔ ایک ہی راوی کے متعلق جب اہل فن کا اختلاف ہو، تو وہاں کیا کرنا چاہئے۔ ہر ایک امام اپنے علم کی بناء پر کہتا ہے۔ پھر ایک امام ایک شے کو باعث جرح خیال کرتا ہے اور دوسرا نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں ترجیح کس کو ہوگی۔ کبھی ایک ہی امام ایک شخص کے متعلق دو باتیں کہہ جاتا ہے، اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں فن کی

① صحیح مسلم۔ المقدمة: ۱/۱۲۔ اصل الفاظ یہ ہیں کہ امام ابو اسحاق الفزاری فرماتے ہیں: ”بقیہ سے وہ احادیث لکھو، جو معروف راویوں سے بیان کرتا ہے اور جو روایات غیر معروف لوگوں سے بیان کرے، وہ نہ لکھو اور اسماعیل بن عیاش چاہے معروف لوگوں سے روایت کرے یا غیر معروف لوگوں سے بیان کرے، اس سے کچھ بھی نہ لکھو۔“

اسماعیل بن عیاش شامی کے متعلق راجح موقف یہ ہے کہ جب وہ اہل شام سے روایت کریں، تو ان کی روایت صحیح ہے اور جب وہ اہل شام کے علاوہ دیگر رواۃ سے بیان کریں، تو ان کی روایت ضعیف ہوتی ہے، اور امام یحییٰ بن معین نے اسماعیل کو مطلقاً ثقہ نہیں قرار دیا۔ بلکہ ان سے مذکورہ بالا تفصیل ہی منقول ہے۔ (تہذیب الکمال ۱۷۶/۳)

اور جہاں تک ابو اسحاق الفزاری سے منقول قول کی بات ہے، تو اس کا سبب حفظ و ضبط اور صدق و عدالت میں جرح نہیں، بلکہ اس کی وجہ اور ہے، جیسا کہ ابو صالح بیان کرتے ہیں: کان الفزاری قد روی عن اسماعیل بن عیاش ثم ترکہ، و ذلك أن رجلاً جاء إلى أبي إسحاق، فقال يا أبا إسحاق! ذكرت عند اسماعیل بن عیاش، فقال اسماعیل: أیما رجل لولا أنه شبکی! (تہذیب الکمال: ۱۷۹/۳) لہذا جب ابو اسحاق کے کلام کا سبب معلوم ہو گیا، تو معلوم ہوا مذکورہ بالا تفصیل ہی راجح ہے اور ابو اسحاق کا قول مرجوح ہے۔

واقفیت کے بعد ہوتی ہیں۔

اعتراض:

”محمد بن عبدالرحمن کے متعلق امام مالک کی یہ رائے تھی کہ وہ ثقہ نہیں، لیکن ابو زرہ اسے ثقہ سمجھتے ہیں۔ یہی حال مندرجہ ذیل راویوں کا ہے۔

راوی کا نام	غیر ثقہ کہنے والا	ثقہ سمجھنے والا
شعبہ مدنی	امام مالک	احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین،
		ابن عدی ^①

ابو الحویرث	امام مالک	ابن حبان ^②
-------------	-----------	-----------------------

① شعبہ بن دینار الهاشمی کو امام احمد نے ”ما أرى به بأساً“ ابن معین نے ”لیس به بأس و هو أحب إلى من صالح مولی التوأمة“ لا یکتب حدیثہ“ عجلی نے ”جائز الحدیث“ قرار دیا ہے۔ ابن عدی نے ”لا بأس به“ جب کہ امام مالک نے ”لیس بثقة“ امام ابو حاتم ”لیس بقوی“ اور نسائی اور جوزجانی نے ”لیس بالقوی“ ابو زرہ اور ساجی نے ”ضعیف“ ابن حبان فرماتے ہیں: ”روی عن ابن عباس ما لا أصل له حتی كأنه ابن عباس آخر“ ابن سعد نے ”له أحادیث كثيرة ولا یحتج به“ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ”یتکلم فیہ مالک و یحتمل منه“ ان تمام اقوال کو مد نظر رکھتے ہوئے شعبہ بن دینار کا ”ضعیف“ ہونا ہی رائج ہے۔ کیونکہ جارجین کی تعداد زیادہ ہے اور جرح بھی مفسر ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ”صلوق سبیہ الحفظ“ حوالہ جات کے لیے دیکھیں: ”الکامل فی الضعفاء: ۲۳/۴، المعرج والتعذیل: ۳۶۷/۴، الضعفاء للنسائی: ۵۶ (۲۹۱)، أحوال الرجال: ۱۳۳ (۲۲۳)، المجروحین لابن حبان: ۳۶۱/۱ (۴۷۵) ضعف العقيلي: ۱۸۵/۲، الطبقات الکبری: ۲۹۴/۵، تهذیب الکمال: ۴۹۷/۱۲، تهذیب التهذیب: ۳۰۳/۴، تقریب التهذیب: ۲۶۶۔

② عبد الرحمن بن معاوية أبو الحویرث الأنصاري المدنی کو ابن معین نے ”ثقہ“ اور ابن حبان نے ”الثقات“ میں ذکر کیا ہے۔ جب کہ اس کو امام مالک نے ”لیس بثقة“ ابن معین نے ”لیس یحتج بحدیثہ“ نسائی نے ”لیس بثقة“ ابو حاتم نے ”لیس بقوی“ حدیثہ ولا یحتج به“ کہا ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں: ”ابو الحویرث هذا ليس له كبير حديث، مالک أعلم به لأنه ←

فرقد ایوب۔ ابن حبان یحییٰ بن معین^①
 شریح بن سعید ابن عدی، محمد بن سعد سفیان بن عیینہ، ابن حبان اور
 یحییٰ بن معین^②

جواب:

اس اختلاف کا جواب ہو چکا ہے کہ اس اختلاف میں فیصلہ کرنے کیلئے فن جرح و تعدیل کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں اس قسم کی نہیں کہ جہاں آدمی حیران ہو جائے۔ علماء محققین نے ایسے مقام پر یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ جرح اگر غصہ کی حالت کی نہ ہو اور جرح مفسر ہو، جرح میں ایسا سبب بیان کیا جائے، جو بالاتفاق جرح کا سبب ہے، تو جرح کو مقدم کیا جائے گا، کیونکہ ثقہ کہنے والے کے قول کی بنیاد عدم علم پر سمجھی جائے گی اور عالم کا قول غیر عالم پر مقدم ہوتا ہے۔ اگر جرح مفسر نہ ہو، یا ایسا سبب بیان کرے، جو بالاتفاق جرح کا سبب نہ ہو، یا غصہ کی حالت میں کہے، تو اس صورت میں ثقہ کہنے والے کا قول معتبر ہوگا، انسان کا علم محیط نہیں، کمی بیشی ضرور ہوتی ہے۔

اس باب میں مصنف نے جو کچھ بھی ذکر کیا ہے، اس کے دو حصے کئے جاسکتے ہیں:

﴿مدنی و لم یرو عنه شیئاً﴾ حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ”ضعف“ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”صدوق سنی الحفظ، رمی بالإرجاء“ یہاں بھی کثرت جرحین اور جرح مفسر ہونے کی بناء پر ضعف ہی رائج ہے۔

- ① فرقد بن یعقوب السبخی کو امام ایوب، أحمد، ابن القطان، علی بن المدینی، بخاری، یعقوب بن شیبہ، نسائی، ابو حاتم، ابن سعد، حاکم ابو أحمد، ابوزرعہ اور دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے، اسی طرح ابن معین نے بھی ایک روایت میں اسے ”لیس بذاک“ کہا ہے۔ لہذا اس کا ضعف ہی رائج ہے۔ دیکھیں: ”تہذیب الکمال: ۱۶۴/۲۳، تہذیب التہذیب: ۲۳۶/۸
- ② برق صاحب نے یہ اسماء ”فتح الملہم شرح مسلم: ۱۴۱، سے نقل کیے ہیں۔

بعض باتیں تو وہ ہیں، جو ہم عصر علماء کی ایک دوسرے پر کسی جذباتی امر کی بناء پر چوٹ ہے، سو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

اور بعض باتیں وہ ہیں جو صحیح ہیں۔ واقعی وہ آدمی جن کو علماء نے مجروح قرار دیا ہے، مجروح ہیں۔ باقی اختلافی باتوں کے متعلق میں نے کچھ لکھ دیا ہے اور باقی کے لئے فن کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔^①



① اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

پانچواں باب

حدیث پر ایک مکالمہ

اس باب میں مصنف نے ایک مکالمہ ذکر کیا ہے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مکالمہ کو تھوڑی تبدیلی کے ساتھ ذکر کروں، جس میں مصنف کی سب باتیں قریب قریب آجائیں۔

مصنف ”دو اسلام“ نے اس مکالمہ کی بنیاد اس امر پر رکھی ہے کہ ”یہ ہمارے علماء کا خیال ہے کہ حدیث وحی خفی ہے“ مگر اس مقالہ کے متعلق جو صحیح بات ہے، لکھ چکا ہوں۔ یہاں بھی بطور تمہید ذکر کر دیتا ہوں تاکہ سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

وحی کی اقسام:

حدیث قولی کا کچھ حصہ تو اسی طرح وحی ہے، جس طرح قرآن مجید یعنی بذریعہ جبرائیل آنحضرت ﷺ کی طرف پہنچا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن متلو ہے اور یہ حصہ متلو نہیں۔ ان احادیث میں سے بعض میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے۔ ان کو ”احادیث قدسیہ“ کہتے ہیں۔

اور بعض احادیث وہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ پس پردہ باتیں کہیں۔ ان میں بھی اگر اللہ تعالیٰ کا لفظ ہو، تو احادیث قدسیہ ہی کہتے ہیں، اور بعض وہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی عطا فرمائیں۔

بعض وقت آنحضرت ﷺ کو بذریعہ خواب آگاہ کیا گیا اور بعض دفعہ بذریعہ کشف کچھ حالات بتائے گئے۔ ان تمام کو وحی ہی کہتے ہیں۔

بعض احادیث وہ ہیں، جو جبرائیل نے عمل کر کے دکھائیں، جیسے پانچ نمازیں۔

یہ بھی حقیقت میں وحی ہی ہیں۔

اور بعض حدیثیں ایسی ہیں، جو آنحضرت ﷺ نے قرآن سے استنباط کر کے کہی ہیں۔ اور آپ کی عملی روایات جن کا تعلق دین سے ہے، وہ سب کی سب قرآن سے ماخوذ ہیں۔ یا دوسری صورت میں آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے واقف ٹھہرایا ہے۔

کن امور میں آنحضرت ﷺ کی اقتداء ضروری نہیں:

اور جو تقریری حدیثیں ہیں، ان کا تعلق اگر دین سے ہو، تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کو ناجائز نہیں سمجھا۔

اور بعض روایات ایسی ہیں، جن کا تعلق آپ ﷺ کی قبل از بعثت کی زندگی سے ہے۔ یا اس میں آپ ﷺ کی شکل و صورت، ولادت اور تربیت کا ذکر ہے۔ ان کو وحی یا دین نہیں کہہ سکتے، یعنی ہمارے لئے وہ چیزیں دین کی نہیں ہیں۔ یعنی ہم ان امور میں آپ کی اقتداء کرنے کے مامور نہیں۔

باقی رہیں وہ باتیں، جن کا تعلق امور دنیا سے ہے، مثلاً روٹی کھانا، پانی پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، مرد و عورت کے تعلقات اور دوسرے دنیوی امور، یہ سب ایسے ہیں کہ آپ ﷺ اپنی عادت اور طبیعت کے موافق کرتے تھے۔ مگر ان امور میں آپ ﷺ احکام الہیہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے۔

اس واسطے ان افعال سے جواز تو ثابت ہوتا ہے، اگرچہ ان کا وحی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس بناء پر آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد کے تمام افعال کو ہم بطور حجت تسلیم کرتے ہیں۔ یہ معنی ہے وحی خفی کا۔ یعنی آپ ﷺ کی تمام تر زندگی اس معنی سے معصوم تھی کہ آپ ﷺ نے جو کیا، حکم الہی کے مطابق کیا، خدا کی نافرمانی نہیں کی۔ اگر کسی وقت آپ ﷺ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوتی، جو منشاء الہی کے

مطابق نہ ہوتی، تو اللہ تعالیٰ فوری طور پر آپ ﷺ کو اس سے مطلع فرما دیتے۔

مکالمہ

قائل حدیث

حدیث، قرآن کا بیان اور اس کی عملی صورت ہے، آنحضرت ﷺ نے جو فرمایا، یا تو قرآن سے سمجھایا، یا قرآن کی تفسیر میں ارشاد فرمایا، لہذا قرآن کی طرح حدیث بھی حجت ہے۔

منکر حدیث

قرآن کی طرح حدیث کیسے ہو سکتی ہے؟ حدیث اگر آنحضرت ﷺ کی سمجھ ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ قرآن کی طرح نہیں۔ یا تفسیر ہے، تو تفسیر بھی سمجھ ہے لہذا حدیث کو قرآن کی طرح خیال نہیں کر سکتے۔

قائل حدیث

آپ نے میرا مطلب نہیں سمجھا! میں حدیث کو کل الوجوہ قرآن کی طرح نہیں سمجھتا، بلکہ حجت ہونے میں قرآن کی طرح سمجھتا ہوں۔ کچھ حصہ قطعاً بذریعہ وحی ہے اور جو بذریعہ وحی نہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف کوئی اصلاحی بات نہیں کی، اس لئے اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے متعلق ہو گئی ہے۔

منکر حدیث

اگر حدیث کا کچھ حصہ بذریعہ وحی ہے، تو باقی حصہ اگرچہ بذریعہ وحی نہیں۔ مگر وحی کی طرح ہے، تو کیا وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام نے قرآن کو لکھنے اور محفوظ رکھنے کیلئے تمام تر انسانی وسائل اختیار کئے، لیکن حدیث کو نہ صرف نظر انداز کر دیا، بلکہ حضور ﷺ نے احادیث لکھنے سے منع فرما دیا اور صدیق و فاروق

نے احادیث کو مٹانے اور جلانے کیلئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، حدیث اللہ کا پیغام ہو اور صحابہ اسے جلاتے پھریں، کیوں؟

قائل حدیث

آپ کو بعض غلط روایات کا دھوکہ ہوا ہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو اپنا رویہ یہی رکھا کہ مسائل کا قرآن اور حدیث کی رو سے فیصلہ کرتے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب جس میں زکوٰۃ کا مسئلہ مفصل لکھا ہوا تھا، اس کی ایک نقل حضرت انس رضی اللہ عنہ کو لکھوا دی۔^① اسی طرح باقی عمال کو اس کی نقلیں بھجوا دیں۔ جیسے قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں منتشر تھا، ایک جگہ کسی مصحف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں لکھوایا، اسی طرح احادیث کو متفرق طور پر لکھوایا، مگر وہ سب اجزاء منتشر تھے۔ احادیث کو جلانے اور مٹانے کی روایات سب غلط ہیں، جیسا کہ میں نے پہلے ثابت کیا ہے۔^②

منکر حدیث

اللہ تعالیٰ نے یہ دو قسم کے پیغامات کا سلسلہ کیوں شروع کیا تھا، کیا اللہ کے خزانہ میں الفاظ کی کمی تھی؟ یا کوئی خاص مصلحت اس دورنگی کی متقاضی تھی؟

قائل حدیث

قرآن مجید بمنزلہ متن کے ہے اور حدیث بمنزلہ بیان کے ہے۔ اصل اور بیان میں جو فرق ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ ان کیلئے الگ الگ طریقہ ہو۔ اگرچہ بعض

① اس خط کی تفصیل گزر چکی ہے۔ دیکھیں

② تفصیل کے لیے دیکھیں:

احادیث قرآن کی طرح من جانب اللہ ہیں، مگر پھر بھی بیان کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگرچہ حدیث کے مطلع کرنے کا طریقہ الگ الگ قرآن کی حفاظت کے ساتھ ملتا جلتا ہے، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

منکر حدیث

بات تو صاف ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول کریم کو جو کتاب بذریعہ وحی عطا فرمائی تھی، اس کا نام قرآن ہے، نہ کہ صحیح بخاری۔

﴿أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ﴾^①

”ہم نے تیری طرف اس قرآن کو وحی کیا۔“

وحی کے لفظ میں وحی کے تینوں مفہوم لازماً آجاتے ہیں، اللہ نے سارے قرآن میں کہیں نہیں کہا کہ وحی بواسطہ جبریل ہم قرآن اتار رہے ہیں اور وحی کے باقی طریقے حدیث کے نازل کرنے کیلئے استعمال کر رہے ہیں۔

قائل حدیث

ہم بھی یہ نہیں کہتے کہ قرآن کے ساتھ ایک کتاب قرآن کی طرح بمنزلہ متن کے ہے، ہم تو یہ کہتے ہیں، اصل کتاب قرآن ہی ہے، حدیث اس کا بیان اور تفسیر ہے، خواہ وہ حدیث بخاری کی کتاب میں ہو یا مسلم کی کتاب میں یا کسی دیگر کتاب میں۔ اور پہلے بیان ہو چکا ہے، بواسطہ جبریل ہی قرآن نازل ہوا ہے۔

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾^②

”اس کو روح الامین نے نازل کیا۔“

ایک جگہ فرمایا:

① یوسف: ۳

② الشعراء: ۱۹۳

﴿نبأني العليم الخبير﴾^①

”مجھے علیم وخبیر نے بتایا ہے۔“

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض حدیثیں من جانب اللہ ہیں اور جو اجتہادی ہیں، وہ بھی حکماً من جانب اللہ ہیں۔

حدیث قرآن کی طرح حجت ہے:

آیت ﴿فردوه إلى الله والرسول﴾^② (اپنے جھگڑے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول سے کراؤ) سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث قرآن کی طرح حجت ہے۔

اسی طرح یہ آیت بھی ہمارے اس دعویٰ کی موید ہے:

﴿قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني﴾^③
 ”اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو، تو میری اتباع کرو۔“

اس کے بعد فرمایا:

﴿قل أطيعوا الله والرسول فإن تولوا فإن الله لا يحب الكافرين﴾^④

”اللہ اور رسول کا حکم مانو، اور اگر پھر جائیں (تو کافر ہیں) اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔“

اس قسم کی بہت سی آیات ہیں، جن میں آنحضرت ﷺ کی اتباع اور اطاعت کا

① التحريم: ۳

② النساء: ۵۹

③ آل عمران: ۳۱

④ آل عمران: ۳۲

حکم ہے۔

یہ آیات صراحتاً دلالت کرتی ہیں کہ حدیث کو ماننا اور اس پر عمل کرنا ایمان پر موقوف ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ ”وحی کے لفظ میں وحی کے تینوں مفہوم آ جاتے ہیں“ بالکل خلاف عرف و عقل ہے۔ وحی کے مفہوم میں اگرچہ تینوں مفہوم درج ہیں، مگر ضروری نہیں کہ استعمال میں تینوں مفہوم مراد ہوں، ورنہ لازم آئے گا کہ جہاں لفظ وحی ہو، وہاں تینوں مفہوم مراد ہوں اور یہ بجاہتہً باطل ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہاں وحی سے صرف ایک ہی طریقہ مراد ہو، جیسا کہ قرآن نے خود صراحت کی ہے۔ قرآن نے جب تکلم کے تین طریقوں کو بصیغہ ”أو“ بیان کیا ہے،^① جس کا مطلب تقسیم ہے، اب ہر وحی میں ان تینوں طرق کو درج کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

منکر حدیث

قرآن سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہی بصورت وحی نازل ہوا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے:

﴿إِنَّمَا أَوْحِي إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنَ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ﴾^②

”تمہیں ڈرانے کیلئے مجھ پر قرآن نازل ہوا ہے۔“

اور آپ کہتے ہیں، حدیث بھی ساتھ اتری ہے۔ ایک اور آیت دیکھئے:

① دیکھیں: الشوری: ۵۱

② مذکورہ بالا آیت کریمہ کے درست الفاظ یہ ہیں: ﴿وَأَوْحِي إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنَ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ﴾ (الانعام: ۱۹) بعد والے ایڈیشن میں برق صاحب نے اپنی کتاب میں اس آیت کی اصلاح کر دی تھی۔

①

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا﴾

”ہم نے قرآن نازل کیا، جو عربی زبان میں ہے۔“

اور اسی طرح محفوظ ہے:

②

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾

”اس میں باطل کسی راستے داخل ہو ہی نہیں سکتا۔“

اور دوسری طرف حدیث کا باطل نے ایسا پلستر بگاڑا کہ لاکھوں آفتاب ماہتاب
لیکر ڈھونڈو، تو حقیقت کا سراغ نہ لگ سکے، إلا ماشاء اللہ!

قائل حدیث

آپ نے پہلی آیت میں لفظ ”إنما“ بڑھا دیا ہے اور قرآن میں یہ نہیں۔ اس
سے آپ کا یہ دعویٰ باطل ہو گیا کہ قرآن میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں: اگرچہ
میں نے غلطی سے اس لفظ کو بڑھایا ہے، یا عمداً کہا ہے، تاکہ میرا حصر والا دعویٰ
درست ہو جائے، مگر پھر بھی میری چوری ظاہر ہو گئی اور حقیقت کا سراغ مل گیا۔ میں کہتا
ہوں، اگر آپ بنظر غور دیکھیں گے، تو حدیث کے متعلق بھی یقین ہو جائے گا کہ
حدیث کے بارہ میں بھی اگرچہ قرآن کی طرح لوگوں نے سہو یا عمداً اضافے کئے ہیں،
مگر ان کی چوری کا پتہ بھی لگ ہی گیا۔ کیونکہ قرآن متن ہے اور حدیث اس کا بیان۔
اگر صرف متن ہی کی حفاظت ہو اور بیان کی حفاظت نہ ہو۔ اصل مقصد چونکہ مفہوم ہوتا
ہے، نہ لفظ، جب مفہوم کا مطلب کچھ سے کچھ ہو گیا، تو متن (قرآن) میں بھی باطل
راہ پا گیا۔ پس قرآن کی حفاظت تادمہ ایسی صورت میں متصور ہوتی ہے، جب اس کے
بیان کی بھی حفاظت ہو۔ سو الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس کے بیان

● یوسف: ۲

② فصلت: ۴۲

(حدیث) دونوں کی حفاظت کر کے (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) قرآن کو باطل سے بالکل محفوظ کر دیا ہے۔ آپ کے خیال میں صرف لفظوں (چھلکے) کی حفاظت ہوئی ہے، نہ مفہوم کی!

منکر حدیث

آپ نے آیت ﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾^① (اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت کرو) پڑھی، مگر پوری نہیں پڑھی۔ ﴿وَأُولِي الْأَمْرِ﴾ کو چھوڑ گئے ہیں۔ ساری آیت کا یہ مطلب ہوا کہ اللہ، رسول اور حاکم وقت (جو تم میں سے ہو) کو مانو، اگر رسول کی اطاعت کا یہی مطلب ہے کہ آپ کے تمام اقوال پر ایمان لاؤ، تو پھر حاکم وقت کے اقوال پر بھی ایمان لانا پڑے گا، کیونکہ اللہ نے اس کی اطاعت کا بھی دیے ہی حکم دیا ہے، کئی بادشاہ مصنف بھی تھے، مثلاً بابر نے ”تزک بابر“ لکھی، جہانگیر نے ”تزک جہانگیری“ اور اورنگزیب کی بھی ایک آدھ کتاب موجود ہے۔ یہ اپنے زمانے میں ”أُولِي الْأَمْرِ“ تھے، تو کیا ہم تزک بابر اور جہانگیری پر بھی ایمان لاتے پھریں؟

قائل حدیث

آپ نے بے سوچے سمجھے بات کہہ دی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت اور ”أُولِي الْأَمْرِ“ کی اطاعت میں زمین آسمان کا فرق ہے:

اطاعت رسول کا مطلق حکم:

① اللہ کے رسول کی اطاعت مطلق ہے اور اولی الامر کی اطاعت اس قید کے ساتھ مقید ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اسی واسطے

نزاع کی صورت میں صرف اللہ اور اس کے رسول کا ذکر کیا ہے، فرمایا:

﴿فردوه إلى الله والرسول﴾^①

”اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب لے آؤ۔“

② امیر کی اطاعت اس کے زمانہ کے ساتھ مختص ہے۔ رسول کی اطاعت دائمی ہے۔ مطلق اور دوام کا اگر آپ فرق کرتے، تو یہ نہ کہتے کہ ”تو کیا ہم ترکِ بابرِی اور ترکِ جہانگیری پر ایمان لاتے پھریں۔؟“ اگر ان کے احکام قرآن و سنت کے خلاف ہیں، تو ان کی اطاعت ان کے وقت بھی منع تھی، اگر خلاف نہیں، صرف وقتی باتیں تھیں، تو بعد میں ان پر ایمان لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب آپ خود کہتے ہیں کہ اقوالِ رسول پر ایمان لانا بھی ٹھیک ہے، بشرطیکہ کہیں سے کوئی قول رسول مل جائے، تو پھر اقوالِ رسول کے قابلِ ایمان ہونے نہ ہونے کی بحث فضول ہے۔ آپ کو صرف حدیث کے محفوظ ہونے پر بحث کرنی چاہئے۔

اور جو احادیث تواتر سے ثابت ہیں، جیسے اذان و اقامت، پنج وقتی نمازیں، ان کی تعداد وغیرہ، ان پر ایمان لے آئیں۔

باقی آپ کا یہ کہنا: اگر اقوالِ رسول مل جاتے، تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہوتے، بالکل بجا، اقوالِ رسول واقعی قرآن کی تشریح ہیں اور جو قرآن کو مانتا ہے، اس کیلئے لازم ہے کہ اس کی تشریح کو بھی مانے۔

منکر حدیث

رسول اس لئے ہے کہ قوانین کو نافذ کرے۔ رسول خدا جب تک بقید حیات

رہے، صرف انہی قوانین کی تعمیل کراتے تھے، جن کی تفصیل قرآن نے دی ہوئی تھی۔ رسول قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دینے کی جرات بھی کر سکتے تھے، انہیں تو بار بار کہا جا رہا تھا:

﴿بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾^۱

”اے رسول! تم وہ احکام امت تک پہنچاؤ، جو ہم تمہیں دے رہے ہیں۔“

آپ ایک چھوٹا سا نقطہ پیش نظر رکھیں کہ رسول اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں، وہ پیغمبر بھی تھے، بشر بھی، بحیثیت پیغمبر ہم ان کی اطاعت پر مامور ہیں اور بحیثیت بشر اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں مکمل آزادی دے رکھی تھی کہ ہم چاہیں تو کھانے پینے، چلنے پھرنے اور گفتگو میں حضور کی روش اختیار کریں یا حدود شریعت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی پسند، اپنے مذاق، اپنے ملک و ماحول اور اپنے رجحان سے کام لیں۔ تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں کہ بعض اوقات صحابہ نے آپ کی بشری ہدایات یا مشوروں پر عمل نہیں کیا تھا۔ مثلاً جب آپ کے غلام زید نے اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی، تو آپ نے فرمایا تھا: ﴿أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ﴾^۲ (طلاق مت دو) لیکن زید نے یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ اسی طرح جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اصرار تھا کہ انہیں قتل کر دیا جائے، لیکن حضور نہ مانے اور وحی نے عمر کی تائید کر دی۔^۳ حضور نے گیارہ نکاح کئے تھے، لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں،^۴ حضور

① المائدة: ۶۷

② الأحزاب: ۳۷

③ دیکھیں: صحیح مسلم: کتاب الجہاد والسير، رقم الحدیث (۱۷۶۳)

④ دیکھیں: الأحزاب: ۵۱

نے ایک اندھے سے بے التفاتی فرمائی تھی، جس پر سورۃ عبس نازل ہوئی اور ملک العرش نے اپنے محبوب کو ہلکی سی ڈانٹ پلا دی۔^①

اسی طرح چند اور واقعات بھی موجود ہیں، جہاں صحابہ نے حضور کے بشری رجحانات سے آزاد ہو کر اپنی راہ خود نکالی تھی اور یہی اسلام کا سب سے بڑا وصف ہے کہ قرآن کے گئے ہوئے چند سادہ سے ابدی احکام کے سوا ہم کسی اور ہنگامی یا وقتی روایات کے لئے قطعاً مامور نہیں۔“

قائل حدیث:

یہ بات ہم بھی مانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے احکام نافذ کرتے تھے اور ساتھ یہ بھی ہے کہ خود بھی اس پر عمل کرتے اور احکام کی تشریح بھی کرتے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی حکم دیں، آپ ﷺ وہی احکام بیان فرماتے تھے، جن کے بیان کرنے کے مامور تھے۔ اب نزاع صرف اس امر میں ہے کہ آپ ﷺ نے قرآن کی کیا تشریح کی اور ان پر کس طرح عمل کیا؟

آپ کا یہ خیال ہے کہ ہمارے پاس جناب کی تشریح اور عمل کی کوئی صورت موجود نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ موجود ہے۔ مطلق حدیث کا انکار کرنا، تو بدیہیات کا انکار کرنا ہے، کیونکہ بہت سی احادیث متواتر ہیں، جن کا تعلق قرآن کی تشریح اور عملی صورت کے ساتھ ہے۔“

اس کے بعد آپ نے جو ایک نکتہ بیان کیا ہے اور اس نکتہ کے بیان میں حدیث سے مدد لی ہے (حالانکہ وہ حدیثیں ثبوت کے لحاظ سے ان احادیث سے زیادہ وزنی نہیں، جو نماز کے احکام بتلاتی ہیں اور جن کا آپ انکار کرتے ہیں) اور دعوے کی

① دیکھیں: مننن الترمذی: أبواب تفسير القرآن، باب من سورة عبس، رقم الحديث (۳۳۳۱)

اس حدیث کو امام ابن حبان، حاکم اور ذہبی رحمہم اللہ نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

دلیل میں ایک ایسی صورت اختیار کی ہے، جس سے دعویٰ ہی باطل ہو جاتا ہے، مگر وہ نکتہ ایسا ہے کہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں، خاص کر حدیث کے ماننے والوں کو اس میں کس طرح اختلاف ہو سکتا ہے، جب کہ وہ نکتہ حدیثوں سے ہی ثابت ہے۔ مگر نکتہ کی تشریح میں ہمارا آپ کا اختلاف ہے۔ ہم ہر اس قول و فعل و تقریر کو بحیثیت پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، جس کا دین سے تعلق ہو۔ اور جس کا تعلق دنیا سے ہو، ان امور میں آپ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر کو بحیثیت بشر دیکھتے ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ نے کھجوروں کی تلقیح کے متعلق مشورہ دیا تھا، وہ دنیوی بات تھی۔ اس واسطے آپ ﷺ نے فرمایا:

”أنتم أعلم بأمور دنياکم“^①

اور جو نماز، روزے، حج، زکوٰۃ، عالم برزخ، عالم آخرت اور دیگر امور بیان فرمائے ہیں، وہ دینی امور ہیں۔ اس مسئلہ کی تشریح ذرا طویل ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بریرہ رضی اللہ عنہا کو مشورہ دیا تھا کہ خاوند کے پاس رہے۔^② وہ دنیوی بات تھی۔ چونکہ یہ ایک مشتبہ بات تھی۔ اس واسطے بریرہ نے پوچھ لیا کہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ جہاں بات مشورہ کی ہو ظاہر ہے، وہ دنیاوی امر ہوگا۔ اس واسطے مشیر کو آنحضرت ﷺ کے خلاف مشورہ دینے کی اجازت ہے، مگر مشورہ کے بعد جب آپ ﷺ حکم دے دیں، پھر اختیار جاتا رہتا ہے، خواہ وہ حکم بحیثیت رسول ہو یا

① صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا دون ما ذكره صلى الله عليه وسلم من معاش الدنيا على سبيل الرأي، رقم الحديث (۲۳۶۳) ولفظه ”أنتم أعلم بأمور دنياکم“

② صحیح البخاری: کتاب الطلاق، باب شفاعۃ النبی صلى الله عليه وسلم على زوج بريرة، رقم الحديث (۴۹۷۹)

بحیثیت امیر، فرق صرف یہ ہوگا کہ جو حکم بحیثیت امیر ہوگا، وہ دائمی نہیں ہوگا، اور جو بحیثیت رسول ہوگا وہ دائمی ہوگا!

دوسرا یہ فرق یہ بھی کرتے ہیں کہ جس کام میں رائے کو دخل ہو، وہ بحیثیت مجتہد یا مدیر آپ ﷺ کرتے تھے اور جس کام میں رائے کو دخل نہ ہو، وہ بحیثیت رسول کرتے تھے۔ پہلا کام دنیوی اور دوسرا کام دینی ہے۔ آپ نے مثال میں جو کھانے پینے کا ذکر کیا ہے، ان کو قائل حدیث بھی دنیوی امور خیال کرتے ہیں۔ مگر ان امور کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ امور دین میں داخل ہو جاتے ہیں اور ایک لحاظ سے دنیوی بن جاتے ہیں۔ اگر کسی دنیوی امر کے متعلق ثواب و عقاب کا ذکر ہو تو اس حیثیت سے وہ امر دینی بن جاتا ہے۔ مثلاً لباس کا پہننا، اگرچہ دنیوی امر ہے، مگر ننگا رہنا، چونکہ بے حیائی اور گناہ ہے، اس لئے یہ مسئلہ دینی بن جائے گا، کیونکہ ننگا رہنے پر عقاب کے وارد ہونے کا اندیشہ ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ آپ ﷺ نے جو اپنے آزاد کردہ زید کو یہ حکم دیا تھا کہ اپنی بیوی کو رکھ، کیا یہ حکم دینی ہے یا دنیوی؟ تو دراصل یہ ایک دینی حکم ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَأَمْسِكُوهُمْ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سِرْحَاهُنَّ بِمَعْرُوفٍ﴾^①
 ”ان کو دستور کے مطابق روک یا دستور کے ساتھ چھوڑ دو۔“

یہ حکم اگرچہ بظاہر مطلق ہے، مگر بیان کردہ آیت کی بناء پر مقید ہے۔ اگر تم دستور کے مطابق رکھ سکتے ہو، تو اس صورت میں یہی حکم ہے کہ اپنی بیوی کو رکھو، یہ دنیوی حکم نہیں، بلکہ دینی حکم مقید ہے اور جب قید نہ رہی، تو حکم بھی نہ رہا۔ یعنی زید رضی اللہ عنہ جب اس ناچاقی کی بناء پر جو دونوں کے مابین ہو گئی تھی، دستور کے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا، تو

حکم کا پابند نہ رہا۔ بلکہ اگر آپ کسی کو نماز پڑھنے کا حکم بھی دیں، تب بھی قرآنی شروط کے ساتھ وہ حکم مقید ہوگا۔ مثلاً ایک عورت کو آپ کہیں، نماز پڑھے! تو اس کا مطلب یہی ہوگا، اگر تمہاری حالت حیض کی نہیں تو نماز پڑھو۔ کیونکہ حائضہ بحکم قرآن طاہرہ نہیں اور نماز کیلئے طہارت شرط ہے:

﴿وَلَكِنْ يَرِيدُ لِيَطْهَرَكُمْ﴾^۱

کہ اللہ تعالیٰ وضو کے حکم سے جو اس نے تم کو دیا ہے، تم کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ پس زید کا طلاق دینا، اس بناء پر نہ تھا کہ یہ حکم آپ ﷺ کا قرآن کے علاوہ تھا، کیونکہ یہ حکم تو قرآن میں موجود ہے، بلکہ اس لئے تھا کہ یہ حکم حقیقت میں مقید تھا اور قید کے نہ ہونے سے اس کا لزوم جاتا رہا۔ پھر یہ کہنا کہ ہم ہنگامی اور وقتی ہدایت کے لیے قطعاً مامور نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ حاکم کی اطاعت کے مامور نہیں۔ پہلے اقرار اور اب انکار، وقتی اطاعت بلا شرط مامور نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی اطاعت بحیثیت رسول ہونے کے دائمی ہے۔

منکر حدیث

اگر ہم سلا کا مذہب قبول کر لیں، تو پھر استنجا بھی اصول دین، منڈھا ہوا سر بھی رکن اسلام، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار بھی مذہبی فرض، منڈھی ہوئی مونچھیں اور لمبی داڑھی بھی جزو دین! مسلمان کیا ہوا، ایک اچھا خاصا جوکر بن کر رہ گیا، کیا آپ ان لا یعنی قیود میں جکڑا ہوا اسلام کسی انگریز کے سامنے پیش کرنے کی جرات کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کسی نو مسلم انگریز کا سر موٹھ کر اوپر ایک موٹا سا پگڑ باندھیں، مونچھیں موٹھ ڈالیں، داڑھی ناف تک بڑھا دیں، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار پہنا دیں، پگڑ میں مسواک، ٹانگ کے ساتھ تسبیح باندھیں اور آنکھوں میں سرمہ ڈال کر اسے

انگلستان بھیج دیں، تو دو ہی نتیجے ہونگے۔ یا تو انگریز اسے جن سمجھ کر مار ڈالیں گے، یا پھر چڑیا گھر میں بند کر دیں گے۔ اسلام میں یہی تو خوبی ہے کہ وہ صرف حقائق پر نظر رکھتا ہے اور ان ظواہر و مناسک کو قابل التفات نہیں سمجھتا۔ ملا سے میرا نزاع اسی بات پر ہے کہ وہ حدیث کو آگے لا کر بے شمار ظواہر جزو اسلام بنانا چاہتا ہے اور میں قرآن کو پیش کر کے ملت کو ان ملائی قیود سے آزاد کرنا چاہتا ہوں۔

قائلِ حدیث

اب آپ نے اپنا مقصد ظاہر کیا ہے کہ حدیث کو ماننے سے یہ قیود عائد ہو جاتی ہیں، اور آزادی پسند ان قیود کو بوجھ سمجھتا ہے، بلکہ ان پر عمل کرنا، اس کیلئے موت کے مترادف ہے۔ چونکہ قرآن میں ان قیود کا ذکر نہیں، اس لئے صرف قرآن پر عمل کرنے سے آزادی حاصل ہوگی۔ نہ دانت صاف کرنے کیلئے مسواک کی ضرورت، خواہ وہ بالکل سیاہ ہی ہو جائیں، اس کے باوجود جو باتیں ذکر کی ہیں، یہ سب لوازمات سے نہیں، شلوار کے لئے صرف یہی پابندی ہے کہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو، ٹخنوں سے ایک باشت اونچا ہونا لوازمات سے نہیں۔ اسی طرح مونچھوں کا موٹنا فرض نہیں، بلکہ اتنا کٹنا کافی ہے کہ منہ میں نہ پڑیں، آج کل تو مونچھوں کا موٹنا فیشن میں داخل ہو گیا ہے، شاید آپ نے کتاب اس فیشن بننے سے پہلے لکھی ہوگی۔ اسی طرح داڑھی کا ناف تک ہونا، کوئی ضروری نہیں، صرف چار انگل تک ہونا کافی ہے۔ پگڑی ایک بہترین لباس ہے جسے بعض انگریز بھی پسند کرتے ہیں^① اور لمبی داڑھی ان کے ہاں پادریوں کا شعار ہے اور ان کی کتاب بائبل میں مذکور ہے۔

ٹانگ سے تسبیح باندھنا کس حدیث میں آیا ہے؟ ظاہری شعار بھی اس قسم کی چیزیں ہیں، جن کے ضائع ہونے سے قوموں کی ثقافت جاتی رہتی ہے اور اسلام نے

① بلکہ یہ سپاہیانہ لباس ہے۔ (مؤلف)

جو وضع مقرر کی ہے، اگر عقلی طور پر غور کیا جائے، تو وہی وضع اصول طب پر منطبق ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ حدیث سے صرف اس لئے دشمنی رکھتے ہیں کہ اس میں پابندی کافی ہے اور آپ زیادہ پابندی سے گھبراتے ہیں۔ قرآن میں تو صاف طور پر ختنے کا بھی ذکر نہیں۔ اسی طرح تولد کے وقت اذان کہنے کا بھی ذکر نہیں، نہ مرنے کے وقت کہیں جنازہ مروّجہ کا ذکر ہے۔ نہ نکاح اور زنا میں کوئی واضح فرق ہے، لہذا صرف قرآن پر عمل کرنے سے ہر طرح کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اور جو جزوی طور پر قرآن میں پابندی ہے، وہ بھی حدیث ماننے سے ہے، ورنہ حدیث کے انکار سے تو ہر قسم کی پابندی اٹھ جاتی ہے، جو چاہیں قرآن کا مطلب بیان کریں، کتنی جڑی آزادی ہے۔ حدیث کے ماننے سے انسان ہر طرح پابند ہو جاتا ہے اور حدیث کے انکار سے بالکل آزاد۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے حدیث کا انکار کیا، ورنہ اس پر کوئی دلیل پیش کرتے!

منکر حدیث

اگر احادیث میں یہ ضروری نہیں کہ الفاظ رسول کے ہوں، تو پھر آپ ہر حدیث میں یہ کیوں کہا کرتے ہیں: ”قال رسول اللہ ﷺ“ اگر ہر حدیث راوی کا قول ہے، تو پھر وہ ”قول رسول“ نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی قول راوی کا بھی ہو اور حضور کا بھی۔

قائل حدیث

آپ حدیث سے بالکل نا آشنا معلوم ہوتے ہیں، چودہ برس آپ نے کیا پڑھا اور درس میں کیا پڑھتے رہے؟ آپ نے غالباً قرآن بھی نہیں پڑھا! اب سنئے! کلام اور قول میں فرق ہے۔ کلام کی نسبت تو متکلم کی طرف ہوتی

ہے، خواہ نقل بلفظ ہو یا بالمعنی ہو، ناقل کی طرف نہیں ہوتی اور قول میں ناقل اور اصل متکلم دونوں کی طرف نسبت کرنی جائز ہے۔ جیسے قرآن میں قرآن کو ﴿قول رسول کریم﴾^۱ بھی کہا ہے، اور کلام اللہ بھی کہا ہے۔ پھر ”رسول کریم“ سے ایک جگہ جبریل مراد ہے، جیسے سورۃ التکویر میں ہے^۲ اور ایک جگہ (سورۃ حاقة) میں آنحضرت ﷺ مراد ہیں۔^۳ پس قرآن اللہ کا قول بھی ہے اور ناقل اول جبریل کا بھی ہے۔ اور ناقل ثانی آنحضرت ﷺ کا بھی ہے۔

منکر حدیث

ہمارے بعض علماء تو عشق حدیث میں یہاں تک عقل و خرد گم کر چکے ہیں کہ اللہ کے کلام کو نہ صرف احادیث کا محتاج ٹھہراتے ہیں، بلکہ یہ کہتے ہوئے بھی سنے جاتے ہیں کہ اگر اللہ کا کوئی قول رسول کے قول سے متصادم ہو جائے، تو قول خدا کو منسوخ سمجھو۔

قابل حدیث

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کلام پاک چونکہ عربی زبان میں ایک خاص ماحول میں نازل ہوئی، اس لیے اس کے سمجھنے کے لیے قواعد عربیہ اور اس کے نزول کے ماحول کی واقفیت لازمی ہے۔ پس ہم قرآن کے سمجھنے میں صرف و نحو، لغت، معانی و بیان اور حدیث رسول ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کے محتاج ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن محتاج ہے، اور حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کرتی، یہ حدیث ہی سے ثابت

۱ التکویر: ۱۹

۲ مصدر سابق

۳ الحاقة: ۴۰

ہے۔^① اگر کسی عالم نے ایسا کہا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا، اگر کوئی صحیح حدیث ظاہر قرآن کے معارض ہو، تو یہ معارضہ اسی وقت ہوگا، جب آیت منسوخ ہوگی، اگرچہ وہ آیت دوسری آیت سے منسوخ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ صرف حدیث سے ہی قرآن کی آیت منسوخ ہو جاتی ہے۔ جیسے قتال کے فرض ہونے سے پہلے عفو اور صفحہ (درگزر) کرنے کا حکم تھا:

﴿فاعفوا واصفحوا حتیٰ یأتی اللہ بأمرہ﴾^①

”یہودی ان شرارتوں کو سن دیکھ کر معاف کرو، یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قتال کے بارہ میں) آجائے۔“

اب ایسی بہت احادیث قتال والے حکم کے موافق ہیں اور اس آیت کے ظاہر کے خلاف ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، لیکن ان احادیث سے نہیں، بلکہ قرآن مجید کی دوسری آیات سے۔

حکمِ حدیث

یہ چودہ لاکھ کا طومار رسول کی طرف کس نے منسوب کیا تھا۔ یہ طریقت، رہبانیت اور جہاد اکبر کے راستے لگا کر خدائی پیغام کو کس نے مسخ کیا تھا۔ یہ مسلمانوں

① یہ مندرجہ ذیل حدیث کی طرف اشارہ ہے: ”کلامی لا ینسخ کلام اللہ“ (سنن الدارقطنی ۱/۴: ۱۴۵، الکامل فی الضعفاء: ۲/۱۸۰، العلل المتناہیہ: ۱/۱۳۲) اس کی سند میں ”جبرون بن واقد“ ہے، جس کا اس حدیث کو وضع کرنے میں ہاتھ ہے۔ لہذا یہ حدیث موضوع و منکر ہے۔ دیکھیں: الکامل: ۳/۱۸۰، میزان الاعتدال: ۱/۳۸۸، العلل المتناہیہ: ۳/۱۳۲، لسان المیزان: ۲/۹۴، الكشف الحثیث للحلی: ۱۲۱، فیض القدیر: ۵/۵۷، ضعیف الجامع

(۴۲۸۵)

② البقرة: ۱۰۹

سے تلوار چھین کر اس کی جگہ تسبیح کس نے تجویز کی تھی۔ یہ دنیا کو مردار کہہ کر مسلمانوں کو دنیا سے کس نے متنفر کیا تھا۔ یہ آفاقی کائنات کی جگہ ذلت، بکبت، فلاکت، جہالت، ادا بار اور پستی پہ قانع رہنے کا سبق کس نے دیا تھا۔ یہ دس کروڑ چینی، پانچ کروڑ روسی، دو کروڑ افریقی، آٹھ کروڑ جاپانی، دو کروڑ افغانی اور چالیس لاکھ کشمیری مسلمانوں کی موجودہ پست، غلیظ اور حیوانوں سے بدتر زندگی کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا جواب ایک ہی ہے: ملا کا خانہ ساز اسلام!

① "قال القرآن أحوج إلى السنة من السنة إلى الكتاب"

"جتنا قرآن حدیث کا محتاج ہے، اس قدر حدیث قرآن کی محتاج نہیں۔"

(جامع بیان العلم: ۲۲۴)

قابل حدیث

بحث تو صحیح حدیث کے متعلق ہو رہی ہے، آپ نے غلط بحث کرتے ہوئے بات موضوع اور ضعیف کی طرف پھیر دی ہے، حدیث پر عمل کرنے والے اور حق پر چلنے والے کی تو حدیث میں یہی نشانی بتائی گئی ہے کہ وہ قتال جاری رکھیں گے، فرمایا:

"لا تزال طائفة من أمتي يقاتلون على الحق ظاهرين لا يضرهم من خالفهم" ②

"ایک الجماعت میری امت میں سے ہمیشہ حق پر لڑتی رہے گی، ان کے مخالف ان کو اس سے نہیں ہٹا سکیں گے۔"

① جامع بیان العلم: ۲/۳۳۲ (۲۳۵۲)، السنة للمروزي ۳۳: (۱۰۴)، مستخرج

الطوسي ۲/۴۶ (۴۸)، ذم الکلام: ۱/۳۰، یہ الفاظ امام اوزاعی، مکحول اور یحییٰ بن ابی کثیر سے مروی ہیں اور اس کی سند "صحیح" ہے۔

② یہ الفاظ مختلف روایات سے مرکب ہیں، دیکھیں: صحیح مسلم (۱۰۶، ۱۰۳۷)

یہی وجہ ہے کہ انگریز کی ڈیڑھ صد سالہ غلامی کے دور میں بھی اہل علم کی ایک جماعت بے بضاعتی کے باوجود انگریز جیسی طاقتور قوم سے مقابلہ کرتی رہی۔ ذلت و عکبت وغیرہ کی ذمہ دار، قوم کی بد عملی اور قرآن و سنت سے بے رخی ہے۔ چودہ لاکھ احادیث میں سے صحیح احادیث کی چھانٹ محدثین نے کی ہے اور موضوع اور ضعیف کو بھی انہوں نے الگ کیا ہے۔ طریقت کا مطلب تو صرف یہی ہے کہ اخلاق کی درستی اور عقیدہ کی پختگی کیلئے قرآن و سنت کے ان احکام پر عمل کو رائج کیا جائے، جن پر عمل کرنے سے انسان جہاد و قتال کیلئے اپنے آپ کو بخوبی پیش کر سکے، جیسے سید احمد صاحب نے کیا، جو شاہ اسماعیل شہید کے پیر تھے۔ رہبانیت کی تردید تو حدیث میں ہی ہے۔ رہبانیت میں وہی لوگ پھنسے، جو حدیث سے کم واقفیت رکھتے تھے۔ کسی حدیث میں تسبیح کی فضیلت کا ذکر نہیں۔ دنیا کی مذمت کا ذکر قرآن میں بھی ہے اور حدیث میں بھی۔ سورۃ ”زخرف“ میں ہے:

﴿وَلَوْلَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ

لِبُيُوتِهِمْ سَقْفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ﴾^①

”اگر لوگوں میں اتنی کمزوری نہ ہوتی (جیسے اب ہے کہ وہ مال و متاع اور دنیا

کے غلام بنے ہوئے ہیں) تو ہم کافروں کے گھروں کی چھتیں اور ان کی

سیڑھیاں چاندی کی بنادیتے۔“

دنیا کا یہ مطلب ہے کہ ان چیزوں کو تعیش کا سامان بنایا جائے۔ دنیا کا یہ مطلب

نہیں کہ تجارت نہ کی جائے۔ کسب حلال اور کاشتکاری وغیرہ کی فضیلت تو جا بجا احادیث میں وارد ہے۔ حقیقت میں جو چیز خدا کے احکام سے غافل کرے، وہی دنیا

ہے۔

پس حقیقت میں ان تمام کمزوریوں کا سبب جو مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں، حدیث سے غفلت ہے۔ مکتول کے قول کا صرف یہ مطلب ہے کہ حدیث چونکہ بیان ہے، اور قرآن متن، اس لئے جتنی ضرورت متن کے سمجھنے کیلئے شرح کی ہوتی ہے۔ شرح کو سمجھنے کے لئے متن کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ قرآن اصل ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: قرآن کو قرآن ہی منسوخ کرتا ہے^① جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ سنت قرآن کو منسوخ کرتی ہے، ان کا مطلب صرف تفسیر کرنے کا ہے، یعنی قرآن کے عام کے متعلق یہ بتایا جائے کہ یہ خاص ہے، یا اس سے مراد چند افراد ہیں۔ یا یہ حکم کہ قرآن مجید کا حکم ایک علت کے ساتھ معطل ہو، اور اب وہ علت اٹھ گئی ہو، حدیث اس کا بیان کر دے کہ اب وہ علت اٹھ گئی، اس لئے حکم باقی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کسی استاد سے حدیث نہیں پڑھی۔^②

① جامع بیان العلم: ۲/۳۳۳، اس مسئلہ میں تفصیل کے لیے دیکھیں: مقالات الإسلامیین: ۴۷۹،

المعتمد: ۱/۳۹۴، الإحكام للإمامي: ۳/۱۶۹، المستصفی: ۹۹، الموافقات: ۳/۱۰۶،

روضۃ الناظر: ۸۴، مناهل العرفان: ۲/۱۷۶، فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۷/۱۹۵

② سنت و حدیث سے قرآن مجید کا نسخ علماء امت کے درمیان مختلف فیہ مسئلہ ہے، لیکن دلائل و براہین کی روشنی میں حقائق بات یہی ہے کہ سنت رسول سے قرآن مجید کا نسخ جائز ہے، کیونکہ قرآن و حدیث دونوں کا منبع و مرکز وحی الہی ہے اور اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے اپنی وحی کو منسوخ کر سکتا ہے اور سنت سے نسخ قرآن کے منکرین نے جو دلائل ذکر کیے ہیں، وہ باعتبار قوت نہایت کمزور ہیں، ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل آیت ذیل ﴿ما ننسخ من آية أو ننسها نأت بخير منها أو مثلها﴾ [البقرة: ۱۰۶] ہے۔ جس میں قرآن مجید کے نسخ کے لیے قرآن سے بہتر یا اس جیسی کسی چیز کا ہونا ضروری ہے اور سنت نہ تو قرآن سے بہتر ہے اور نہ اس کی مثل ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث رسول کا کچھ حصہ باعتبار قوت و ثبوت کے اگرچہ قرآن مجید جیسا نہیں ہے (حدیث نبوی کا بہت بڑا حصہ اہم تک قرآن مجید کی طرح متواتر پہنچا ہے) لیکن باعتبار حجیت و شریعت قرآن و حدیث

منکر حدیث

”اسی چیز نے مجھے بچا لیا، اگر میں کسی شیخ الحدیث کے اڑنگے پر چڑھ جاتا، تو وہ مجھے اقلیم حقائق سے بہت دور اوہام و ظنون کی دنیا میں لے جا کر وہ پٹختی دیتا کہ میرا سر اور نظر ہر دو آب کی طرح چکرا جاتے اور میں اس بھول بھلیاں سے کبھی نہ نکل سکتا۔“

میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ رسول کی طاعت خدا کی اطاعت ہے ﴿من يطع الرسول فقد أطاع الله﴾ [النساء: ۸۰] اور رسول کی اطاعت مطلقاً فرض ہے ﴿وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا﴾ [الحشر: ۷] لہذا قرآن و حدیث کے درمیان کسی طرح کی تفریق اور درجہ بندی غلط ہے بلکہ دونوں چیزیں تمام مسلمانوں کے لیے اصول شریعت ہیں اور دونوں چیزوں کے درمیان باعتبار اطاعت و حجیت تفریق کرنا کفار کا شیوہ ہے، کسی مسلمان کا نظریہ قطعاً نہیں ہو سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إن الذين يكفرون بالله و رسله و يريدون أن يفرقوا بين الله و رسله.....﴾ [النساء: ۱۵۰-۱۵۲] اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے بھی قرآن و حدیث کو حجیت و شریعت میں برابر قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”ألا إني أوتيت القرآن و مثله معه“ یعنی خبردار رہو! کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے مثل ایک اور چیز، یعنی سنت نبوی۔ اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”إن ما حرم رسول الله كما حرم الله“ یعنی رسول کی حرام کردہ چیز اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کی طرح ہے۔ (دیکھیں: ابوداؤد (۴۶۰۴)، ترمذی (۲۶۶۴) لہذا ان تمام دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث نبوی سے قرآن مجید کا نسخ ممکن و جائز ہے۔ اس کی مثال: قرآن مجید کی آیت ﴿كتب عليكم إذا حضر أحدكم الموت إن ترك خيراً الوصية.....﴾ [البقرة: ۱۸۰] کی ناخ حدیث نبوی ”لا وصية لوارث“ [ابوداؤد (۲۸۷۰)، نسائی (۳۶۴۱)] ہے۔ اگرچہ بعض علماء نے مذکورہ بالا آیت کی ناخ آیت میراث [النساء: ۱۱] کو قرار دیا ہے۔ لیکن آیت میراث سے مذکورہ بالا آیت میں وصیت کا وجوب منسوخ ہوتا ہے۔ وصیت کا جواز صرف مذکورہ حدیث سے ہی منسوخ ہوتا ہے۔ دیکھیں: الإحكام لابن حزم: ۵۱۱/۴، تحفة الأحوذی: ۱۸۳/۶۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: اصلاحی اسلوب تدبر حدیث:

قائل حدیث

اصل حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ چونکہ آپ نے کسی استاد سے تو حدیث پڑھی نہیں اور قرآن کا بھی یہی حال ہوگا۔ صرف منکرین حدیث کے رسائل کی واقفیت ہی آپ کی تحقیق کا منہا ہیں، اسی واسطے آپ نے قرآن کی آیتوں کے لکھنے میں بھی غلطی کی اور حدیث کے ترجمہ میں بھی غلط بیانی سے کام لیتے رہے، یہ مقولہ نہایت درست ہے:

”من كان شيخه الكتاب فغلطه أكثر من الصواب“

”جس کا استاد کتاب ہو، وہ غلط باتیں زیادہ کرتا ہے اور ٹھیک کم“

اب بھی وقت ہے سنبھل جائیے! کسی شیخ الحدیث سے تحقیق کر لیجئے اور اس کے اڑنگے سے نہ ڈریئے۔ اپنے آپ کو اتنا بے وقوف نہ بنائیے کہ کوئی ملا آپ کو پٹنی دے کر آپ کا سر اور نظر دونوں کو چکرا دے اور آپ جس کو بھول بھلیاں سمجھ رہے ہیں، وہ حقائق و معارف نظر آنے لگیں۔



چھٹا باب:

تحریف احادیث کے اسباب

مصنف نے تحریف احادیث کے آٹھ اسباب بیان کئے ہیں:

۱ کتابت حدیث کی ممانعت

۲ آسان اسلام

۳ طریقت

۴ بادشاہوں کی خوشامد

۵ فرقہ پرستی

۶ امتیاز رنگ و نسل

۷ ملا در مدح خود مے گوید

۸ حقائق حیات

ان اسباب میں اکثر جگہ موضوع روایات کا ذکر کیا ہے۔ صرف پہلا باب ایسا ہے، جس میں تحریف حدیث کا ذکر کیا ہے۔ باقی تو حقیقت میں حفظ حدیث کے باب میں ذکر ہونے چاہئیں۔ کیونکہ جن لوگوں نے موضوع احادیث بنائیں، محدثین نے وضع کے اسباب آپ سے زیادہ لکھے ہیں اور ان موضوع احادیث کو الگ کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفظ حدیث کا کیا ہی اچھا انتظام کیا!

اب ہم ترتیب وار سب پر مختصر بحث کرتے ہیں۔

پہلا سبب: کتابت حدیث کی ممانعت

پہلا سبب یہ بیان کیا ہے کہ حدیث کے لکھنے کی ممانعت کی گئی تھی، جو چیز لکھی نہ

جائے وہ بدل جاتی ہے۔ اور بالآخر مٹ جاتی ہے۔

جواب

اول: تو حدیث کے لکھنے کی ممانعت کا ذکر ہی صحیح نہیں، بلکہ واقعہ کے خلاف ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے احادیث خود لکھوائیں اور لکھی گئیں، اس پر مفصل بحث ہو چکی ہے۔

حفاظت حدیث کی صورتیں

دوم: غیر مکتوب کو تحریف سے بچانے کی اور کوشش بھی ہو سکتی ہے، جس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

① اس کو روزمرہ کے عمل میں لایا جائے، جیسے اذان، اقامت، پانچ وقتی نماز، وضو۔
 ② حکومت کیلئے قانون بنایا جائے، جیسے قصاص و دیات، نان و نفقہ، عدت، زکوٰۃ، عشر، خراج، جزیہ، حرمت سود، بعض بیوع اور اجاروں کی ممانعت، حدود، تعزیرات، حرمت شراب و میسر، میراث، وصیت، ہبہ، کفالت، امارت، تقسیم غنیمت وغیرہ۔ یہ صورت اس قسم کی ہے، جس سے حدیث تحریف سے بچ جاتی ہے۔

③ حکومت کے ذمہ اس کی اشاعت و حفاظت ہو۔

④ لوگوں کی یاد کرنے کی طرف توجہ ہو۔

⑤ متن احکام کو الگ لکھ کر محفوظ کر لیا جائے۔ اور حدیث کو بطور بیان لیا جائے۔

اس صورت میں چونکہ متن محفوظ ہوتا ہے، احادیث بھی جعاً محفوظ ہو جاتی ہیں۔

اگر غلطی سے کوئی بات بدل جائے گی، تو مندرجہ بالا اسباب کی بناء پر اس کا پتہ

چل جائے گا۔

تحریف قرآن کی مذموم کاوش:

جیسا کہ آپ نے ”دو اسلام“ میں قرآن کی آیت ﴿وَأَوْحِي إِلَيَّ هَذَا﴾

القرآن ﴿ کو ”إنما أوحى الي هذا القرآن“ لکھ دیا ہے اور ”سبح قدوس رب الملائكة والروح“ کو قرآن کی آیت بنا دیا ہے۔ مرزا غلام احمد نے ”ياأيها الذين أنفقوا في سبيل الله“ قرآن کی آیت لکھی ہے اور ہزاروں کی تعداد میں آپ کی اور مرزا غلام احمد کی کتاب طبع ہو کر لوگوں کے پاس پہنچی اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے، جواب تک آپ کا ”دوا سلام“ دیکھ کر ان کو قرآن کی آیات سمجھتے ہوں۔ مگر اس سے قرآن میں تحریف نہیں ہو جاتی۔

حدیث محفوظ ہے:

اسی طرح اگر کوئی اپنی جگہ کوئی حدیث بنائے یا صحیح حدیث کو بدل دے، تو اس سے نفس حدیث میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کی غلطی ہوتی ہے۔ حدیثوں کو قائد اعظم کی تقریر پر قیاس نہیں کر سکتے، نہ اوائل امت کو اپنے آپ پر قیاس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ مختصر جامع باتیں کرتے تھے اور ان کو بارہا فرمایا کرتے تھے۔ ایک ایک سورت اتنی بار پڑھا کرتے کہ سننے والے صرف سننے سے یاد کر لیتے۔ اسی طرح جو کلمہ مشکل ہوتا، اس کو دہراتے، پھر اگر کسی کو پوری تقریر یاد نہ رہتی، تو جس قدر یاد ہوتی بیان کرتا۔ جیسے کسی کو اگر قرآن سارا یاد نہ ہو، تو جس قدر یاد ہو، اس کے حفظ پر متروک حصہ کا کچھ اثر نہیں پڑتا اور ہم یقین کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعض لمبے خطبات پورے کے پورے محفوظ نہیں رہے۔ مگر ہم یہ باور کرنے کیلئے تیار نہیں کہ سننے والوں نے عمداً کوئی بات بدلی ہو۔ اگر کسی نے سہواً کوئی بات غلط کہی ہے، تو اس غلطی کے دور کرنے کے اسباب موجود تھے۔ اور جس قدر قرآن کے بیان اور اس پر عمل کرنے کیلئے آنحضرت ﷺ کے اسوہ کی ضرورت تھی، اس قدر ہمیں محفوظ شکل میں پہنچ چکا ہے۔

پھر سننے والے عرب تھے، جن کا حافظہ قدرتا تیز تھا، ان کو اپنے آپ پر قیاس کرنا درست نہیں، پھر قائد اعظم کی تقریر کی طرح یہ ایک ہنگامی بات نہ تھی۔ بلکہ ان باتوں کو روزمرہ دہرایا جاتا تھا، اور ان پر عمل کیا جاتا تھا۔ اسی طرح فراموش شدہ حصہ کو پھر سے یاد کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

دین کی باتیں ان حوادث کی طرح نہیں جو کہیں گذرا اور اس کے متعلق لوگوں میں اختلاف ہو، بلکہ یہ ایک دستور العمل تھا، جس کا ہماری روزمرہ کی زندگی سے تعلق تھا، جس کا مرکز خود رسول اکرم ﷺ تھے، جن کی طرف ہر سہو و نسیان کے موقع پر رجوع کیا جاتا تھا۔

اعتراض:

”دو اسلام“ میں ایک عجیب بات کہی گئی ہے کہ حضور ﷺ سے ایک بات نکلی، ہزاروں نے سنی، رفتہ رفتہ اس میں رد و بدل ہونے لگا۔ زمانہ گذرتا گیا اور بات بگڑتی گئی۔ ہزاروں سے نکل کر لاکھوں اور لاکھوں سے نکل کر کروڑوں زبانوں تک پہنچی، جہاں کوئی حصہ بھول گیا، پاس سے بڑھا لیا۔ اصل قول محفوظ نہیں تھا کہ مقابلہ کر کے تصحیح کر لیتے۔ راویوں میں اچھے بھی تھے اور برے بھی۔ مؤخر الذکر نے احادیث کو اپنی اغراض کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا اور بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔“

(دو اسلام: ۱۲۳)

جواب:

آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جب بات کروڑوں کی زبان پر چڑھ گئی، تو مختلف صورتوں میں تبدیل ہو گئی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ محدثین ہر کس و ناکس سے بات سن کر اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے، بلکہ معتبر آدمیوں سے ہی بات لی جاتی تھی۔ اس

کی اصلیت معلوم کرنے کیلئے انکے ہاں قواعد تھے، جیسے قرآن کو بہت سے لوگ غلط پڑھتے ہیں اور غلط چھپ بھی جاتا ہے، لیکن محرف نہیں ہوتا۔

اعتراض:

پھر اس کے بعد لکھتے ہیں:

”حضور ﷺ کا زمانہ تھا، خود سرور کائنات بقید حیات کہ حضرت زبیر سے ان کے بیٹے عبد اللہ نے پوچھا کہ آپ روایت حدیث سے کیوں اجتناب کرتے ہیں؟ فرمایا: اللہ کی قسم احادیث میں اختلاف ہو گیا ہے۔ میں نے حضور کی زبان مبارک سے یہ حدیث ان الفاظ میں سنی تھی:

”من كذب علي فليتبوأ مقعده من النار“^①

کہ ”جو شخص کوئی غلط قول میری طرف منسوب کرے گا، جہنم میں جائے گا“ لیکن لوگوں نے ”متعمداً“ بڑھا دیا ہے۔

جواب:

مگر اس واقعہ کی سند صحیح نہیں، بلکہ زبیر سے خود ”متعمداً“ کے لفظ کے ساتھ بھی حدیث آئی ہے۔^② اور زیادہ صحابی اس لفظ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ہو سکتا

① صحیح البخاری: کتاب العلم، باب إثم من كذب على النبي صلى الله عليه وسلم رقم الحديث (۱۰۷) مرفوع۔ کتب کے الفاظ یہیں تک ہیں، اور یہ الفاظ ”لیکن لوگوں نے متعمداً بڑھا دیا ہے۔“ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خود ساختہ ہیں۔ مزید برآں مولف رحمہ اللہ کا یہ فرمانا: مگر اس واقعہ کی سند صحیح نہیں؟ ان الفاظ کا مفہوم واضح نہیں ہو سکا، کیونکہ مذکورہ بالا اثر حدیث صحیح بخاری میں مذکور ہیں۔ واللہ اعلم

② زبیر بن عوف: سنن أبي داود: کتاب العلم، باب التشديد في الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث (۳۶۵۱)

ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی اس لفظ کے بغیر کہا ہو اور کبھی اس لفظ کے ساتھ۔
اعتراض:

آگے لکھتے ہیں:

”اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے حضرت ابو ہریرہ کی کتے والی حدیث بیان کی گئی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مویشیوں کی رکھوالی اور کھیتی کی حفاظت کیلئے کتا پالنا جائز ہے، تو ابن عمر نے فرمایا: کیوں نہ ہو، ابو ہریرہ کھیتوں کا مالک جو ٹھہرا!“

توجیہ: چونکہ حضرت ابو ہریرہ نے اپنے کھیت کیلئے کتا پال رکھا تھا، اس لئے بقول ابن عمر آپ نے ایک حدیث تراش کر کتا پالنے کا جواز نکال لیا تھا۔“ (دو اسلام: ۲۲۴)

جواب:

یہاں مصنف نے ترجمہ غلط کر کے اس کا مطلب غلط لیا ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے تو یہ کہا تھا کہ ”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی کھیتی ہے“^① یہ نہیں کہا ”کیوں نہ ہو.....“ تاکہ انکار لازم آئے۔ بلکہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مطلب یہ تھا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا چونکہ کھیت ہے، اس لئے ان کو اس مسئلہ کے متعلق تحقیق ہے۔ پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس میں منفرد نہیں، اور صحابی بھی کھیت کا لفظ ذکر کرتے ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔^②
آگے ایک اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیتے ہیں:

اعتراض:

ہمارے بعض بزرگ کہتے ہیں کہ احادیث کو چھوڑ دو گے، تو نماز پڑھنے کا

① صحیح مسلم: کتاب المساقاۃ، باب الأمر بقتل الکلاب، رقم الحدیث (۱۵۷۵)

② صحیح مسلم: کتاب المساقاۃ، باب الأمر بقتل الکلاب، رقم الحدیث (۱۵۷۶)

طریقہ کہاں سے سیکھو گے، اور زکوٰۃ کی مقدار کہاں سے معین کرو گے؟
جواب: ”اس سوال کے تین جواب ہیں، اول اگر ہم احادیث کے مطابق
 نماز پڑھنا شروع کر دیں، تو ہر مسجد کی نماز دوسری سے مختلف ہو جائے۔“

(دوا اسلام: ۱۲۴)

جواب:

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حدیث میں یہ لکھا ہے کہ ہر مسجد والے الگ الگ نماز
 پڑھیں اور جب ایک مسجد میں جمع ہوں، تو ایک ہی طرح نماز پڑھیں۔ اگر حدیثی نماز
 میں اختلاف ہونے کے باوجود ایک مسجد میں اتفاق ہو سکتا ہے، تو پھر دو مسجدوں میں
 بھی اتفاق ہو سکتا ہے۔ اور اگر دو مسجدوں میں نماز مختلف ہو سکتی ہے، تو ایک مسجد میں
 بھی مختلف ہو سکتی ہے۔ اگر حدیث سے یہ ثابت ہو بھی جائے کہ نماز ان مختلف
 طریقوں سے جائز ہے، تو اس اختلاف میں کون سی قباحت ہو سکتی ہے؟ جب آپ
 مختلف شیطیں لے کر نماز میں داخل ہو سکتے ہیں، تو اس میں کیا حرج ہے کہ ہاتھ
 باندھنے یا چھوڑنے یا رفع الیدین کرنے یا نہ کرنے اور آمین بالجہر کہنے یا آہستہ کہنے
 کے ساتھ نماز میں سب شامل ہو جائیں!

اعتراض:

آگے دوسری وجہ لکھتے ہیں:

”دوم: رسول کریم کو لاکھوں مسلمانوں نے نماز پڑھتے دیکھا، انہیں کروڑوں
 نے اور یہ سلسلہ ہم تک پہنچ گیا، کیا ان ارب کھرب مسلمانوں کی شہادت
 کافی نہیں؟ کیا دیہاتی مسلمان ”صحیح بخاری“ سے نماز کا طریقہ سیکھا کرتے
 ہیں؟ جس طریقہ سے ہمارے آباء و اجداد نماز ادا کرتے رہے۔ ہم نے وہ
 سلسلہ جاری رکھا اور اب نئی نسل ہماری نقل کر رہی ہے۔ یہاں ”صحیح“

بخاری“ کی ضرورت ہی کیا پیش آتی ہے؟ کشمیر کی ساری وادی میں ”صحیح بخاری“ کا کوئی نسخہ موجود نہ ہوگا۔ لیکن وہ پھر بھی نہایت صحت سے نماز پڑھتے ہیں۔ (دوا اسلام: ۱۲۵)

جواب:

اب سوال یہ ہے، یہ نماز جو اربوں کھربوں کی شہادت سے ثابت ہے، کیا قرآن میں اس ترتیب کو آپ اس طریقہ پر جو ہم پڑھتے ہیں، دکھا سکتے ہیں؟ اگر نہیں دکھا سکتے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے علاوہ بھی ہم کسی چیز کو مانتے ہیں، اسی کا نام تو حدیث ہے! پھر نماز کا کچھ حصہ (قیام، رکوع، سجود، قعدہ، جلسہ، قومہ، ہاتھ اٹھانا اور باندھنا) محسوس یعنی دیکھا جاتا ہے اور کچھ حصہ (جماعت کی صوت، تکبیرات، اور سمع اللہ لمن حمدہ، السلام علیکم) سنا جاتا ہے۔ مگر کچھ نماز کا حصہ وہ بھی ہے جو نہ دیکھا جاتا ہے اور نہ سنا جاتا ہے، جیسے دعاء افتتاح، سبحان ربی العظیم، ربنا لک الحمد، التحیات، درود وغیرہ، اس لئے ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کا زبانی ذکر کیا ہوگا۔ پس نماز کیلئے دو قسم کی حدیث قولی و عملی ثابت ہوگئی۔ ہاں یہ بات باقی رہ جاتی ہے، نماز میں اگرچہ اس کے بہت سے حصہ میں اتفاق ہے، مگر اس کے محسوس حصہ میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ مثلاً ہاتھ باندھنے اور چھوڑنے اور رفع الیدین کرنے اور نہ کرنے، آمین بالجہر کہنے اور آہستہ کہنے اور ہاتھ زیر ناف باندھنے یا اوپر باندھنے، مگر یہ امور سب کے نزدیک سنت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دو طرح سے نماز پڑھی ہو۔ جس طرح کسی نے دیکھا اور آگے جا کر نماز پڑھی، پھر اس کو دیکھنے والوں سے اسی طرح طریقہ چلا آیا، یہاں تک کہ یہ زمانہ آیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے صرف ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی ہو، مگر دیکھنے والوں میں سے بعض نے سنت سمجھ کر غفلت کی بناء پر

چھوڑ دیا ہو، پھر وہاں سے سلسلہ چل کر اس زمانہ تک پہنچ گیا ہو۔ یہی حال دوسرے امور اختلافیہ کا ہے۔ اب ایسے مقام پر بخاری اور دوسری کتب حدیث کی ضرورت پڑتی ہے کہ آیا یہ طریقہ آنحضرت ﷺ سے بھی ثابت ہے، یا بعد کا تعامل ہے؟

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عورتوں کی نماز میں موجودہ زمانہ میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ پس یہ اختلاف اگر بعد کا پیدا شدہ نہیں، تو ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق زبانی ہدایت دی ہو۔ پس اس صورت میں بھی قوی حدیث کا ثبوت ملتا ہے اور یہ خیال ہم کو کبھی نہیں گذرتا کہ لاکھوں نمازیوں کی زبان اور عمل پر نماز گذری، شاید کتنے تغیر اور تبدل پیدا ہوئے ہوں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی ہے کہ نماز میں اگر تغیر اور تبدل ہوتا، تو پڑھنے والوں میں سخت اختلاف ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں اختلاف نہیں، کیونکہ بالاتفاق اس کا ایک ڈھانچہ متعین ہو چکا تھا۔ جب ایک چیز متعین ہو چکی ہو، تو اس میں خواہ کتنا ہی رد و بدل ہو، آخر اس کی اصلاح ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کی تبدیل شدہ ہیئت کا کوئی بھی حامی نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات ہے، تو اسلام میں جو اجتماعی مسائل ہیں، جن میں کسی فرقہ کا اختلاف نہیں، ان کے بارہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کے متعلق تو یقین کر لینا چاہئے کہ ان میں رد و بدل نہیں ہوا ہوگا۔ اگر کسی وقت کسی نے رد و بدل کی کوشش کی بھی ہو، تو اس کو کسی نے بھی قبول نہ کیا ہوگا۔ باقی رہیں وہ احادیث جن کا تعلق اختلافی مسائل سے ہے، ان میں جو اجتماعی الصحت یا متواتر ہیں، ان کو قبول کر لیا جائے، باقی میں تحقیق کر لی جائے، اور سارا زور آپ وہاں خرچ کریں۔

اعتراض:

اس کے بعد مصنف ”دوا اسلام“ کی زبان میں تیسرا جواب سنئے:

”مؤمن: قرآن ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے، جس طرح ہم کسی تفسیر،

تاریخ یا تصوف کی کتاب کو یہ منصب عطا نہیں کر سکتے کہ وہ اسلام میں کسی نئے حکم یا اصول کا اضافہ کرے، اسی طرح ہم حدیث کو بھی یہ رتبہ نہیں دے سکتے۔ انسانی اقوال کی بے اندازہ آمیزش کی وجہ سے اس کی حیثیت انسانی تصنیف کی ہو چکی ہے۔ جس طرح بعض انسانی تصانیف کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآنی آیات و احکام کی شروح بیان کریں، اسی طرح محدثین کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان لوگوں نے صلوٰۃ و زکوٰۃ کی کوئی ایسی تشریح کی ہے، جو قرآن کے خلاف نہیں، تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟ لیکن ہم ان حضرات کو اسلام میں ایسے اضافے کی اجازت نہیں دے سکتے، جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود نہ ہو یا وہ انسانی عقل و فطرت اور قرآن ہر سہ سے متصادم ہوتا ہو۔“

(دو اسلام: ۱۲۵)

جواب:

اس جواب میں تو مصنف نے مسئلہ صاف کر دیا ہے کہ محدثین کو بھی تشریح کا حق ہے، جیسے دوسرے مصنفین کو، مگر اضافے کا حق نہیں اور حدیث اگر قرآن کے خلاف ہو یا عقل اس کو باور نہ کرے، تو وہ قابل قبول نہیں۔ حالانکہ یہ اتفاقی بات ہے کہ حدیث قرآن کا بیان اور اس کی تفسیر ہے۔ باقی مصنفین اور محدثین میں اتنا فرق ہے کہ وہ لغت وغیرہ سے تفسیر کرتے ہیں اور محدثین حدیث سے کرتے ہیں۔ اگر کسی حدیث میں کوئی ایسی بات ہے، جو قرآن میں نہیں، تو اس کو اضافہ نہیں کہتے، اضافہ اسے کہتے ہیں، جو اصل کے درجہ میں ہو، یعنی اس کو بھی قرآن سمجھا جائے، مگر حدیث کو کوئی قرآن نہیں سمجھتا۔

باقی آنحضرت ﷺ کی حدیث کو بے اندازہ انسانی اقوال کی آمیزش سے الگ

کرنے کا طریقہ ہم بارہا بتلا چکے ہیں۔ جیسے مصنف نے نماز کے متعلق حدیث کو تسلیم کیا ہے، اسی طرح اگر زکوٰۃ سے متعلق تسلیم کر لیتے، تو اچھا تھا۔ کیونکہ دونوں مسئلے تو از عمل سے ثابت ہیں، بلکہ زکوٰۃ کے متعلق تو آنحضرت ﷺ کی تحریر بھی موجود ہے۔^① اور اسلامی حکومت کے آئین میں اس کا داخل ہونا بھی اس کے متعین اور غیر محرف ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔

اعتراض:

مگر اس کے متعلق مصنف ”دو اسلام“ لکھتے ہیں:
 ”باقی رہا زکوٰۃ کا مسئلہ، تو اسے خود قرآن نے بھی واضح کر دیا ہے، زکوٰۃ ہے کیا چیز؟ اللہ کے راستے میں مالی قربانی۔“ (دو اسلام: ۱۲۶)

جواب:

اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات ہیں:
 قرآن نے زکوٰۃ اور اللہ کے راستے میں مالی قربانی کا الگ الگ ذکر کیا ہے، فرمایا:

﴿وَأَتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ
 وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى
 الزَّكَاةَ﴾^②

”بہترین مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سواہیوں اور غلاموں کی آزادی میں خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔“

اس آیت میں مالی قربانی کا الگ ذکر کیا ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا الگ بیان

① اس کی تفصیل مزرعہ کی ہے۔

② البقرة: ۱۷۷

فرمایا ہے۔ ”سورة مزمل“ میں فرمایا:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾^①

”نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو اچھا قرض دو۔“

عام طور پر قرآن مجید ”قتال في سبيل الله“ میں خرچ کرنے کو ”قرض“ سے

تعبیر کرتا ہے۔ جیسا کہ ”سورة بقرہ“ اور ”الحديد“ میں ہے۔^②

مالی قربانی کی اقسام:

مالی قربانی دو قسم کی ہے، ایک متعین اور دوسری غیر متعین۔ متعین کو عرف میں ”زکوٰۃ“ کہتے ہیں اور غیر متعین کو زکوٰۃ نہیں کہتے، اگرچہ لغت کے اعتبار سے اس پر زکوٰۃ کا اطلاق ہو سکتا ہے، پھر زکوٰۃ دائمی فریضہ ہے اور وقتی صدقات کی کوئی حد نہیں۔ کیونکہ اس کا مقصد وقتی ضرورت کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وقتی ضرورت اپنے ضروریات سے زائد تمام مال خرچ کرنے سے پوری ہوتی ہو، تو اس وقت یہی حکم ہے کہ سب خرچ کرو۔ قضیۂ اشتراکیت اور سرمایہ داری کا یہ حل نہیں کہ بالکل جمع کرنے سے روک دیا جائے۔ ورنہ میراث کی وصیت اور خرچ کرنے کا مقصد ہی مفقود ہو جائے گا۔ بلکہ اس کا حل یہ ہے، فقراء و مساکین کی ضروریات (کھانا پینا، پہننا، سکونت، نکاح، علاج، تعلیم وغیرہ) کا پورا بندوبست کیا جائے۔ اگر زکوٰۃ سے بندوبست ہو جائے، تو فبہا، ورنہ تمام زائد مال تک اس میں خرچ کر دیا جائے۔ یہی قرآن سے ثابت ہے اور یہی حدیث میں ہے۔^③ جب تمام زائد مال کا خرچ کرنا، وقتی ٹھہرا، تو اس کو دائمی فرض نہیں بنا سکتے اور دائمی فرض ہمیشہ متعین ہوا کرتا

① المزمل: ۲۰

② دیکھیں: البقرہ: ۲۴۵، الحديد: ۱۱

③ دیکھیں: البقرہ: ۲۱۹، نیز دیکھیں: صحيح مسلم (۹۹۷)

ہے، وقتی فرض متعین نہیں ہوتا، اس کا تعین حاجت کے اندازے پر ہوتا ہے۔ پس لازمی طور پر زکوٰۃ متعین ہونی چاہئے۔

تحریفِ حدیث کا دوسرا سبب: آسان اسلام

اس میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ”اسلام جہاد و قتال کو فرض قرار دیتا ہے۔ مگر حدیث سے ایسا معلوم نہیں ہوتا۔“ حالانکہ حدیث ”کتاب الجہاد“ میں یہ باتیں احسن طریقہ پر بیان ہو چکی ہیں۔ فقہ کی تمام کتابوں میں ”کتاب الجہاد“ موجود ہے۔ انگریز کے ساتھ علماء دین جہاد کرتے رہے۔

موضوع احادیث کا تذکرہ:

اب اس کے بعد موضوع حدیثیں بیان کی ہیں:

پہلی حدیث:

① بلی سے محبت ایمان۔

سخاوی نے اس کو ”موضوع“ قرار دیا ہے۔^①

دوسری حدیث:

② ”من تعلم بابا من العلم ليعلم الناس ابتغاء وجه الله أعطاه

الله أجر سبعين نبيا“

”جو مولوی کسی طالب علم کو کسی کتاب کا ایک ہی باب فی سبیل اللہ پڑھا

دے اللہ (تعالیٰ) اسے ستر نبیوں کا اجر عطا فرماتا ہے۔“ (دوامِ اسلام: ۱۳۱)

اس حدیث کو ”تذکرۃ الموضوعات“ میں ”موضوع“ قرار دیا گیا ہے۔^②

① یہ حدیث ”موضوع“ ہے، دیکھیں: کشف الخفاء (۱۱۰۴)، تذکرۃ الموضوعات: ۱۱۱

② الفوائد المجموعۃ: ۹۸۴، تذکرۃ الموضوعات: ۱۸

مصنف نے اس کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”جو علم کا ایک باب پڑھے، تاکہ لوگوں کو اللہ واسطے پڑھائے، اللہ تعالیٰ اسے ستر نیوں کا اجر عطا فرماتے ہیں۔“

تیسری حدیث:

⑤ آگے ایک حدیث وضو کی فضیلت میں لکھی ہے، جس کا مضمون یہ ہے: ”وضو کے ہر قطرہ سے فرشتہ پیدا ہوتا ہے، جو ستر زبانوں میں اللہ کی تسبیح بیان کرتا ہے، قیامت میں اس کو اس کا ثواب ملتا ہے۔“ یہ حدیث بھی موضوع ہے، دیکھو: تذکرہ! ①

چوتھی حدیث:

⑥ اس کے بعد ایک اور موضوع حدیث لکھی ہے، جس کا مضمون یہ ہے: ”جو آدمی مرنے کے بعد ایک ورقہ علم کا چھوڑ جائے، وہ ورقہ جہنم اور اس کے درمیان آڑ بن جائے گا۔“ یہ حدیث بھی موضوع ہے۔ دیکھو: میزان، تذکرہ۔ ②

پانچویں حدیث:

⑦ اس کے بعد ایک اور حدیث موضوع لکھی ہے: ”من کتب بسم اللہ الرحمن الرحیم، فجوده تعظیماً للہ غفرلہ“

① المجروحین لابن حبان: ۱۶۵/۲، العلل المتناہیة: ۳۳۹/۱، لسان المیزان: ۲۳۰/۳،

تذکرۃ الموضوعات: ۳۲

② تذکرۃ الموضوعات: ۲۳، مولف: تذکرۃ نے ”میزان“ کا حوالہ ایک دوسری بعد والی حدیث کے

لیے دیا ہے۔ دیکھیں: لسان المیزان: ۶۸/۲

”جو شخص بسم اللہ کو خوشخط لکھے، اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔“ یہ بھی موضوع ہے۔^① (تذکرہ)

چھٹی حدیث:

① ”جو شخص سال بھر کسی مسجد میں سچی نیت سے اذان دیتا رہے، وہ قیامت کے دن جنت کے دروازہ میں کھڑا ہوگا، اس کو اختیار دیا جائے گا، جس شخص کی چاہے، شفاعت کرے۔“ موضوع ہے (تذکرہ)^②

ساتویں حدیث:

④ پھر حج کے بارہ میں ایک موضوع روایت لکھی ہے کہ:

”جو شخص فجر کی نماز باجماعت پڑھے، اس کو اتنا ثواب ملے گا، گویا اس نے پچاس حج کئے ہوں۔“

مگر یہ حدیث صحیح نہیں، تیسرے درجہ کی ضعیف بلکہ موضوع ہے۔^③

① الکامل لابن عدي: ٤٩/٥، لسان الميزان: ٢٩٩/٤، السلسلة الضعيفة: ٤٣٨/١۔ ملا طاهر ثبتي نے ”تذکرہ“ میں اس حدیث کو ”موضوع“ نہیں قرار دیا، بلکہ اس حدیث کے بعض شواہد کی بناء پر اس کو صحیح قرار قرار دیا (تذکرۃ الموضوعات: ٢٣-٢٤) لیکن ان کا یہ قول درست نہیں۔ کیونکہ اس کی سند میں بعض متروک و کذاب راوی ہے، جن کی بناء پر یہ حدیث ”موضوع“ ہے اور اس کا شاہد بھی ضعیف ہے۔ اسی بناء پر امام ابن جوزی، سیوطی، البانی رحمہم اللہ اور دیگر علماء نے اس حدیث کو ”موضوع“ قرار دیا ہے۔

② الفوائد المجموعة: ٢١، تذکرۃ الموضوعات: ٣٦، السلسلة الضعيفة: ٢٤٣/٢۔

③ یہ حدیث ”موضوع“ ہے۔ دیکھیں: لسان الميزان: ٤٥٤/٢، كشف الخفاء للعجلوني (٢٥١٩)، الفوائد المجموعة: ٣٢، تذکرۃ الموضوعات: ٣٩۔

آٹھویں حدیث:

① اس کے بعد ایک اور موضوع حدیث ”لا إله إلا الله“ کی فضیلت میں ذکر کی ہے کہ ”جو شخص لا إله إلا الله..... پڑھے، اس کے چار ہزار کبیرے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔“

یہ موضوع حدیث بھی ”تذکرہ“ میں ذکر کی گئی ہے۔^①

نویں حدیث:

① ایک اور حدیث ملاحظہ ہو:

”إن أمتي أمة مرحومة لا عذاب عليها في الآخرة“
 ”(آحضرت ﷺ نے فرمایا) میری امت بخشی ہوئی ہے، اسے قیامت کے دن عذاب نہیں ہوگا۔“
 موضوع ہے۔ (تذکرہ)^②

① کنز العمال: ۷۴/۱، تذکرہ الموضوعات: ۵۵۔

② یہ حدیث کئی اسانید کے ساتھ مروی ہے، بعض اسانید ”صحیح“ اور کچھ اسانید ”ضعیف“ ہیں، لہذا یہ حدیث قابلِ احتجاج ہے، مؤلف رحمہ اللہ نے جس سند کے پیش نظر اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اس کی سند میں ”مسلمہ بن علی بن خلف الخشني“ متروک ہے۔ (الجرج والتعديل: ۲۶۸/۸، الکامل في الضعفاء: ۳۱۳/۶، المجروحین لابن حبان: ۳۳/۳، الكشف الحیث: ۲۵۶) لہذا اس سند کی بناء پر یہ حدیث ”ضعیف“ ہے۔ دیکھیں: تذکرہ الموضوعات: ۹۲، کنز العمال: ۳۷/۱۴، الفتن للروزي: ۵۹۳/۲، لیکن دیگر اسانید کے پیش نظر یہ حدیث ”صحیح“ ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود: کتاب الفتن والملاحم، باب ما يرجی فی القتل، رقم الحديث (۴۲۷۸) مسند أحمد: ۴۱۰، ۴۱۰/۴، ۴۱۸، المستدرک: ۴/۲۸۳، ۴۹۱، المعجم الصغير (الروض الداني: ۲۵/۱) مسند أبي يعلى: ۶۷/۱۱، مسند عبد بن حميد: ۱۹۰، اس حدیث کو امام حاکم، ذہبی اور البانی رحمہم اللہ نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

اب تک جس قدر حدیثیں ذکر کی ہیں، وہ سب ”موضوع“ ہیں اور محدثین نے ان کو غیر معتبر کہا ہے۔ پھر معلوم نہیں، ان کے ذکر کرنے میں تحریف کا اثبات ہوتا ہے یا نفی کا، ظاہر تو یہی ہے کہ وضع کرنے والا تو حدیث میں اضافہ کرنا چاہتا تھا، مگر محدثین نے اس کا مکر چلنے نہ دیا، پس یہ حدیث کی حفاظت ہوئی! آگے کہتے ہیں:

تحریف حدیث کا تیسرا سبب: طریقت

”مشکل اسلام سے بھاگنے والے دو گروہ تھے، ملا اور پیر۔ پیر نے جہاد سے جان چھڑانے کیلئے اپنے ”ہو حق“ کے نعروں کو جہاد اکبر بنا لیا اور اپنے مسلک پر احادیث گھڑنا شروع کر لیں۔

چند موضوع احادیث

پہلی حدیث:

① ”حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور سے پوچھا کہ علم باطن کیا چیز ہے؟

← (السلسلة الصحيحة: ۲/ ۶۴۸ (۹۵۹) اس کی بعض اسانید میں ”عبد الرحمن بن عبد اللہ المسعودی“ ہے، جو کہ آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے، اور ان سے یزید بن ہارون، کثیر بن ہشام اور ہاشم بن قاسم روایت کرتے ہیں، جب کہ انھوں نے عبد الرحمن المسعودی سے بعد از اختلاط سنا ہے، لہذا اس علت کی بناء پر یہ سند ”ضعیف“ ہے۔ لیکن ”معاذ بن معاذ العبیری“ بھی مسعودی سے یہ روایت بیان کرتے ہیں، اور ان کا مسعودی سے سماع اختلاط سے پہلے کا ہے۔ الکواکب النیرات: ۵۴: ۳۵)

تنبیہ: اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اکثر و اغلب لوگ عذاب سے محفوظ رہیں گے، اور کچھ لوگ جہنم میں ضرور جائیں، جو اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد جہنم سے نکال لیے جائیں گے، اور کچھ نبی کریم ﷺ کی شفاعت کے بعد جہنم سے نکال لیے جائیں گے۔

دیکھیں: (شعب الإيمان: ۱/ ۳۴۲، السلسلة الصحيحة: ۲/ ۶۴۹)

حضور ﷺ نے فرمایا: یہی سوال میں نے جبریل سے پوچھا تھا، اس نے جواب دیا کہ یہ ایک راز ہے، جسے صرف اللہ اور اس کے چند اولیاء و اصفیاء جانتے ہیں، نہ کوئی فرشتہ اس راز سے آگاہ ہے اور نہ کوئی پیغمبر۔“

یہ بھی موضوع ہے۔^① (تذکرہ)

دوسری حدیث:

❖ اس کے بعد ذکر اللہ اور تسبیح کے ثواب میں ایک حدیث بیان کی ہے کہ: ”اگر ایک بادشاہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ ذکرِ خدا میں کتنا لطف ہے، تو وہ سلطنت چھوڑ دے اور اگر اس کی ایک تسبیح کا ثواب عام دنیا پر تقسیم کر دیا جائے، تو ہر شخص کے حصے میں کائناتِ عالم کی تعداد سے دس گنا زیادہ نیکیاں آئیں۔“

موضوع ہے۔^② (تذکرہ)

یہاں صرف دو موضوع حدیثیں بیان کی ہیں، جن کو محدثین نے چھانٹ دیا ہے اور اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ محدثین نے حدیث کی کس قدر حفاظت کی ہے!

تحریف حدیث کا چوتھا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

① العجالة في الأحاديث المسلسلة: ۸۹، كشف الغطاء (۱۷۶۵)، الفوائد المجموعة: ۲۸۴،

تذکرۃ الموضوعات: ۱۸

② تذکرۃ الموضوعات: ۵۵، اس کی سند میں ”سليمان بن عمرو النخعي“ کذاب

ہے۔ (التاريخ الكبير: ۲۸/۴، الجرح وللتعديل: ۱۳۲/۴، المجروحين: ۱/۳۳۳،

الكشف الحثيث: ۱۳۰)

تحریف حدیث کا چوتھا سبب: بادشاہوں کی خوشامد

پہلی موضوع حدیث:

۱ "یا معاویۃ أنت منی و أنا منك"

۱ "اے معاویہ! تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے!" (موضوع - تذکرہ)

دوسری حدیث:

۲ "أنا مدینة العلم وعلی بابها"

۲ "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ!" (موضوع - تذکرہ)

تیسری حدیث:

۳ "لکل أمة فرعون وفرعون هذه الأمة معاویة"

۳ "ہر امت کا ایک فرعون ہے اور اس امت کا فرعون معاویہ ہے۔"

(موضوع - تذکرہ)

چوتھی حدیث:

۴ "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم للعباس إذا كانت خمس

وثلاثين ومائة فالخلافة لك ولو لدك منهم السفاح والمنصور والمهدي"

"رسول اللہ ﷺ نے عباس رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ ۱۳۵ھ میں خلافت تمہاری

اولاد میں منتقل ہو جائے گی، ان سے ایک سفاح، منصور اور مہدی

۱ العلل المتناهية: ۱/۲۷۹، لسان المیزان: ۴/۲۵، تذکرۃ الموضوعات: ۱۰۰

۲ الموضوعات لابن الجوزي: ۲/۱۱۰، الفوائد المجموعة: ۳۴۸، تذکرۃ الموضوعات: ۹۶،

السلسلة الضعيفة: ۶/۳۵۷،

۳ العلل المتناهية: ۱/۲۸۰، الفوائد المجموعة: ۴۰۷، تذکرۃ الموضوعات: ۱۰۰

ہونگے۔ (موضوع۔ تذکرہ) ^①

یا نجویں حدیث:

⑤ ”إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَطِيرُ الْحَمَامَ
”رسول ﷺ کبوتر اڑایا کرتے تھے۔“ (موضوع۔ تذکرہ) ^②

چھٹی حدیث:

⑥ ”إِنَّ اللَّعِبَ بِالْحَمَامِ مِنْ عَمَلِ قَوْمِ لُوطَ“
”کبوتر سے کھیلنا قوم لوط کا عمل ہے۔“ (موضوع۔ تذکرہ) ^③

ساتویں حدیث:

④ ”أَكْرَمُوا الْبَقْرَ فَإِنَّهَا سَيِّدَةُ الْبَهَائِمِ مَا رَفَعَتْ طَرْفَهَا إِلَى السَّمَاءِ مِنْذُ
عَبْدِ الْعَجَلِ“

”گائے کی تعظیم کرو، کیونکہ وہ مویشیوں کی سردار ہے، اور جب سے
یہودیوں نے گوسالہ پرستی کی، یہ بیچاری شرم سے اپنا سر آسمان کی طرف نہ
اٹھا سکی۔“ (موضوع۔ تذکرہ) ^④

① لسان المیزان: ۱/۱۷۱، الكشف الحیث: ۴۵، الفوائد المجموعۃ: ۴۱۳، تذکرۃ الموضوعات: ۱۰۰

② تاریخ بغداد: ۱۳/۴۸۴، المنار المنیف: ۹۵، فتح المغیث: ۱/۲۵۹، الفوائد المجموعۃ: ۱۷۴، تذکرۃ الموضوعات: ۱۵۴

③ یہ مرفوع حدیث نہیں، بلکہ سفیان ثوری کا قول ہے دیکھیں: ذم الملاحی لابن ابی الدنیا: ۸۶ (۶۴)
تذکرۃ الموضوعات: ۱۱۷۳، الطرق الحکمیۃ: ۴۰۹

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ قول مروی ہے۔ (الکبائر للذہبی: ۵۵)۔ رسول اللہ ﷺ نے
ایک فحش کو دیکھا وہ کبوتری کے پیچھے لگا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان شیطانی کے پیچھے لگا
ہوا ہے۔ (ابوداؤد: ۴۹۴۰)، مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۶/۳۲

④ الفوائد المجموعۃ: ۱۷۱، تذکرۃ الموضوعات: ۱۵۲-۱۵۳

آٹھویں حدیث:

۱۸ "من لم یکن عنده صدقة فلیعلن الیهود"
 "جس شخص کے پاس صدقہ کے لیے کوئی چیز نہ ہو، وہ یہودیوں پر لعنت
 کرے" (موضوع۔ تذکرہ)

ان احادیث کا بھی تحریف حدیث سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ موضوع ہیں۔
 محدثین نے ان کو الگ کر دیا ہے۔ یہ حفاظت حدیث کی دلیل ہے نہ کہ تحریف کی۔
 پھر لکھتے ہیں:

پنجم: فرقہ پرستی

پہلی موضوع حدیث:

① "صنفان من أمتی لیس لهما نصیب فی الإسلام القدیری
 والمرجیة"
 "میری امت کے دو فرقوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، قدریہ اور مرجیہ۔"

- ① نیز دیکھیں: الكامل لابن عدي: ۴/۳۰۳، المجروحین: ۱۱/۲، تاریخ بغداد: ۲۶۹/۱۴، الموضوعات لابن الجوزي: ۴۸۹/۲، الفوائد المجموعة: ۵۰۷، كشف الخفاء: (۲۶۰۵)، تذكرة الموضوعات: ۱۶، السلسلة الضعيفة: ۲۱۹/۱ (۱۰۴)
- ② سنن الترمذي: أبواب القدر، باب ما جاء في القدر، رقم الحديث (۲۱۴۹)، وقال: "هذا حديث غريب حسن صحيح" سنن ابن ماجه: باب في الإيمان، رقم الحديث (۷۳) مسند عبد بن حميد: ۲۰۱ (۵۷۹) اس کی سند میں: "علی بن نزار" اور "نزار بن حیان ضعیف ہیں، (الجرح والتعديل: ۲۰۷/۶، الكامل فی الضعفاء: ۱۹۵/۵، المجروحین لابن حیان: ۱۱۲/۲، ۵۶/۳، الكشف الحفیث: ۲۶۶) یہ حدیث اس کے علاوہ بھی دیگر اسانید کے ساتھ مروی ہے، لیکن ان میں شدید ضعف پایا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: العلل المتناهية: ۱۴۷/۱، ظلال الجنة للألبانی: ۱۴۹

دوسری حدیث:

② ”القدرية مجوس هذه الأمة..... الخ“

”قدریہ اس امت کے مجوس ہیں، اگر بیمار ہوں، تو ان کی عیادت نہ کرو اور اگر مر جائیں، تو جنازہ نہ پڑھو!“^①

تذکرۃ الموضوعات میں ان کو موضوع کہا گیا ہے۔^②

مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں حدیثیں موضوع نہیں، پہلی حدیث حسن ہے اور دوسری بھی قابلِ استشہاد ہے۔

① سنن أبي داود: كتاب السنة، باب في القدر، رقم الحديث (٤٦٩١)، المستدرک:

١٥٩/١ (٢٨٦)، سنن البيهقي: ٢٠٣/١٠ (٢٠٦٥٨) اس سند میں ”ابو حازم سلمة بن

دينار“ کا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔ (تہذیب الکمال: ٢٧٣/١١، جامع

التحصيل: ١٨٧) نیز اس حدیث کے لیے دیکھیں: سنن ابن ماجہ: باب في القدر، رقم

الحديث (٩٢)، المعجم الأوسط: ٣٦٨/٤، المعجم الصغير: ٣٦٨/١، (٦١٥) یہ

حدیث دیگر اسانید کے ساتھ بھی مروی ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد: ٤٠٦/٥، المعجم

الأوسط: ٦٥/٣، ٢٢٦/٤، ٣٦٧/٧، المعجم الصغير: ٧١/٢، سنن البيهقي: ٢٠٣/١٠،

مسند الشاميين: ٣٤٣/٣، تاریخ بغداد: ١١٣/١٤، الكامل في الضعفاء: ٧٧/٧، اعتقاد

أهل السنة للإلكائي: ٦٣٩/٤۔ الإبانة لابن بطة: ٩٥/٢، الشريعة: ٢٠٤، امام ابن جوزی

نے محمولہ بالا بعض اسانید کے پیش نظر اس حدیث کو ضعیف اور موضوع قرار دیا ہے۔ (العلل

المتناہية: ١٥١/١، الموضوعات: ٤٥١/١، جس پر حافظ علائی اور امام سیوطی نے ان کا

تعاقب کیا، اور حافظ علائی نے اس حدیث کو ”حسن“ قرار دیا ہے۔ مزید برآں علامہ ناصر الدین

البانی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو ”حسن“ قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: ظلال

الجنة: ١٦٢۔

② تذکرۃ الموضوعات: ١٥۔

تیسری حدیث:

③ ”أول ما خلق الله العقل“ (موضوع - تذكرة) ①

چوتھی حدیث:

④ ”القرآن كلام الله غير مخلوق فمن قال غير هذا فاقتلوه.....“ ②

پانچویں حدیث:

⑤ ”من قال القرآن مخلوق فقد كفر“ (موضوع - تذكرة) ③

”قرآن غیر مخلوق ہے (قدیم ہے) جو اسے مخلوق کہے، اسے مار ڈالو، جو شخص قرآن کو غیر مخلوق سمجھے، وہ کافر ہے۔“ (موضوع - تذكرة)

مسئلہ خلق قرآن:

اس حدیث کے آگے محاکمہ کرتے ہیں:

”بات سیدھی سی تھی، جس پر غور نہ کیا گیا، چیزیں دو تھیں: وصف کلام اور کلام، گفتگو کی اہلیت یا وصف الگ چیز ہے اور گفتگو کرنا الگ۔ ہر آدمی

① الفوائد المجموعة: ٤٧٧، الدرر المنتشرة: ٣٦٧، تذكرة الموضوعات: ٢٨-٢٩

② تذكرة الموضوعات: ٧٧

③ كشف الخفاء (١٨٦٩)، الفوائد المجموعة: ٣١٣، تذكرة الموضوعات: ٧٧، اس حدیث کو علامہ طاہر مٹھی نے امام سیوطی کی کتاب سے نقل کیا ہے اور اس حدیث کے بارے میں امام سیوطی کا قول نقل کیا ہے: ”لا یصح“ اس کے بعد علامہ طاہر مٹھی فرماتے ہیں: ”قلت له طرق“ (تذكرة الموضوعات: ٧٧) لیکن اس حدیث کی اسانید میں وضاع اور کذاب راوی ہیں، جس کی بناء پر امام بیہقی، سخاوی اور شوکانی وغیرہم نے اس کو ”موضوع“ قرار دیا ہے، امام شوکانی فرماتے ہیں: ”وقد اوردہ صاحب اللالی فی اول کتابہ و ذکر له شواہد و اطلال فی غیر طائل فالحدیث موضوع تجاراً علی وضعہ من لا یستحي من اللہ تعالیٰ.....“

وصف کلام (گفتگو کی اہلیت) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ مضامین، اشعار اور کتابیں بعد میں لکھتا ہے، وصف کلام پیدائشی ہے، کلام اور نتائج کلام بعد کی پیداوار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا وصف کلام اللہ کی طرح قدیم ہے، لیکن نتائج کلام (موسیٰ سے کلام، تورات، انجیل، قرآن وغیرہ) بعد کی پیداوار ہیں، اور اس لئے حادث ہیں۔“ (دوا سلام: ۲۴۳)

غلط فہمی کا ازالہ:

اس کا مطلب یہ ہوا کہ معتزلہ جو مخلوق کہتے تھے، وہ نتائج کو مخلوق کہتے تھے، اور امام احمد رحمہ اللہ جو غیر مخلوق کہتے تھے۔ وہ وصف کلام بمعنی اہلیت کلام کے اعتبار سے کہتے تھے، یعنی دونوں کا مطلب الگ الگ تھا۔ نزاع لفظی تھا، اس کا مطلب قرآن سے کچھ اور تھا اور امام احمد رحمہ اللہ کا کچھ اور، یعنی بے وقوفوں کی منہی تھی، جو ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھا نہ سکے۔ حالانکہ یہ بین بات ہے کہ نزاع ایک چیز میں تھا۔ قرآن میں تھا، نہ وصف کلام میں۔ نزاع کی وجہ یہ بات تھی کہ معتزلہ چونکہ اس قرآن کو حادث سمجھتے تھے، اس لئے وہ اللہ کے ساتھ اس کا قیام محال جانتے تھے۔ اس واسطے ان کے نزدیک قرآن اللہ تعالیٰ سے منفصل چیز سمجھا جاتا تھا اور جو اللہ تعالیٰ سے منفصل ہو، وہ مخلوق ہوتی ہے۔

اور امام احمد رحمہ اللہ اس منطق کے قائل نہ تھے، وہ کہتے تھے، قرآن چونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا وصف ہے، بس ضروری ہے کہ اس کے ساتھ قائم ہو، پس جو چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوگی، وہ ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کی طرح غیر مخلوق ہو۔ کیونکہ مخلوق اس چیز کو کہتے ہیں، جو حادث اور منفصل ہو۔ گویا نزاع صرف یہ تھا کہ کلام باری، باری تعالیٰ سے منفصل ہے یا متصل۔ معتزلہ منفصل کہتے تھے اور امام احمد رحمہ اللہ متصل۔ متصل ماننے سے غیر مخلوق ہوگا اور منفصل ماننے سے مخلوق!

چھٹی موضوع حدیث:

اس کے بعد رافضیوں کے متعلق ایک حدیث کا ذکر ہے:

⑥ ”الرافضة الذين رفضوا ديني“

① رافضہ وہ ہیں، جنہوں نے میرے دین کو چھوڑ دیا۔ (موضوع۔ تذکرہ)

ساتویں حدیث:

ایک اور حدیث:

⑦ ”اتقوا اليهود والهنود“

② یہود اور ہنود سے بچو! (یہ بھی ”موضوع“ ہے)

آٹھویں حدیث:

اور ایک وضعی حدیث:

⑧ ”سراج أمتي أبو حنيفة“

③ ”ابوحنیفہ میری امت کا چراغ ہے!“ (موضوع)

ایک اور موضوع حدیث یہ ہے:

نویں حدیث:

⑨ ”سيكون من أمتي رجل يقال له محمد بن إدريس أضر علي“

”امتی من ابلیس“

”میری امت میں ایک شخص محمد بن ادریس ہوگا، میری امت پر وہ ابلیس

① تذكرة الموضوعات: ۹۳

② كشف الخفاء (۹۸)، تذكرة الموضوعات: ۱۱۴

③ كشف الخفاء (۵۳)، الفوائد المجموعة: ۴۲۰، تذكرة الموضوعات: ۱۱۱، السلسلة

الضعيفة: ۴۲/۲

سے بھی زیادہ مضر ہوگا۔^①
آگے لکھتے ہیں:

ششم: امتیاز رنگ و نسل

پہلی حدیث:

① ”إياكم وزی الأعاجم“

کہ ”تم لوگ اہل عجم کے لباس سے بچو!“
ترجمہ غلط ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے: ”عجمی وضع اختیار نہ کرو۔“
(موضوع۔ تذکرہ)^②

دوسری حدیث:

ایک اور حدیث:

② ”فارسی کلام، اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، خوزیہ شیطانی کلام ہے، بخاری دوزخیوں کی کلام ہے، جنتیوں کی کلام عربی ہے۔“
(یہ حدیث بھی ”موضوع“ ہے۔)^③
آگے تحریف کا ساتواں سبب لکھتے ہیں:

① مصادر سابقہ

② یہ مرفوع حدیث نہیں، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور اس کی سند ”صحیح“ ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد: ۱/۴۳ (۳۰۱)، صحیح ابن حبان: ۱۲/۲۶۸ (۵۴۵۴) مسند أبی یعلیٰ: ۱/۱۸۹ (۲۱۳)، شرح معانی الآثار: ۴/۲۷۵، سنن البیہقی: ۱۰/۱۴ (۱۹۵۲۲)، مسند ابن الجعد: ۱۵۶ (۹۹۵)، تذکرۃ الموضوعات: ۱۱۳۔

③ ألمجروحین: ۱/۱۲۹، الموضوعات لابن الجوزي: ۱/۱۵۸، لسان المیزان: ۱/۴۰۶، تذکرۃ الموضوعات: ۱۱۳، اس کی سند میں اسماعیل بن زیاد کذاب اور متروک ہے۔

ہفتم: ملا درمدح خود گوید

پہلی حدیث:

① ”جو عالم کی زیارت کرے، اس نے میری زیارت کی، جو عالم سے مصافحہ کرے، اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔“ (موضوع) ①

دوسری حدیث:

② کسی عالم کی مجلس میں حاضری ہزار رکعات نماز، ہزار مریضوں کی عیادت، ہزار جنازوں میں شامل ہونے سے بہتر ہے۔“ (موضوع) ②

تیسری حدیث:

③ ”علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل“
”میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔“ (موضوع) ③

چوتھی حدیث:

④ ”الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ“
”قوم میں شیخ ایسا ہے، جیسے کہ امت میں نبی!۔“ (موضوع) ④

① تاریخ جرجان: ۱۹۷، الفوائد المجموعہ: ۲۸۵، کشف الخفاء: (۲۴۹۴) تذکرۃ الموضوعات: ۱۹، السلسلۃ الضعیفۃ: ۳۳۴/۷۔

② الموضوعات لابن الجوزی: ۱/۳۶۲ (۴۴۴)، لسان المیزان: ۱/۱۹۳، الفوائد المجموعہ: ۲۸۵، کشف الخفاء: (۱۱۴۶)، تذکرۃ الموضوعات: ۲۰۔

③ المقاصد الحسنۃ: ۴۵۹، (۷۰۲)، الدرر المنشرۃ: ۳۱۲، کشف الخفاء: (۱۷۴۴)، الفوائد المجموعہ: ۲۸۶، السلسلۃ الضعیفۃ: ۱/۶۷۹ (۴۶۶)۔

④ تہذیب التہذیب: ۵/۲۸۹، الدرر المنشرۃ: ۲۸۰، کشف الخفاء: ۲/۵۶۲، الفوائد المجموعہ: ۲۸۶، تذکرۃ الموضوعات: ۲۰۔

یا نجویں حدیث:

⑤ ”مداد العلماء أفضل من دم الشهداء“

① علماء کی سیاہی شہداء کے خون سے افضل ہے۔ (موضوع)

چھٹی حدیث:

⑥ ”اعتبروا عقل الرجل في طول لحيته“

② جتنی داڑھی لمبی ہو، اتنی ہی عقل زیادہ ہوتی ہے۔ (موضوع)

ساتویں حدیث:

⑦ ”السواك يزيد الرجل فصاحة“

③ مسواک سے فصاحت بڑھتی ہے۔ (موضوع)

آٹھویں حدیث:

⑧ جن کی عقل نہیں، ان کا دین نہیں۔ (موضوع)

نویں حدیث:

④ ① زکوٰۃ علماء کو دیا کرو!۔ (موضوع)

① كشف الخفاء (٢٢٧٦)، الدرر المنتثرة: ٣٩٠، الفوائد المجموعة: ٢٨٧، تذكرة

الموضوعات: ٢٣، یہ حسن بصری کا قول ہے، جسے معترض حدیث بنا کر پیش کر رہے ہیں!!

② كشف الخفاء (١٦٧٧)، تذكرة الموضوعات: ٣٠، السلسلة الضعيفة: ٤٤١/١

③ العلل المتناهية: ٣٣٦/١، الفوائد المجموعة: ١١، كشف الخفاء (١٤٩٤) السلسلة

الضعيفة: ٦٤٢۔

④ شعب الإيمان: ١٥٧/٤، لسان الميزان: ٢٨/٢، ضعيف الجامع الصغير: ٦٠٠ (٤١١٦)

⑤ لسان الميزان: ٢٥٥/٢، الفوائد المجموعة: ٦٠

دسویں حدیث:

❶ کسی بھوکے کو کھانا سب سے بہتر ہے، جو پیٹ بھر کر کھائے یا پانی سے سیراب کرے، اس کے اور آگ کے مابین سات گڑھے بن جائیں گے۔ ایک ایک گڑھا پانچ سو سال کا ہوگا۔ (موضوع) ❶

گیارہویں حدیث:

❷ ”کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يحب الحلواء“ ❷
 ”آنحضرت ﷺ میٹھی چیز کو پسند فرماتے تھے۔“
 یہ حدیث صحیح ہے، اس میں کوئی چیز خلاف عقل، قرآن یا فطرت نہیں، لہذا اس کو یہاں بیان کرنا بے معنی ہے۔
 اس کے آگے بیان کیا ہے:

بارہویں حدیث:

❸ ”قلب المؤمن حلو ويحب الحلوة ومن حرمها على نفسه

❶ المستدرک: ۱۴۴/۴ (۷۱۷۲)، المعجم الأوسط: ۳۲۰/۶، شعب الإيمان: ۲۱۷/۳، اس کی سند میں ”رجاء بن أبي عطاء المصري“ ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں: صاحب موضوعات ابن حبان بھی فرماتے ہیں: ”یروی الموضوعات“ اس کے بعد مذکورہ بالا حدیث کو بطور مثال ذکر کیا ہے۔ (المجروحین: ۳۰۱/۱، لسان المیزان: ۴۵۶/۲) لہذا یہ حدیث ”موضوع“ ہے۔
 دیکھیں: الفوائد المجموعة: ۷۵، السلسلة الضعيفة: ۱۷۰/۱

تنبیہ: اس کا یہ جملہ ”کسی بھوکے کو کھانا کھانا سب سے بہتر ہے۔“ مذکورہ بالا ”موضوع“ حدیث کا حصہ نہیں ہے۔

❷ صحیح البخاری: کتاب الأطعمة، باب الحلواء والعسل، رقم الحدیث (۵۱۱۵)، صحیح مسلم: کتاب الطلاق، باب وجوب الکفارة، رقم الحدیث (۱۴۷۴)

فقہ عصی اللہ ورسولہ“^①

”مومن کا دل میٹھا ہے اور مٹھاس کو چاہتا ہے، جو اس کو اپنے آپ پر حرام کرے، اس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی۔“

تیسری حدیث:

﴿۱۳﴾ ”جو شخص اپنے بھائی کو حلوے کا ایک لقمہ کھلائے گا، اللہ اسے محشر کی گرمی سے بجائے گا۔“^②

چوتھی حدیث:

﴿۱۴﴾ ”شہد کو کھاؤ، خدا کی قسم جس گھر میں شہد ہوگا، اس گھر کے فرشتے اس کیلئے استغفار کریں گے۔ اگر شہد کھائی جائے، تو اس کے جسم کو آگ نہیں چھوئے گی۔“^③

یہ تینوں روایتیں موضوع ہیں۔ محدثین نے ان کو موضوع سمجھ کر چھوڑا، اور چھانٹ دیا۔ یہ حفاظت حدیث کی دلیل ہے!

اب مرغ کے بارے میں موضوع روایت بیان کرتے ہیں:

پندرہویں حدیث:

﴿۱۵﴾ ”سفید مرغ یا میرا دوست ہے اور میرا دوست جبرائیل کا دوست ہے۔“^④

① یہ حدیث ”موضوع“ ہے۔ شعب الإیمان: ۹۹/۵، تاریخ بغداد: ۱۱۳/۳، (۱۱۲۲)، الموضوعات لابن الجوزي: ۱۶۳/۳ (۱۳۷۷)، لسان المیزان: ۲۱۴/۵، السلسلة الضعيفة (۶۶/۹)

② الفوائد المجموعة: ۱۸۲، كشف الخفاء (۲۶۰۳)

③ تاریخ جرجان: ۲۰۵، الموضوعات لابن الجوزي: ۱۶۵/۳، الفوائد المجموعة (۱۷۹)

④ الموضوعات لابن الجوزي: ۱۳۸/۳، تذكرة الموضوعات: ۱۵۳۔

﴿۱۶﴾ جو شخص سفید مرغا رکھے گا، وہ شیطان اور کابن کے شر سے محفوظ رہے گا۔“
(موضوع ہے) ^①

سولویں حدیث:

اس کے متعلق بھی ایک موضوع روایت لکھ کر، اس کا ذمہ دار حسبِ عادت ملا کو ٹھہرایا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

﴿۱۷﴾ ”نفقة الدرهم في سبيل الله بسبع مائة درهم و نفقة درهم في خضاب بسبعة آلاف“

کہ ”فی سبیل اللہ ایک درہم (خرچ کرنا) سات سو درہم کے برابر ہے، اور خضاب کا ایک درہم سات ہزار درہم کے برابر ہے۔“ ^②
اس کے بعد حسن پرستی کے متعلق لکھتے ہیں:

سترویں حدیث:

﴿۱۸﴾ ”النظر إلى المرأة الحسناء يزيد في البصر“
”خوش شکل عورت کی طرف دیکھنے سے نظر بڑھ جاتی ہے۔“ ^③

اٹھارویں حدیث:

﴿۱۹﴾ ”تمکین چہروں اور سیاہ آنکھوں سے محبت کرو، اللہ کسی طبع چہرے کو آگ سے

① الموضوعات لابن الجوزي: ۱۳۵/۳، تذكرة الموضوعات: ۱۵۳

② تذكرة الموضوعات: ۱۶۰

③ الموضوعات لابن الجوزي: ۲۵۲/۱، الفوائد المجموعة: ۲۱۷، ضعيف الجامع الصغير

عذاب نہیں کرے گا۔“^①

یہ دونوں حدیثیں موضوع ہیں۔ (تذکرہ)^②

اس باب میں موضوع حدیثیں بیان کرنے سے تو حفاظتِ حدیث کی تائید ہوتی ہے، پھر معلوم نہیں کہ مصنف کو ان کے لکھنے میں کیا مزا آتا ہے۔ شاید وہ ان حدیثوں پر مدت تک عمل درآمد کرتے رہے ہوں!

آگے آٹھواں سبب بیان کرتے ہیں:

ہشتم: حقائقِ حیات

”إن الورد من عرق النبي صلى الله عليه وسلم أو من عرق

البراق“ (موضوع۔ تذکرہ)^③

”گلاب کا پھول آنحضرت ﷺ کے سینہ سے یا براق کے سینہ سے ہے۔“

گندم کے متعلق:

”شرار أمتي يا كلون الحنطة“

”میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں، جو گندم کھاتے ہیں۔“^④

(موضوع، تذکرہ)

”ہر نبی پر وحی عربی میں آتی رہی، پھر وہ ترجمہ کر کے اپنی قوم کی زبان میں

① سوالات حمزة السهمي للدارقطني: ۲۱۱ (۲۸۴)، تاریخ بغداد: ۷/۳۸۲، الإرشاد

للخليلي: ۵۳۱/۲، الموضوعات لابن الجوزي: ۱/۲۴۹، لسان الميزان: ۶/۲۳۵، الفوائد

المجموعة: ۲۱۸، السلسلة الضعيفة: ۱/۲۵۶ (۱۳۱)

② تذكرة الموضوعات: ۱۶۲

③ كشف الخفاء (۷۹۸)، الدرر المنتشرة: ۵۰۹، الفوائد المجموعة: ۱۹۶، تذكرة

الموضوعات: ۱۶۱

④ تذكرة الموضوعات: ۱۵۱

ادا کرتا رہا۔“^①

جب محدثین نے ان احادیث کو چھانٹ دیا ہے، تو ان کا تعلق تحریف سے نہ ہوا، بلکہ حدیث کی حفاظت سے ہوا۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

سوال: ”بعض حضرات کہتے ہیں کہ تم صحیح اور غلط کی الجھن میں کیوں پڑے ہو، جو قرآن کے مطابق ہو لے لو، جو مخالف ہو، رد کر دو۔“

جواب: ”جو مخالف ہے، وہ ہر طبقہ کے ہاں مردود ہے۔ اور جو قرآن کے موافق ہے، اس کی ضرورت ہی نہیں۔“ (دوا سلام: ۱۵۸)

جواب

احادیث تین قسم پر ہیں:

اول: مخالف۔

دوم: وہ جو قرآن کی تفسیر اور بیان ہیں۔

سوم: وہ جو قرآن ہی کا مضمون بیان کرتی ہیں۔

دوسری قسم کی تو ضرورت ہے، جیسا کہ نماز کے بارہ میں آپ نے بھی اقرار فرمایا ہے۔ اور جو حدیث قرآن کے مضمون ہی کو بیان کرتی ہے، اگرچہ اس مسئلہ مذکور کے ثابت کرنے کیلئے اس کی ضرورت نہیں، مگر بعض وقت قرآن اور حدیث کے بیان میں اطلاق و تنقید وغیرہ کا فرق ہوتا ہے، جس سے بعض نکات مفید مطلب ہوتے ہیں۔

① الموضوعات لابن الجوزي: ۱/۱۵۹، امام سیوطی نے تعاقب کرتے ہوئے، اس حدیث کو موضوع کی بجائے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ (اللائل المصنوعة: ۱/۱۱) نیز دیکھیں: تذکرۃ

الموضوعات: ۱۱۳

اس سے آگے جو کہا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ کسی حدیث کا قرآن کے موافق ہونا اس کی صحت کی دلیل نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا، جو حدیث قرآن کے موافق ہو، وہ صحیح ہو۔ حالانکہ بہت سی احادیث ایسی ہیں، جن کا مضمون قرآن سے ملتا ہے، مگر علماء نے ان کو اس بناء پر موضوع قرار دیا ہے کہ یہ آنحضرت (ﷺ) کی بیان کردہ نہیں۔

چند موضوع احادیث:

اس کے بعد مندرجہ ذیل حدیثیں لکھی ہیں:

حدیث کس نے وضعی قرار دی حوالہ

① ”الإيمان عقد بالقلب و ابن جوزی تذكرة ①

إقرار باللسان

ایمان دل سے تصدیق اور زبان

سے اقرار کا نام ہے۔

② ”طلب العلم فريضة على ابن راهويه، بخاری، تذكرة ②

كل مسلم أبو علي نيشا پوری،

علم کی تلاش ہر مسلمان پر فرض ہے۔ بیہقی

① سنن ابن ماجہ: باب في الإيمان ، رقم الحديث (٦٥) اس کی سند میں ”عبد السلام بن

صالح أبو الصلت الحصري“ ہے، جس نے یہ حدیث وضع کی ہے، جیسا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے

فرمایا ہے۔ (تہذیب الکمال: ۸۱/۱۸، الكشف الحثیث (۱۶۷) نیز دیکھیں: الموضوعات

لابن الجوزي: ۱۸۵/۱، تذكرة الموضوعات: ۱۱

② سنن ابن ماجہ: باب فضل العلماء، رقم الحديث (۲۲۴)، المعجم الكبير: ۱۰/۱۹۵، ←

❖ ”اطلبوا العلم ولو بالصين“ ابن عدی، ابن جوزی، تذکرہ^①

”تلاش علم میں چین تک جاؤ۔“ سیوطی، ابن حبان

❖ ”من عرف نفسه عرف ربه“ ابن تیمیہ، تذکرہ^②

جو اپنے آپ کو پہچان لے، اس

نے اپنے رب کو پہچانا۔

← المعجم الأوسط: ۷/۱، المعجم الصغير: ۳۶، مسند أبي يعلى: ۲۲۳/۵، ۲۸۳/۵،

۹۶/۷، مسند البزار: ۱۷۲/۱، شعب الإيمان: ۲۵۳/۲، الفوائد للرازي: ۳۲/۱، یہ حدیث کئی

اسانید کے ساتھ مروی ہے، امام سیوطی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے پچاس طرق جمع کیے ہیں۔

امام مزی، ذہبی، زرکشی، سیوطی، سخاوی، البانی اور دیگر اہل علم علیہ السلام نے اس حدیث کو صحیح اور حسن قرار

دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: المقاصد الحسنة: ۴۴۰، (۶۶۰)، الدرر المنتثرة: ۲۹۹،

كشف الخفاء: (۱۶۶۵)، تدریب الراوي: ۱۷۴/۲، تخریج أحادیث مشكلة الفقر: ۴۸،

(۸۶)، السلسلة الضعيفة: ۶۰۴/۱

تنبیہ: امام سخاوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے آخر میں بعض لوگ ”ومسلمة“ کا اضافہ

کردیتے ہیں، جب کہ کسی بھی سند میں یہ الفاظ وارد نہیں ہیں۔ (المقاصد الحسنة: ۶۶۲) نیز کسی

امام نے اس حدیث کو موضوع قرار نہیں دیا، بلکہ امام احمد، بیہقی، ابن راہویہ اور ابوعلی نیشاپوری نے

یہ کہا ہے کہ اس کی اسانید ضعیف ہیں، اور امام سخاوی کے نزدیک یہ حدیث مقبول ہے۔ لہذا ان کی

طرف تضعیف کی نسبت غلط ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

① مسند البزار: ۱۷۵/۱، المعجروحين: ۳۸۲/۱، الكامل في الضعفاء: ۱۱۸/۴، ضعفاء،

العقيلي: ۲۳۰/۲، الموضوعات لابن الجوزي: ۳۴۷/۱، لسان الميزان: ۱۹۳/۱، ۳۰۴/۶،

الدرر المنتثرة: ۹۰، تذكرة الموضوعات: ۱۷، السلسلة الضعيفة: ۶۰۰/۱۔

② الدرر المنتثرة: ۴۱۷، كشف الخفاء (۲۵۳۲)، المقاصد الحسنة: ۶۵۷ (۱۱۴۹)، تذكرة

الموضوعات: ۱۱، السلسلة الضعيفة: ۱۶۵/۱ (۶۶)

①

تذکرہ

سیوطی

”من سر المؤمن فقد سر الله“

جس نے کسی مومن کو خوش کیا، اس

نے اللہ کو خوش کیا۔

آئمہ فن کی تصانیف میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، حدیث کا مضمون درست ہے، تعلیم قرآن کے عین مطابق ہے اور پھر بھی غلط! اب فرمائیے حدیث کو جانچنے کے لئے پیمانہ کہاں سے لائیں؟“ (دوا سلام: ۱۶۱)

حدیث کو جانچنے کا پیمانہ وہی ہے، جو محدثین نے بیان کیا ہے اور اسی پیمانہ کے ساتھ حدیث کو پرکھا جاسکتا ہے، اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ حدیثیں قرآن کی کن آیات کے مطابق ہیں، صرف دعویٰ ہی دعویٰ!!



① المجروحین: ۲۱۶/۱، العلل المتناهية: ۵۱۴/۲، لسان المیزان: ۱۰۶/۲، الكشف المحیث: ۸۴، الفوائد المجموعة: ۵۰۲، تذکرہ الموضوعات: ۱۴۔

ساتواں باب

”موطأ پر ایک نظر“

پہلا اعتراض:

”امام مالک بن انس (۹۳ھ - ۱۷۹ھ) نے جب پہلی مرتبہ موطأ کو مدون کیا، تو اس میں دس ہزار احادیث درج کیں، بعد میں اس پر نظر ثانی کی، تو آٹھ ہزار سات سو اسی احادیث مشکوک نظر آئیں اور انہیں نکال دیا۔ صرف ایک ہزار سات سو بیس رہے دیں۔ انہوں نے انتخاب احادیث کیلئے کون سا معیار استعمال کیا، ہم نہیں جانتے۔ اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ امام مالک کا کردار تمام شبہات سے ورا تر تھا اور انہوں نے صحیح کو غلط سے جدا کرنے کیلئے تمام انسانی ذرائع استعمال کئے ہوں گے۔ لیکن پونے دس سو برس کا عرصہ گزر چکا تھا، احادیث بڑھتے بڑھتے اور بگڑتے بگڑتے کیا سے کیا بن چکی تھیں، اس ذخیرہ سے قول رسول کو تلاش کرنا، اگر ناممکن نہیں، تو دشوار ضرور تھا۔

ہم ”موطأ“ کی تعظیم ضرور کرتے ہیں، لیکن وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے مندرجات واقعی اقوال رسول ہیں اور خصوصاً ان حالات میں کہ اس کی بعض روایات محل نظر ہیں۔ مثلاً موطأ میں درج ہے کہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے وضو ضروری ہے اور ”إذا قمتم

إلى الصلوة“ کی تفسیر ”أي من المضاجع“ یعنی ”النوم“ دی ہوئی ہے۔^① لیکن صحیح بخاری^② کتاب الوضوء میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ حدیث دی ہوئی ہے کہ رسول اکرم ﷺ رات کو جاگے، صلوٰۃ تہجد ادا کی۔

”ثم اضطجع فنام حتى نفخ ثم أناه المنادي فقام إلى الصلوة فصلی ولم يتوضأ“

”پھر بستر پر دراز ہو گئے، پھر سو گئے، یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ اس کے بعد نماز کیلئے بلانے والا آیا، آپ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیئے اور وضو کے بغیر نماز پڑھ لی۔“ (دو اسلام: ۱۶۳)

جواب:

مصنف کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”موطا“ میں جو قرآن کی تفسیر نیند سے اٹھنے کے ساتھ کی گئی ہے، درست نہیں۔ کیونکہ بخاری کی روایت کے خلاف ہے۔ اس اعتراض پر بچہ وجہ کلام ہے۔
(۱) یہ کہ امام مالک نے نیند سے وضو نہ ٹوٹنے کو آنحضرت ﷺ کی خصوصیت قرار دیا ہوگا۔

(۲) یہ کہ امام مالک کے نزدیک بھی مطلق نیند ناقض نہیں، بلکہ وہ نیند ہے، جو استرخاءِ مفصل کا باعث ہو۔ اور انبیاء علیہم السلام کی نیند چونکہ مستغرق نہیں ہوتی، جیسا

① صحیح البخاری: کتاب صفة الوضوء، باب وضوء الصبيان..... رقم الحديث (۸۲۱)

② الموطا: ۲۱/۱ (۳۹)، یہ زید بن اسلم تابعی کا قول ہے۔ امام مالک نے مرفوع حدیث سے تفسیر نقل نہیں کی۔ کسی تابعی کا قول مرفوع حدیث کے خلاف پیش نہیں کیا جاسکتا!

کہ حدیث میں ہے: ”تنام عينه ولا ينام قلبه“ (بخاری)^①
 ”آپ کی نیند آنکھ بند کرنے تک ہوتی تھی، اس میں دل پر اثر نہیں ہوتا تھا۔“
 سو: یہ اعتراض بخاری کی حدیث کی وجہ سے ہوا، نہ کہ قرآن کی کسی دوسری آیت
 سے۔

دوسرا اعتراض:

اس کے بعد چند اور احادیث بیان کی ہیں:

”من قبل امرأته أو مسها بيده فعليه الوضوء“^②
 ”جو اپنی بیوی کو بوسہ دے، یا ہاتھ سے چھوئے، تو اس پر وضو ہے۔“
 (موطا: ۳۳)

لیکن اسی صفحہ پر ہے:

”عن عائشة أن النبي قبل بعض نسائه ثم خرج إلى الصلوة
 ولم يتوضأ“^③

- ① صحيح البخاري: كتاب التوحيد: باب قوله ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا﴾ رقم الحديث (۷۰۷۹)
- ② الموطا: ۴۳/۱ (۹۵) یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔
- ③ سنن أبي داود: كتاب الطهارة، باب الوضوء من الطهارة، باب ما جاء في ترك الوضوء من القبلة، رقم الحديث (۸۶)، سنن ابن ماجه: كتاب الطهارة، باب الوضوء من القبلة، رقم الحديث (۵۰۲) سنن النسائي: كتاب الطهارة، باب ترك الوضوء من القبلة (۱۷۰) مسند أحمد: ۲۱۰/۶ (۲۵۸۰۷)، سنن الدارقطني: ۱۳۷/۱، سنن البيهقي: ۱۲۵/۱، المعجم الأوسط: ۶۶/۵، مصنف ابن أبي شيبة: ۴۸/۱، مسند إسحاق بن راهويه: ۹۹/۲ (۵۶۶)، یہ حدیث ”صحیح“ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: نصب الراية: ۸۲/۱، التلخیص الحبر: ۱۳۶/۳، الجوهر النقي: ۱۲۴/۱، إنجاز الحاجة شرح سنن ابن ماجه: ۶۲۸/۲، تنبيه: برق صاحب کا کہنا کہ ”لیکن اسی صفحہ پر ہے“ درست نہیں، کیونکہ حدیث عائشہ ”موطا“ میں نہیں ہے۔

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک بیوی کا بوسہ لیا، پھر نماز کیلئے نکلے اور وضو نہ کیا۔“
حضور کا حکم وہ اور عمل یہ!“ (دو اسلام: ۱۶۳)

جواب:

مگر مصنف نے ”موطا“ کو اچھی طرح نہیں دیکھا، وضو ٹوٹنے کا جس میں ذکر ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کا حکم نہیں، بلکہ صحابی کا قول ہے، یہاں پہلا جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ امت کے لئے وضوء.....^①

تیسرا اعتراض: قرآن میں رد و بدل

”لو لا أن يقول الناس زاد عمر في كتاب الله لكتبها الشيخ والشيخة إذا زنيا فارجموهما فإنا قد قرأناها“ (موطا)^②
”اگر پڑھتے رہے، تو نکالی کس نے؟ اور اگر نکال دی گئی تھی، تو اللہ کا وعدہ حفاظت قرآن کیا ہوا۔ اس موضوع پر ایک حدیث ”بخاری“ میں بھی موجود ہے:

”عن عمر بن الخطاب قال: إن الله بعث محمداً صلى الله عليه وسلم وأنزل عليه الكتاب فكان فيما أنزل آية الرجم“^③

① یعنی امت کے لیے وضوء کا حکم ہے اور عدم وضوء کو رسول اکرم ﷺ کا خاصہ قرار دیا جائے۔

② الموطا: ۸۲/۲ (۱۵۰۶)

③ صحيح البخاري: كتاب الاعتصام، باب ما ذكر النبي ﷺ وحض علي اتفاق أهل العلم،

رقم الحديث (۶۸۹۲)

”عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا اور اس پر ایک کتاب نازل کی، جس میں ”آیت رجم“ بھی موجود تھی۔“
یعنی امام بخاری نے بھی یہ تسلیم کر لیا کہ قرآن میں آیت رجم موجود تھی،
لیکن یہ نہیں بتایا وہ کہاں گئی؟“ (دوا سلام: ۱۶۹)

جواب:

”مؤطا“ کی روایت کا ایک مطلب ہے کہ یہ حکم آنحضرت ﷺ نے نافذ کیا اور ہم نے بھی پڑھا۔ یعنی یہ حکم بہت اہم ہے، جس کا آپ نے عام اعلان کیا تھا اور اس پر عمل کیا، مگر یہ حکم چونکہ قرآن میں صاف طور پر مذکور نہیں، بلکہ اس سے مستنبط ہے۔ یعنی سورۃ مائدہ ”آیت محاربہ“ سے یہ حکم نکلتا ہے۔ اگر میں اس کو قرآن کے ساتھ لکھ دوں، تو لوگ کہیں گے کہ عمر (رضی اللہ عنہ) نے اللہ کی کتاب میں اضافہ کر دیا ہے، اس لئے میں نہیں لکھتا، اگر یہ خطرہ نہ ہوتا، بلکہ لوگ اس حکم کو بدستور قرآن سے مستنبط ہی سمجھتے رہتے، تو اس کو قرآن مجید کے کنارے پہ لکھ دیتا۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن کی آیت ہے، مگر میں ہی اس کو قرآن کی آیت سمجھتا ہوں۔ دوسرا کوئی شخص بھی میرے ساتھ اس کو قرآن کی آیت خیال نہیں کرتا، اگر میں اپنے خیال کے مطابق اس کو قرآن میں لکھ دوں، تو لوگ کہیں گے کہ عمر نے کتاب میں اضافہ کر دیا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس حکم کے متعلق غلط فہمی ہوئی، وہ غلطی سے اس کو قرآن کی آیت سمجھتے تھے۔ دوسرا کوئی آدمی بھی آپ کے ساتھ اس بات میں شریک نہ تھا۔ دوسرے تمام صحابہ اس کے خلاف تھے۔ لہذا انہی کی بات درست ہونی چاہئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگرچہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، لیکن معصوم صرف پیغمبر

کی ذات ہوتی ہے۔ ”بخاری“ کی حدیث میں بھی یہی توجیہ ہے۔ پہلی توجیہ کی رو سے ”آیت رجم“ کے معنی حکم رجم کے ہوں گے اور کتاب سے مراد ”حکم“ ہوگا۔ یا کتاب سے مراد قرآن اور آیت سے مراد وہ آیت جس سے یہ حکم مستنبط ہوتا ہے، پس قرآن مجید میں رد و بدل کا خیال باطل ہو گیا۔

چوتھا اعتراض:

آگے ایک قرأت لکھی ہے، جو آج کل مروج نہیں۔ اس سے بھی یہی سمجھا ہے کہ اس سے قرآن میں رد و بدل ہو گیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

”ابوالدرداء نے علقمہ سے پوچھا کہ حضرت عبداللہ ”واللیل“ کی تلاوت کس طرح کرتے ہیں؟ تو علقمہ بولے: اس طرح:

”واللیل إذا يغشى^۱ والذكر والأنثى“

”آپ نے فرمایا: خدا کی قسم میں نے رسول اللہ سے یہ آیات اسی طرح

سنی ہیں اور میں اسی طرح پڑھوں گا۔“ (صحیح مسلم: ۳۶۲/۲)^۱

تو گویا تین جلیل القدر صحابہ نے شہادت دی کہ یہ آیات مذکورہ صورت میں نازل ہوئی تھیں، لیکن آج قرآن شریف میں یوں درج ہے:

﴿واللیل إذا يغشى^۲ والنهار إذا تجلی^۱ وما خلق الذکر والأنثى^۲﴾

اب کس کو صحیح تسلیم کریں، ان صحابہ کو یا صحیح مسلم کو یا قرآن شریف کو؟ لازماً یہی کہنا پڑے گا کہ ہمارا قرآن صحیح ہے اور یہ حدیث غلط ہے۔“

① صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرين، باب ما يتعلق بالقراءات، رقم الحدیث (۸۲۴)

② اللیل: ۱-۳

جواب:

”مؤطا“ کا ذکر کرتے کرتے ”صحیح مسلم“ تک پہنچ گئے، حدیث غلط نہیں، بلکہ آپ کے فہم کی غلطی ہے۔ آج کل قرآن مجید میں ﴿وما خلق الذکر والأنثی﴾ ہے۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ”ما“ مصدر یہ ہو اور دوسرا یہ کہ ”ما“ موصولہ ہو۔ عبداللہ کی قرأت سے اس کے مصدر یہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے یہ پڑھا۔ قرآن تو دراصل یہی ہے، جو ہمارے پاس ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے تفسیر کی قرأت سنی، تو اسی طرح یاد کر لیا۔ اس قسم کی غلطیاں آدمی سے ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود ”معوذتین“ کو قرآن میں داخل نہیں کرتے تھے، ^① اور ”فاتحہ“ کو مصحف سے کھرچ دیا کرتے تھے۔ ^② ان کا یہ خیال تھا کہ فاتحہ کا کوئی مقام متعین نہیں، اس لئے مصحف میں لکھنا نہیں چاہئے۔ اور معوذتین کا نزول دم جھاڑ کیلئے ہے، اس واسطے ان کو بطور قرأت نہیں پڑھنا چاہئے۔ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت واصل اس طرح ہے: ”واللیل إذا یغشی، والنہار إذا تجلی، والذکر والأنثی“ جیسے ترمذی ۱۱۷/۲ میں ہے۔ آپ کا مسلم کا حوالہ تو ملا نہیں، ^③ صرف ہماری قرأت اور عبداللہ کی قرأت میں ”وما خلق“ کے ذکر اور

① مسند أحمد: ۱۲۹/۵، نیز دیکھیں: المعجم الكبير: ۲۳۴/۹، ۲۳۵، مسند البزار: ۲۹/۵،

فتح الباری: ۷۴۲/۸، الإنقان: ۲۱۲/۱۔

② الإنقان: ۱۷۸/۱، فتح البیان: ۳۳/۱۔ امام سیوطی نے اس کی سند کو ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

③ صحیح مسلم کا حوالہ گزشتہ صفحہ پر گزر چکا ہے، امام مسلم نے مختلف طرق کے ساتھ عبداللہ بن مسعود کی یہ دونوں قراءات نقل کی ہیں، اور امام ترمذی نے بھی یہی دونوں قراءات نقل کی ہیں۔ دیکھیں: سنن

الترمذی (۲۹۳۹) نیز دیکھیں: صحیح البخاری: ۳۵۳۲

حذف کا فرق ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بھی ایک قرأت ہو۔^①
 پھر تین جلیل القدر صحابی کی بھی خوب کہی! ابوالدرداء اور عبداللہ تو صحابی ہیں، مگر
 علقمہ متنازع فیہ۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ صحابی نہیں،^② اگر ہوں بھی تو جلیل القدر نہیں۔
 بہر حال عبداللہ کے شاگرد ہیں، گواصل صرف دو ہوئے۔

پانچواں اعتراض:

اس کے بعد ذکر کیا ہے:

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو لوگ ”بیر معونہ“ میں شہید ہو گئے
 تھے، ان کے متعلق مندرجہ ذیل آیت اتری تھی، جو بعد میں منسوخ ہو گئی:

”بَلِّغُوا قَوْمَنَا أَنْ قَدْ لَقِينَا رَبَّنَا فِرَضِي عَنَا وَرَضِينَا عَنْهُ“

”ہماری قوم سے کہہ دو کہ ہم اللہ سے ملے، وہ ہم سے راضی ہوا اور ہم

اس سے راضی ہوئے۔“ (بخاری و مسلم)^③

اگر یہ آیت واقعی نازل ہوئی تھی، تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کیلئے اس کا

باقی رہنا ضروری تھا۔“ (دوا سلام: ۱۷۰)

① اکثر مفسرین نے ان الفاظ کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت کے طور پر نقل کیا ہے۔ دیکھیں:

تفسیر الطبري: ۶۰۹/۱۲، تفسیر البغوي: ۴۴۵/۱، تفسیر ابن کثیر: ۶۶۸/۴، تفسیر

القرطبي: ۷۳/۲۰، فتح القدیر: ۶۰۴/۵

② علقمہ بن قیس تابعی ہے۔ انھوں نے حضور ﷺ کا زمانہ تو پایا ہے، لیکن آپ ﷺ کے دیدار سے

مشرّف نہیں ہوئے، ایسے تابعی کو ”مخضرم“ کہا جاتا ہے۔ دیکھیں: الإصابة: ۱۳۶/۵۔

③ صحیح البخاري: کتاب الجہاد والسير، باب فضل قول اللہ تعالیٰ ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ

قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا﴾، رقم الحديث (۲۶۵۹)، صحیح مسلم: کتاب المساجد،

باب استحباب القنوت في جميع الصلاة إذا نزلت بالمسلمين نازلة، رقم الحديث (۱۷۷)

جواب:

یہ مذکورہ الفاظ تواتر سے تھے، مگر ان کے قرآن ہونے کا آنحضرت ﷺ سے کوئی ثبوت نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے جب وحی کے ذریعہ اطلاع پا کر یہ الفاظ سنائے، تو ہو سکتا ہے کہ راوی نے قرآن سمجھ لیا ہو۔ اور ہو سکتا ہے ان الفاظ کو اس لئے منسوخ کر دیا ہو کہ اس کا عوض قرآن میں موجود ہے۔ یعنی آیت:

﴿بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝ فَرِحِينَ.....﴾^①

”اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو اپنے رب کے پاس سے رزق ملتا ہے، خوش ہیں۔“

قرآن مجید میں ہے:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا.....﴾^②

”اگر ہم کوئی آیت منسوخ کر دیں، تو اس سے بہتر یا اسی قسم کی آیت اور لے آتے ہیں۔“

چھٹا اعتراض:

اسی نوعیت کی ایک اور حدیث اس کے بعد پیش کی ہے:

”عن البراء بن عازب قال نزلت هذه الآية: حافظوا على الصلوات وصلوة العصر فقرأناها ما شاء الله ثم نسخها الله فنزلت حافظوا على الصلوات والصلوة“

● آل عمران: ۱۶۹-۱۷۰۔

● البقرة: ۱۰۶۔

①

الوسطیٰ“ (صحیح مسلم: ۲/۲۰۵)

براء بن عازب سے روایت ہے کہ پہلے یہ آیت اتری۔ ”حافظوا علی الصلوات و صلوة العصر“ ہم کچھ عرصہ تک اسے پڑھتے رہے، پھر منسوخ ہو گئی، اور اس کی جگہ یہ نازل ہوئی۔“ (دو اسلام: ۱۷۲)

جواب:

اس کے متعلق بھی وہی جواب ہے، جو پہلے دیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ”صلوة العصر“ کا لفظ بطور تفسیر بولا۔ راوی نے یہ سمجھا کہ شاید اسی طرح یہ آیت اتری۔ پھر جب اس کے بعد سننے کا اتفاق ہوا، تو جیسے اصل آیت تھی، ویسے ہی سنی، تو یہ سمجھا کہ شاید اب یہ آیت اتری ہے اور پہلی منسوخ ہو گئی ہے۔ دوسرا جواب وہی ہے، جو پہلے بیان ہوا۔

ساتواں اعتراض:

آگے لکھتے ہیں:

”گوشت میں غذائیت بہت زیادہ ہے۔ قرآن نے بھی گوشت خوری کو بطور انعام بیان کیا ہے۔ ﴿وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ﴾ ② انہیں انسان کھاتا بھی ہے، سرورِ دو عالم ﷺ اور صحابہ کرام گوشت کو ایک نعمت سمجھ کر کھایا کرتے تھے۔ لیکن ”مؤطا“ کی ایک حدیث ہمیں گوشت جیسی نعمت سے اجتناب کا حکم دیتی ہے۔

”عن عمر بن الخطاب قال: إياكم واللحم فان له ضراوة

① صحیح مسلم: کتاب المساجد، باب الدلیل لمن قال الصلاة الوسطی می صلاة العصر،

رقم الحدیث (۶۳۰)

② النحل: ۵

کضراوة الخمر^①

”عمر فاروق فرماتے ہیں: ”گوشت سے بچو، اس لئے کہ شراب کی طرح اس کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔“
 ”اگر ایک اچھی چیز کی عادت پڑ جائے، تو حرج کیا ہے؟“

(دو اسلام: ۱۷۴)

جواب:

یہ حدیث مرفوع نہیں، بلکہ موقوف ہے۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور مرفوع کے مقابل موقوف حجت نہیں ہوتی۔ اس واسطے یہ حدیث آپ سے گوشت نہیں چھڑا سکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہ مطلب نہ تھا کہ بالکل گوشت نہ کھاؤ، بلکہ مطلب یہ تھا کہ اس کی عادت نہ ڈالو، کیونکہ جس کو گوشت کھانے کی عادت پڑ جائے، وہ سبزی

① الموطا: ۹۳۵/۲ (۱۶۷۳) اس کی سند منقطع ہے۔ یحییٰ بن سعید کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہے۔ لیکن دوسری اسانید کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ قول ثابت ہے۔ دیکھیں: مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۴۱/۵ (۲۴۵۳۰)، إصلاح العمال لابن ابی الدنیا: ۱۰۸ (۳۷۴) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کا مطلب ہے کہ گوشت کو کثرت سے استعمال نہ کرو اور اس پہ مداومت نہ کرو، کیونکہ حضرت عمر کے الفاظ یہ بھی ہیں: ”لا تدموا أكل اللحم“ ”ہمیشہ صرف گوشت نہ کھایا کرو“ جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گوشت کی کثرت سے اجتناب کا مقصد سہل پسندی سے روکنا ہے، جو مؤمنانہ اور مجاہدانہ شان کے منافی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا الفاظ ”لہ ضراوة کضراوة الخمر“ سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں: ”إياكم واللحم أي الإكثار منه فإن له ضراوة، قال الباجي: يريد عادة يدعوا إليها ويشق تركها لمن ألفها و يقال ضرى بالشبي إذا لهج به“ (تنوير الحوالك: ۱/۲۲۷) اسی طرح امام مناوی لکھتے ہیں: و منه قول عمر إن للحم ضراوة. كضراوة الخمر أي من اعتاده لا يصبر عنه كمن لا يصبر عن الخمر معتادها“ (فيض القدير: ۸۱/۶) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ قول مروی ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۴۲/۵ (۲۴۵۳۱))

ترکاری کو پسند نہیں کرتا، بلکہ اس کو گوشت کے سوا دوسری دال ترکاری ہضم ہی نہیں ہوتی۔ پس وہ گوشت کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور مجاہد کیلئے موزوں نہیں کہ اپنے آپ کو ایک خاص خوراک کا پابند بنائے۔ خود حضرت عمر گوشت کھاتے اور کھلاتے تھے۔ جس کا ایک واقعہ ”موطا“ میں بھی ہے، پس آپ کو چاہئے کہ دونوں کو ملا کر مطلب اخذ کریں۔



آٹھواں باب:

صحیح بخاری پر ایک نظر

پہلا اعتراض:

”اس میں کلام نہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۸۷۰ء) نے صحیح احادیث کی تلاش میں لمبے لمبے سفر کئے، ہر حدیث کو پرکھنے کیلئے تمام امکانی وسائل اختیار فرمائے۔ استخارے کئے، کعبہ میں جا کر دعائیں مانگیں کہ اے اللہ! مجھے صحیح و غلط میں امتیاز کی توفیق عطا فرما۔ راویوں کا کھوج لگایا، ہر قابل ذکر محدث سے مشورہ کیا اور سالہا سال کی مسلسل جستجو و تگاپو کے بعد اپنا مجموعہ تیار کیا۔ لیکن اس قدر محنت و احتیاط کے باوجود اس مجموعہ میں چند ایسی احادیث موجود ہیں، جو یا تو تعلیم قرآن سے متصادم ہوتی ہیں یا آپس میں ٹکراتی ہیں یا مسلمانوں کو بیکار، اپانچ اور بے عمل بناتی ہیں اور یا ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی ازواج مطہرات کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے لئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو ہم ”صحیح بخاری“ کے ہر لفظ کی حفاظت کریں اور قرآن و رسول پر جو گذرتی ہے، گزرنے دیں اور یا قرآن کو مقدم رکھتے ہوئے صرف ان احادیث کو قابل اعتناء سمجھیں، جو عیوب بالا سے پاک ہوں۔ ہم بخاری کی محنت و تلاش کی داد دیتے ہیں، اور انہیں بے حد قابل احترام سمجھتے ہیں۔ لیکن کیا کریں کہ حضور پر نور کی ذات والا صفات سے ہمیں اس قدر عقیدت و

محبت ہے کہ ہم ان کی شان میں کوئی ہلکی سی جسارت بھی برادشت نہیں کر سکتے۔

امام بخاری کی زیادہ تر نظر اسناد پر رہی۔ انہیں جس حدیث کے وضعی ہونے پر کوئی شہادت نہ مل سکی، اسے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا۔ لیکن صفحات گذشتہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ احادیث کا کیا حال ہو چکا تھا، راویوں کے حالات کس بے احتیاطی سے قلمبند کئے گئے۔

رسول اکرم ﷺ بحیثیت نبی تیس برس زندہ رہے، اس لمبی مدت میں یقیناً آپ نے قرآن کے علاوہ بھی کوئی ارشاد فرمایا ہوگا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چودہ لاکھ حدیث کے طومار پریشان میں سے کوئی اقوال رسول کیسے ڈھونڈے؟

اس کے بعد بخاری پر ایک ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں۔

جواب:

قبل اس کے کہ ہم ان کے اعتراضات نقل کر کے جواب دیں، مناسب معلوم ہوتا ہے، ان کی اس تحریر کے قابل اعتراض پہلو کی طرف توجہ دلائیں:

اول: جو آپ نے یہ لکھا ہے کہ ”امام بخاری کی نظر زیادہ تر اسناد پر تھی“ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہیں، جو حضور والا صفات ﷺ کی تنقیص کا مواد جمع کرے یا آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی شان میں کوئی ایسی بات لکھے، جس سے ان کی توہین کا پہلو نکلتا ہو یا مسلمانوں کو اپاج بنانے کیلئے اپنی عمر گراں مایہ کو خرچ کرے یا قرآن کے خلاف حدیثیں جمع کرنا شروع کرے یا عقل کے خلاف باتیں لکھ کر اپنے مذہب کو کمزور بنائے۔ یہ کام تو زندیقوں کا ہے یا ان لوگوں کا جو عقل و علم میں بہت کم مقام رکھتے ہوں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی

عقل کے موافق ایک حدیث کو قرآن کی مخالفت یا دوسرے عیوب سے مبرا سمجھے اور دوسرا اس کے خلاف ہو۔ مگر کسی قابل احترام ہستی کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ دیدہ دانستہ ایسا کرتا ہے یا احادیث جمع کرنے میں اس قدر لاپرواہی کا شکار ہوتا ہے کہ رسول ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کا احترام یا قرآن کی مخالفت و موافقت بھی اس کیلئے بے معنی ہو کر رہ جائے۔ باوجود اس کے کہ وہ کعبہ میں جا کر خدا سے صحیح و غلط میں امتیاز کی توفیق کی دعائیں مانگتا ہو، اس کے لئے دور دراز کے لمبے سفر کرتا ہو، راویوں کے کھوج لگاتا ہو، استخارے کرتا اور عمر عزیز کے سالہا سال اس جستجو و نگاہ میں صرف کر ڈالتا ہو کہ اس کے مجموعہ میں کوئی غلط بات شامل نہ ہو جائے۔

پس مذکورہ اعتراضات کے دو ہی مقام ہیں کہ یا تو اعتراضات غلط ہیں یا جس کی جمع کردہ احادیث پر اعتراض ہے، وہ کوئی عقلمند شخص نہیں اور اس دوسری بات کو تسلیم کرنے کیلئے دوسرے تو الگ رہے، شاید معترض بھی تیار نہ ہو!

دوم: آپ نے یہ جو لکھا ہے کہ ”احادیث کا کیا حال ہوا، یا راویوں کے حالات کس بے احتیاطی سے قلمبند کئے گئے“ واقعہ کے خلاف ہے اور اس امر کی دلیل ہے کہ واقعات کا گہری نظر سے جائزہ نہیں لیا گیا۔

سوم: یہ کہا ہے کہ ”چودہ لاکھ حدیثوں کے طومار پریشان میں سے اقوال رسول کو کون ڈھونڈے“ بالکل لغو ہے، کیونکہ محدثین نے اقوال رسول ﷺ کو حسن و صحت کے ساتھ جمع کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اور امت نے ان کی خدمت کو قبول کیا اور ان کے ساتھ موافقت کی ہے، اس لئے اب آپ کو سردردی کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اعتراض:

اب ان کے اعتراضات سنئے:

ایک پیشین گوئی

۶۲۰ھ کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خسرو پرویز شاہ ایران (۵۹۰ء - ۶۲۸ء) اور ہرقل قیصر روم (۶۱۰ء - ۶۳۱ء) کی طرف خطوط بھیجے اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ ہرقل نے قاصد رسول ﷺ کی بڑی تعظیم کی، لیکن کسریٰ شاہ ایران نے خط پھاڑ دیا اور قاصد کو ڈانٹ ڈپٹ کر دربار سے نکال دیا۔ جب حضور کو اس سلوک کی اطلاع ملی، تو آپ نے ایک پیش گوئی کی۔ قیصر کے حسن سلوک اور کسریٰ کی بدتمیزی کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضور صرف نسل کسریٰ کے خاتمہ کی پیشین گوئی فرماتے اور ہرقل کے لئے اسی طرح محبت کا اظہار کرتے، جس طرح وہ نجاشی سے کیا کرتے تھے، لیکن جو پیشین گوئی بخاری میں موجود ہے، وہ ہماری اس تمنا کو پوری نہیں کرتی:

”عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال إذا هلك كسرى فلا كسرى بعده وإذا هلك قيصر فلا قيصر بعده“^① (بخاري)

”ابو ہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: کسریٰ کے تباہ ہونے کے بعد کوئی کسریٰ نہیں اور قیصر کے ہلاک ہونے کے بعد کوئی قیصر نہیں۔“

کسریٰ کے متعلق یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، آنحضرت ﷺ کی رحلت کے صرف دس برس بعد ۶۳۲ء میں جنگ نہاوند نے ساسانی

① صحیح البخاری: کتاب الخمس، باب قول النبی ﷺ أحلت لكم الغنائم، رقم الحدیث

(۲۹۵۲)، صحیح مسلم: کتاب الفتن، باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل،

رقم الحدیث (۲۹۱۹)

خاندان کو ہمیشہ کیلئے مٹا دیا۔ کچھ عرصہ بعد آخری کسریٰ (یزد گرد) قتل ہو گیا اور اس کے بعد آج تک کوئی کسریٰ پیدا نہ ہوا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ قیصر کے متعلق بھی یہ پیش گوئی اسی طرح پوری ہوتی، لیکن اے کاش کہ ایسا نہ ہوا، بلکہ یہ خاندان اس پیش گوئی کے بعد آٹھ سو تیس برس تک زندہ رہا۔“ (دو اسلام: ۱۷۹)

جواب:

اس عبارت کی چند باتیں قابلِ غور ہیں:

① اس پیشین گوئی کا مقابلہ کسریٰ اور قیصر کے اس سلوک سے کیا گیا ہے، جو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے قاصد سے کیا۔ سلوک چونکہ مختلف تھا، پیش گوئی بھی مختلف ہونی چاہئے تھی۔

② قیصر سے مراد وہ نسلی بادشاہ ہے، جس کا سلسلہ ۳۳۰ء سے شروع ہوتا ہے اور جو ۱۴۵۳ء تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ سلطان محمد ثانی (۱۴۵۱ء - ۱۴۸۱ء) فاتح قسطنطنیہ نے اس سلسلہ کو ۱۴۵۳ء میں ختم کیا۔

پہلی بات کے متعلق یہ عرض ہے کہ یہ پیش گوئی کسریٰ اور قیصر کے اس سلوک کے جواب میں نہیں کی گئی، جو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے خط کے ساتھ کیا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ نے کسریٰ کیلئے بد دعا کی اور قیصر کیلئے ان کے بقاء کی خبر دی۔ فتح الباری میں ہے:

”كتب رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى كسرى وقيصر، فأما كسرى فلما قرأ الكتاب مزقه، وأما قيصر فلما قرأ الكتاب طواه ثم رفعه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم

أما هؤلاء فيمزقون وأما هؤلاء فستكون لهم بقية، ويؤيده ما روي أن النبي صلى الله عليه وسلم لما جاءه جواب كسرى قال مزق الله ملكه، ولما جاءه جواب قيصر قال ثبت الله ملكه“ (ص ۳۵-۳۴) ①

”جب آنحضرت ﷺ نے کسریٰ اور قيصر کو خط لکھا، تو کسریٰ نے خط پھاڑ دیا اور قيصر نے پیٹ کر اس کو اٹھا رکھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ چیر دیئے جائیں گے اور یہ لوگ باقی رہیں گے۔ اس کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کسریٰ کا جواب پہنچا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کے ملک کو پارہ پارہ کرے اور جب ہرقل کا جواب آیا، تو فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کا ملک ثابت رکھے۔“

اور یہ پیشین گوئی ایک مستقل شے ہے۔ اس کا آپ ﷺ کے نامہ مبارک سے اور اس کے جواب سے کوئی تعلق نہیں۔ ② قیصر کا لفظ حدیث میں عرب کے عرف پر

① فتح الباری ۱/۴۴

② کیونکہ جب شاہ ایران نے آپ ﷺ کا نامہ مبارک چاک کیا تھا، تو آپ ﷺ نے کسریٰ کے متعلق وہ پیشین گوئی نہیں فرمائی تھی، جو برق صاحب نے نقل کی ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کے حق میں بد دعاء فرمائی تھی۔ ”أَن يَمْزُقُوا كُلَّ مَمْزُوقٍ“ کہ وہ تباہ و برباد ہو جائیں۔ صحیح البخاری (۶۴) برق صاحب نے غلط فہمی سے رسول اللہ ﷺ کی عام حالات میں کی جانے والی پیشین گوئی کو اس خاص واقعہ کے بعد کی جانے والی بد دعا کی جگہ نقل کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے کسریٰ کی ہلاکت کی پیش گوئی کسی پیش آمدہ سبب کے بغیر وحی کے ذریعہ بتائی تھی، جس کا نامہ مبارک کے پھاڑنے سے کوئی تعلق نہیں اور خط پھاڑنے کے بعد جو بد دعاء فرمائی تھی، وہ بالفاظ دیگر ہے، جیسا کہ اوپر ذکر گزرا اور بحمد اللہ وہ حرف بحرف پوری ہوئی۔

اسی طرح برق صاحب کا کہنا کہ قیصر کے ساتھ نجاشی جیسے حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا، ←

ہے۔ عرب ہرقل کا اطلاق شام کے بادشاہ پر کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا اس پیش گوئی سے یہ مطلب تھا کہ اس قیصر کے مرنے کے بعد شام پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگا اور یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ الحمد للہ!

یہ اعتراض جو آپ نے کیا، شراح حدیث نے بھی کیا ہے اور اس کا جواب بھی دیا ہے۔ چنانچہ ”فتح الباری“ میں ہے:

”وقد استشكل هذا مع بقاء مملكة الفرس، لأن آخرهم قتل في زمان عثمان واستشكل أيضاً مع بقاء مملكة الروم وأجيب عن ذلك بأن المراد لا يبقى كسرى بالعراق ولا قيصر بالشام، وهذا منقول عن الشافعي، قال وسبب الحديث أن قريشا كانوا يأتون الشام والعراق تجاراً فلما أسلموا خافوا انقطاع سفرهم إليهم دخولهم في الإسلام فقال النبي ﷺ ذلك تطيباً لقلوبهم وتبشيراً لهم بأن ملكهما

سيزول عن الأقليمين المذكورين“ (فتح الباری: ۳۷۴) ①

اس میں ایک اشکال ہے کہ فارس کی حکومت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک باقی رہی اور رومیوں کی سلطنت بھی مدت تک قائم رہی۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عراق میں کسریٰ اور شام میں قیصر باقی نہیں رہیں گے۔ اس حدیث کے کہنے کی

← یہ بھی عدم تدبر کا نتیجہ ہے، کیونکہ نجاشی ایک مسلمان حاکم تھا اور قیصر روم ایک کافر حکمران تھا، لہذا دونوں کے ساتھ یکساں حسن سلوک کی توقع رکھنا معجزانہ خیال بات ہے۔ ﴿أَقْمَنَ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ

كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ﴾

① فتح الباری: ۶/۶۲۵۔

وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب قریش نے اسلام قبول کیا (اور اسلام سے قبل وہ عراق اور شام میں تجارت کیلئے سفر کیا کرتے تھے) اپنے سفر کے بند ہونے سے ڈر گئے، تو آنحضرت ﷺ نے ان کو خوش کرنے کے لیے فرمایا کہ ان کی حکومت عنقریب عراق اور شام سے زائل ہو جائے گی۔“

❏ دوسری بات کا بھی جواب آ گیا۔ کیونکہ اشکال کی وجہ دراصل یہی ہے کہ قیصر سے مراد ایک خاندان میں سے اس کا ایک فرد ہے اور اس خاندان کی حکومت مدت تک رہی۔ جب قیصر سے ہم نے شام کا حاکم مراد لیا، تو اشکال رفع ہو گیا۔ حدیث کا شان و ردد بھی اس کی تائید میں ہے۔ جیسے امام شافعی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

تیسرا اعتراض: تاریخی غلط بیانیوں

”اول یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مسجد اقصیٰ کے بانی حضرت سلیمان علیہ السلام تھے۔ اور یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تقریباً ہزار سال قبل مسیح تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ۲۰۱۵ قبل مسیح تھا۔ پس تعمیر کعبہ اور تعمیر بیت المقدس کے درمیان ۱۰۵۹ سال کا زمانہ بنتا ہے۔ لیکن بخاری کی ایک حدیث کے مطابق یہ زمانہ صرف چالیس سال کا ہے۔“

”عن أبي ذر قال: قلت يا رسول الله أي مسجد وضع في الأرض أول قال: المسجد الحرام، قال: قلت: ثم أي قال: المسجد الأقصى قلت كم كان بينهما؟ قال: أربعون سنة“❏

”ابو ذر کہتے ہیں: میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا: سب سے پہلے

❏ صحيح البخاري: كتاب الأنبياء باب (۱۰)، رقم الحديث (۳۱۸۶)، صحيح مسلم: كتاب

المساجد، رقم الحديث (۵۲۰)

زمین پر کون سی مسجد بنائی گئی؟ فرمایا: مسجد حرام، میں نے کہا: پھر کون سی؟
فرمایا: مسجد اقصیٰ! میں نے پوچھا: ان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ فرمایا:
چالیس سال کا!“

ہے کوئی محدث جو اس صریح تاریخی غلط بیانی کی تاویل کر سکے؟ علامہ
قسطانی لکھتے ہیں: ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فوراً بعد کسی نے مسجد
اقصیٰ بنائی ہو، جو گر چکی ہو، اور اسے سلیمان علیہ السلام نے دوبارہ تعمیر کیا ہو۔
تاریخ کے ٹھوس واقعات کو ”ممکن ہے، یہ ہو، وہ ہو“ سے جھٹلایا نہیں جا
سکتا۔ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ ممکن ہے، امریکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت
کیا ہو، تو کیا آپ مان لیں گے؟ (دوامِ اسلام: ۱۸۴)

جواب:

یہ ہے اعتراض، اور اعتراض کے ضمن میں اس کا جواب بھی نقل کر دیا ہے کہ
”ممکن ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فوراً بعد کسی نے مسجد اقصیٰ بنائی ہو، جو گر چکی ہو اور
اسے سلیمان علیہ السلام نے دوبارہ تعمیر کیا ہو۔“

اس پہ اعتراض یہ جمایا ہے کہ ”ممکن“ سے کام نہیں چلتا، تاریخی ثبوت لائیے، مگر
اس بات کو بھول گئے ہیں کہ وہ زمانہ ایسا تاریخی نہیں ہے، جس میں تمام دنیا کی باتیں
نقل کی گئی ہوں۔ اگر زمانہ تاریخ کی کسی بات کا تاریخ میں ذکر نہ ہو، تو آپ اس کی
نفی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس کا وقوع غیر تاریخی زمانہ میں ہوا ہے، تو آپ تاریخ کی
روشنی میں اس کی نفی کیونکر کر سکتے ہیں؟ یا آپ غیر تاریخی زمانہ کو تاریخی زمانہ پر قیاس
کیوں کر رہے ہیں کہ وہاں ”ممکن و امکان“ سے کام نہ چلے؟

قرآن مجید میں قصہ عاد موجود ہے، مگر بعض عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ قوم عاد صرف فرضی قوم ہے، کیونکہ تورات اس کے بیان سے ساقط ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ کعبہ کی تعمیر کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف فرضی ہے، کیونکہ تورات میں اس کا ذکر نہیں، آپ کا اعتراض بھی اسی قسم کا ہے۔ جو امر آنحضرت ﷺ سے پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ اور عقلاً ممکن بھی ہے، اس پر اعتراض چہ معنی دارد؟ ہاں کوئی امر خلاف قرآن یا خلاف عقل یا فطرت ہو، تو اس پر اعتراض کر سکتے ہیں۔

اس طرح تو عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن مجید نے جو یہ قصہ بیان کیا ہے:

﴿مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَفْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾^①

”(اے نبی ﷺ) آپ وہاں نہ تھے، جب وہ اس لئے قلمیں ڈالتے تھے کہ مریم کی کفالت کس کے سپرد ہو۔“

پہلی کتاب میں نہیں۔ تو ہم کیا اس پر اعتقاد لانا اس وقت تک چھوڑ دیں، جب تک کسی تاریخی ٹھوس دلائل سے اس کو ثابت نہ کر دیں؟ ہرگز نہیں! کیونکہ ہمارا اعتقاد ہے کہ قرآن نقل نہیں، بلکہ وحی ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کا علم سارے کا سارا لوگوں سے سنا ہوا نہیں، بلکہ وحی بھی ہے۔ اس لئے آپ ﷺ کے بیان کردہ واقعات کے لئے امکان ہی کافی ہے۔ اس واقعہ کو آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے امریکہ دریافت کرنے کے ساتھ تشبیہ نہیں دے سکتے، کیونکہ یہ واقعہ (موسیٰ علیہ السلام کے امریکہ دیکھنے کا) کسی معتبر تاریخی کتاب میں نہیں ہے۔ آپ صرف آج کہہ رہے ہیں، اس واسطے یہ معتبر نہیں، ہاں اگر کسی تاریخ کی معتبر کتاب

میں ہو، تو کولبس کی اولیت امریکہ دیکھنے کے بارے میں غلط ٹھہرے گی۔

شارحین نے اس کا ایک اور جواب بھی دیا ہے کہ ”اس جگہ مسجد حرام کی پہلی بنیاد مراد ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت رکھی گئی، اس وقت بیت المقدس کی بنیاد چالیس سال بعد میں رکھی گئی۔“ یہ زمانہ قبل از تاریخ کا ہے۔

تیسرا جواب یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ میں کعبہ تعمیر ہوا، اس سے پہلے ایک دفعہ جبرہم نے بنایا، اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، اس جگہ دوسری تعمیر مراد ہے، کیونکہ پہلے صرف کعبہ تھا اور مسجد حرام کا واڑہ اتنا وسیع بعد میں ہوا۔ مسجد اس وسعت اور صحن کا نام ہے جو کعبہ کے ارد گرد ہے اور جبرہم کی بناء حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر سے چالیس سال قبل ہے۔^①

پیدائش (باب ۲۸، آیت: ۱۸، ۱۹، ۲۰) میں ہے:

”یعقوب صبح سویرے اٹھا، اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنے سر ہانے دھرا تھا، لیکر ستون کو کھڑا کیا اور اس جگہ کا نام بیت ایل رکھا۔“

اور اس باب (آیت ۲۲) میں ہے:

”اور یہ پتھر جو میں نے ستون میں کھڑا کیا ہے، خدا کا گھر ہوگا۔“

لو! اب یہ تاریخی حوالہ بھی مل گیا، اب تو حدیث کا مطلب جو علامہ قسطلانی نے

”ممکن“ کے لفظ سے بیان کیا ہے، ایک ٹھوس حقیقت تاریخیہ سے ثابت ہو گیا۔^②

① دیکھیں: فتح الباری: ۶/۴۰۸، عمدۃ القاری: ۱۵/۲۶۲

② مسجد اقصیٰ کی ابتدائی تعمیر اور تاسیس حضرت یعقوب علیہ السلام نے رکھی تھی، جو خانہ کعبہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد واقعہ ہوئی، اور بعد میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ کی دوبارہ تعمیر اور تجدید کی تھی۔ لہذا اس حدیث میں کسی طرح کی کوئی تاریخی غلطی نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: زاد

المعاد: ۱/۴۷، البدایہ والنہایہ: ۱/۱۶۲،

چوتھا اعتراض:

اس کے بعد ایک حدیث لکھتے ہیں:

”عن عائشة رضي الله عنها أن النبي ﷺ توفي وهو ابن ثلاث وستين سنة“ (بخاري) ^①

”نبی کریم ﷺ نے تریسٹھ سال کی عمر میں رحلت کی۔“

لیکن حضور کے خادم حضرت انس جو (۱۲۶۸) ^② احادیث کے راوی ہیں، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی عمر ساٹھ برس تھی:

”أنزل عليه وهو ابن أربعين سنة فلبث بمكة عشر سنين ينزل عليه وبالمدينة عشر سنين“ ^③ (بخاري)

”چالیس برس کی عمر میں حضور پر قرآن اترنے لگا، اس کے بعد دس سال مکہ میں اور دس سال مدینہ میں زندہ رہے۔“

اسی صفحہ پر اس مضمون کی ایک اور حدیث بھی موجود ہے، جو انس ہی سے منقول ہے، لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”بعث رسول الله ﷺ لأربعين سنة فمكث بمكة ثلاث عشرة سنة يوحى إليه ثم أمر بالهجرة فهاجر عشر سنين“

① صحيح البخاري: كتاب المناقب، باب وفاة النبي ﷺ، رقم الحديث (۳۳۴۳)، صحيح

مسلم: كتاب الفضائل، باب كم سن النبي ﷺ يوم قبض، رقم الحديث (۲۳۴۹)

② صحیح تعداد (۲۲۶۸) ہے۔

③ صحيح البخاري: كتاب المناقب، باب صفة النبي ﷺ، رقم الحديث (۳۳۴۴)، صحيح

مسلم: كتاب الفضائل، باب في صفة النبي ﷺ، رقم الحديث (۲۳۴۸)

ومات وهو ابن ثلاث وستين“^①

”چالیس برس کی عمر میں حضور پر وحی نازل ہوئی، اس کے بعد آپ مکہ میں تیرہ برس رہے۔ اور وحی باقاعدہ جاری رہی، پھر مدینہ میں تشریف لے گئے، یہاں تک کہ تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔“

(دوا اسلام: ۱۸۶)

جواب:

معلوم ہوتا ہے، مصنف محاورات عرب سے بالکل نا بلد ہے۔ عربی زبان میں دھاکوں کے اوپر کی اکائیوں کو بعض وقت حذف کر دیا کرتے ہیں۔ اس محاورہ کی بناء پر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مکی زندگی بیان کرتے ہوئے بعثت کے بعد کے عرصہ سے دس کا ذکر کیا اور تین کو حذف کر دیا۔ اسی طرح مجموعہ سے ساٹھ کے اوپر تین کو حذف کر دیا۔

﴿فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون﴾^②

”اگر علم نہ ہو، تو اہل علم سے پوچھ لینا چاہیے!“ قرآن مجید میں ہے:

﴿حمله وفصاله ثلاثون شهرا﴾^③

”حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ ہے۔“

حالانکہ حمل کی عام مدت ۹ ماہ ہے اور دودھ پلانے کی مدت قرآن نے ۲ سال بتائی ہے۔ اس حساب سے کل ۳۳ ماہ بنتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

① صحیح البخاری: کتاب فضائل الصحابة، باب ہجرة النبي ﷺ و أصحابه إلى المدينة،

رقم الحديث (۳۶۸۹)، صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب کم أقام النبي صلى الله عليه

وسلم بمكة و المدينة، رقم الحديث (۲۳۵۱)

② النحل: ۴۳

③ الأحقاف: ۱۵

﴿حولین کاملین﴾^①

”پورے دو سال دووہ پلائیں“ اور ایک جگہ فرمایا:

﴿فِي عَامَيْنِ﴾^②

”دوہ چھوڑنے کی مدت دو سال ہے“

مگر آیت بالا میں صرف (۳۰) بتائے ہیں، اس لئے کہ کسر یعنی اکائیوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔^③

پانچواں اعتراض:

اب تیسری تاریخی غلطی سنئے:

”عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ کیا تورات میں حضور ﷺ کے متعلق کوئی آیت موجود ہے؟ کہا: کیوں نہیں! آپ کے متعلق یہ آیت تورات میں موجود ہے:

”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا، وَحِزًّا
لِّلْأُمِّيِّينَ أَنْتَ عَبْدِي وَرَسُولِي سَمِيتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفُظٍّ
وَلَا غَلِيظٌ“^④

① البقرة: ۲۳۳

② لقمان: ۱۴

③ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھی حضور اکرم ﷺ کی عمر مبارک کا بخوبی علم تھا، کیونکہ ان سے آپ ﷺ کی عمر مبارک تریسٹھ برس بھی مروی ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث: ۲۳۴۸) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ساٹھ سال عمر بتاتے ہوئے عرب کے محاورہ کے مطابق اکائی حذف کر دی تھی۔

④ صحيح البخاري: كتاب البيوع، باب كراهية السخب في السوق، رقم الحديث (۲۰۱۸)

”اے رسول! ہم نے تمہیں شاہد، بشیر، نذیر اور ان پڑھ عربوں کا محافظ بنا کر بھیجا ہے، تو میرا بندہ ہے اور رسول ہے۔ تو ترش مزاج ہے، نہ تند طبع۔“

تورات کو الف سے یاء تک پڑھ جائیے، یہ الفاظ کہیں نہیں ملیں گے۔ ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ اچی صاحب! تورات میں اس قدر تحریف ہو چکی ہے کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی۔ یہ آیت ملے تو کہاں سے؟ اس کے دو جواب ہیں:

اول: اگر تحریف ہو چکی ہے، تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے وہ آیت کہاں سے دیکھ لی؟ حضرت موسیٰ کا زمانہ اندازاً پندرہ سو برس قبل مسیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام کے عہد تک پورے دو ہزار سال گزر چکے تھے، مبینہ تحریف اس عہد میں ہو چکی ہوگی۔ خود مسیحی مصنف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہود (۶۹۸ ق م) کے زمانہ میں تورات گم ہو گئی تھی اور ۷۵ برس کے بعد دستیاب ہوئی تھی۔ مسلم محققین اسی عہد کو تحریفِ تورات کا عہد تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں اصل تورات نہیں ملی تھی، بلکہ ایک جعلی نسخہ تیار کر لیا گیا تھا۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ تورات بخت نصر کے حملے میں ضائع ہوئی تھی۔ یہ حملہ ۶۰۶ ق م میں تاجدارِ بابل (بخت نصر) نے سلطنتِ یہود پہ کیا تھا۔ ہر یہودی کو قتل کر ڈالا تھا یا قیدی بنا کر ساتھ لے گیا تھا اور تورات کو جلا دیا تھا، مبینہ تحریف کا زمانہ ۶۹۸ ق م ہو یا ۶۰۶ ق م، وہ بہر حال ولادتِ رسول سے صدیوں پہلے ہو چکی تھی۔ اس زمانہ میں تورات کے نسخوں کی تعداد محدود تھی اور تحریفِ آسانی سے ہو سکتی تھی، لیکن عہدِ رسول میں ہزار ہا نسخے مختلف ممالک میں موجود تھے اور بعد میں ان

کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ اس لئے تحریف آسان نہیں تھی۔ یہ تو ممکن تھا کہ کوئی شخص اپنے ذاتی نسخے میں رد و بدل کر دیتا۔ آخر یہودیوں میں بھی ہزار ہا شخص ایسے موجود ہوں گے، جنہیں اپنی کتاب سے اسی طرح محبت ہوگی، جس طرح ہمیں قرآن سے، اگر ہم قرآن میں تحریف کا تصور تک نہیں کر سکتے، تو یہودیوں کے متعلق یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا ہر فرد تحریف کیلئے تیار تھا۔

﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهُودُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ﴾^①
 ”موسیٰ کی قوم میں ایسے لوگ بھی موجود تھے، جو سچائی کا راستہ دکھاتے تھے۔“

یہ سچے یہودی تورات کی تحریف کس طرح گوارا کر سکتے تھے؟ بنا بریں اگر تحریف ہوئی تھی، تو وہ یقیناً نزول قرآن سے صدیوں پہلے ہو چکی ہوگی۔ ان حالات میں کیا ہم دریافت کر سکتے ہیں

ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ آیت کہاں سے دیکھ لی تھی؟

دوم: حضرت مسیح نے اعلان کیا تھا کہ جب تک زمین آسمان نہ ٹل جائیں، ایک نقطہ یا شوشہ تورات سے ہرگز نہیں ٹلے گا۔

(انجیل متی، باب: ۵، آیت: ۷)

اگر تورات محرف ہو چکی تھی، تو حضرت مسیح اتنے زور سے یہ اعلان کیوں کرتے؟ صاف صاف کہہ دیجئے: تورات گم ہو چکی ہے یا بگڑ چکی ہے۔ اس کے تمام احکام مسخ ہو چکے ہیں، اس لئے میں نئی کتاب لیکر آیا ہوں! تورات کی تصدیق کرنا اور ڈنگے کی چوٹ کہنا کہ تورات کا ہر شوشہ اور نقطہ

اپنی جگہ پر قائم ہے اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں، اس کا ایک حرف تک نہیں بدل سکتا۔ صاف صاف اعلان ہے اس حقیقت کا کہ حضرت مسیح کے عہد تک تورات اپنی اصل حالت میں باقی تھی۔ اور بخت نصر وغیرہ کی حکایات سب فرضی ہیں۔ تورات کے غیر محرف ہونے پر کچھ تاریخی شواہد بھی موجود ہیں، لیکن چونکہ ہمارے علماء الہام کے مقابلہ میں تاریخ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، اسلئے ہم اس موضوع پر قرآن کا فیصلہ درج کرتے ہیں:

① سورة بقرہ کی ابتدائی آیات میں ہمیں تمام سابقہ آسمانی صحائف پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر وہ کتابیں محرف ہو چکی تھیں، اور غلط سلط تھیں تو ان پر ایمان لانے کا مقصد؟

② جس طرح انجیل کے متعلق قرآن نے ہمیں بتایا کہ وہ تورات کی مصدق تھی:

﴿وَاتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ﴾^①

”کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی، جس میں نور و ہدایت ہے اور جو تورات کی تصدیق کرتی ہے۔“

اسی طرح قرآن نے تورات و انجیل ہر دو کی تصدیق کی:

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَالْإِنجِيلِ﴾^②

”قرآن تورات و انجیل ہر دو کی تصدیق کرتا ہے۔“

① المائدة: ٤٦۔

② المائدة: ٦٨۔

تصدیق کے معنے ہیں: سچا سمجھنا اور درست تسلیم کرنا۔ جب قرآن تورات و انجیل کی صداقت کا اعلان کر رہا ہے، تو آپ کون ہوتے ہیں، انہیں جھوٹا سمجھنے والے؟ کیا قرآن ایک محرف اور جھوٹے صحیفے کی تصدیق کر سکتا ہے؟ کیا خدا کے علم میں نہیں تھا کہ تورات میں تصرف ہو چکا ہے۔ اگر علم تھا، تو تصدیق کیوں کی؟ کیا کوئی مجسٹریٹ کسی جعلی دستاویز کی دیدہ و دانستہ تصدیق کر سکتا ہے؟

③ آپ کہیں گے کہ اللہ نے اصلی تورات کی تصدیق کی تھی، نہ کہ صحیفہ رائجہ کی۔ بہت اچھا! تو پھر قرآن نے یہ کیوں کہہ دیا:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ
وَالْإِنْجِيلَ﴾^①

”اے رسول! اہل کتاب سے کہہ دو کہ جب تک وہ تورات و انجیل پر عمل نہیں کریں گے، ان کی بگڑی کبھی نہ بن سکے گی۔“
اگر یہ کتابیں انسانی دست و برد سے ناپاک ہو چکی تھیں، تو اہل کتاب کو ان پر عمل کرنے کی دعوت کیوں دی؟
اور سنئے:

﴿وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ﴾^②

”ان کے پاس تورات موجود ہے، جس میں اللہ کا حکم درج ہے۔“
یہ نہیں فرمایا کہ ”درج تھا“ بلکہ ”درج ہے“ نحو کا مشہور قاعدہ ہے، جہاں جار و مجرور کا متعلق مذکور نہ ہو۔ وہاں محذوف ”کائن“ فرض کر لو۔ اس

قاعدہ کی رو سے آیت کے معنی ہوں گے ”تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے۔“ لیکن آپ کہتے ہیں کہ ”موجود تھا۔“ کس کو صحیح سمجھوں: آپ کو یا قرآن کو؟

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ﴾^①

”ہم نے تورات نازل کی، جس میں ہدایت اور نور موجود ہے!“

ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مَبْرُكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾^② إِنَّمَا أَنْزَلَ الْكِتَابَ عَلَى طَائِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَإِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَ

”ہم نے یہ مبارک کتاب تمہیں عطا کی ہے، اسے مانو اور گناہوں سے بچو، تاکہ تم ہماری رحمت کے مستحق بن سکو، اب تم یہ عذر نہیں پیش کر سکتے: ہم سے قبل دو امتوں (یہود و نصاریٰ) پر کتابیں نازل ہوئیں تھیں، لیکن وہ اجنبی زبان میں تھیں اور ہم انہیں سمجھ نہیں سکتے تھے۔“
یعنی نزول کی وجہ یہ نہیں بتائی گئی کہ پہلی کتابیں مسخ ہو چکی تھیں، بلکہ یہ کہ وہ ایسی زبان میں تھیں، جس سے عرب نا آشنا تھے۔ کیا تورات کی صحت پر اس سے بڑی شہادت پیش ہو سکتی ہے؟
اور سنئے:

﴿لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ﴾^③ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

① المائدة: ٤٤

② الأنعام: ١٥٥-١٥٦

وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١﴾

”سارے اہل کتاب برے نہیں، ان میں ایسے نیک اور پرہیزگار بھی موجود ہیں، جو رات کو اللہ کی آیات (تورات و انجیل) پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کی ترغیب دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نیک اعمال کی طرف بے تابانہ بڑھتے ہیں، یہ لوگ صالح ہیں۔“

اس آیت میں تورات و انجیل کو اللہ کی ”آیات“ کہا گیا ہے۔ اگر تورات بگڑ چکی تھی، تو اللہ اس کے احکام کو ”آیات“ کیوں کہتا ہے؟ اور اس پر عمل کرنے والوں کو ”صالحین“ میں شمار کیوں کرتا ہے؟

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ صورتحال ہے، تو پھر مسلمان بننے کی ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے؟ عیسائی رہ کر نیک عمل کئے جاؤ، نہ قرآن پر ایمان لانے کی ضرورت، نہ رسول پہ، سارے اسلام سے چھٹی مل گئی۔ یہ سوال اسلام کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اسلام کسی زبانی اقرار کا نام نہیں، بلکہ نیکی کا نام ہے، اگر ایک عیسائی نیکی کر رہا ہے، تو وہ قرآن کی رو سے مسلمان ہے۔ رسول و قرآن کا صحیح پیرو وہی ہے جو نیک ہو، نہ وہ جو کلمہ پڑھے، سارے جہاں کی بدمعاشیاں کرتا پھرے۔ آپ کے ہاں اسلام چند عقائد کا نام ہے، اور قرآن کے نزدیک صرف نیکی کا۔ اس لئے خدا و رسول کا صحیح پیرو وہ ہے، جو ان احکام پر عمل کر رہا ہے، خواہ اس پر عیسائیت کا لیبل لگا ہو یا یہودیت کا، نہ وہ جو خدا و رسول کا صرف زبانی

قائل ہو اور عملاً کافر، چونکہ قرآن کی رو سے ﴿إِنْ هَذَا فِي الصِّحْفِ الْأُولَى﴾ صحفِ ابراہیم و موسیٰ ﴿﴾^① یہ قرآن ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں بھی موجود ہے، اس لئے کتابِ موسیٰ کا سچا عامل خود بخود قرآن کا عامل بن جاتا ہے۔ مت بھولئے کہ ہر عمل کا ایک صلہ ہے، جو کسی طرح ضائع نہیں ہوتا۔ عامل خواہ مرد ہو یا عورت، عیسائی یا مسلمان، یہ صلہ اسے مل کر رہے گا، اہل کتاب کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يَكْفُرُوهُ﴾^②

”ہم ان اہل کتاب کے کسی نیک عمل کو ضائع نہیں جانے دیتے۔“

ممکن ہے، آپ سوچ رہے ہوں کہ وہ جو قرآن میں یہود کے متعلق لکھا ہے کہ وہ تورات میں تحریف کیا کرتے تھے، اس کا کیا مطلب؟ تحریف سے مراد آیات کی من مانی تفسیر کرنا، نہ الفاظ کو بدلنا۔

عہدِ رسول میں تورات اصلی حالت میں موجود تھی، اس تورات میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ذکر کردہ روایت کہیں موجود نہیں!“

جواب:

مندرجہ بالا عبارت میں مصنف نے پہلے تو یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ عبارت جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، تورات میں نہیں پائی جاتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں تاریخی غلط بیانی ہے۔ پھر ان کا اپنی طرف سے ایک جواب ”تورات میں تحریف ہو چکی ہے، اس واسطے یہ عبارت نہیں ملتی“ ذکر کر کے اس پر بحث کی ہے۔ اور اپنی طرف سے پہلے یہ کہا ہے کہ تورات کے محرف ہونے کا زمانہ چھ سو سال قبل

① الأعلیٰ: ۱۸-۱۹

② آل عمران: ۱۱۵

مسح ہے۔ اس واسطے اگر تحریف ہو چکی تھی، تو عبارت تو اس میں موجود ہونی چاہئے، کیونکہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اپنے وقت میں نقل کی ہے۔ اس کے بعد تورات اور انجیل کے غیر محرف ہونے کا ذکر کیا ہے، اس پر تین دلائل ذکر کئے ہیں:

اول: بعض یہودی راست باز بھی تھے۔

دوم: مسح نے کہا: تورات کا ایک شوشہ بھی نہیں ٹلے گا۔

سوم: قرآن سے استدلال کیا ہے، اس کے ضمن میں یہودیوں اور عیسائیوں کو بدوں مسلمان ہونے کے ناجی قرار دیا ہے، بلکہ اسلام صرف عمل کا ہی نام رکھ دیا ہے۔

اس کا مقصد معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں تو تحریف ہو چکی ہے اور حدیث کے بغیر قرآن کا سمجھنا مشکل ہے، اس لئے اسلام سے تو چھٹی ہوئی، اب اپنا اصل مقصد ظاہر کر دیا ہے کہ تورات و انجیل غیر محرف ہیں، ان پر عمل کر کے نجات ہو سکتی ہے، پس یہودی اور عیسائی بننا، مسلمان بننے سے بہتر ہے، یہ ہے ان کی عبارت کا خلاصہ مطلب!

اولاً: یہ عرض ہے کہ یہ حدیث عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ہے، نہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے۔

دوم: عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے جو تورات کا لفظ بولا ہے، تورات سے مراد ان کی صرف موسیٰ علیہ السلام کی کتاب نہیں، بلکہ وہ سب پہلی کتابیں مراد ہیں، جو عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے نبیوں کی طرف منسوب ہیں، جو آیت تورات کے حوالہ سے لکھی گئی ہے، اس کا بعض حصہ تو قرآن کا ہے، اور بعض حصہ کسی سابق کتاب کا ہے:

① دیکھیں: صحیح البخاری: کتاب البیوع، باب کراہیۃ السخب فی السوق، رقم

الحديث (۲۰۱۸) ورقم الحديث: (۴۵۵۸)

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾^①

یہ حصہ قرآن کا ہے: جو ”سورہ احزاب“ میں ہے، اس کے بعد کا حصہ کسی پہلی کتاب کا ہے، جس کو ”تورات“ سے تعبیر کیا ہے۔ اکثر پیشین گوئیاں ”یسعیاہ“ کی کتاب میں ہیں، یہ پیش گوئی بھی اسی کتاب کی ہے۔ مگر ان الفاظ کو اس ترتیب کے ساتھ اس میں تلاش کرنا ضروری نہیں، بلکہ یہ الفاظ متفرق طور پر اس میں پائے جاتے ہیں۔ جیسے ”سورہ صف“ میں عیسیٰ علیہ السلام کا وعظ جس ترتیب کے ساتھ ہے، اس ترتیب کے ساتھ انجیل میں نہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقٌ لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ

وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِيهِ مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾^②

”میں تمہاری طرف اللہ کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں، تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے پیچھے آنے والے رسول کی خوشخبری دیتا ہوں، جس کا نام احمد ہے۔“

اب یہ تین باتیں:

① میں رسول ہوں۔

② تورات کا مصدق ہوں۔

③ اور آنے والے نبی کی خوشخبری دیتا ہوں۔

ایک جگہ انجیل میں نہیں، بلکہ متفرق طور پر ہیں۔ اسی طرح جو باتیں اس عبارت

میں ہیں، متفرق طور پر ”یسعیاہ“ نبی کی کتاب میں موجود ہیں:

”دیکھو میرا خادم جس کو میں سنبھالتا ہوں، میرا برگزیدہ، جس سے میرا دل

① الأحزاب: ۴۵

② الصف: ۶

خوش ہے، میں نے اپنی روح اس پر ڈالی، وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا، وہ نہ چلائے گا اور نہ شور کرے گا اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنائی دیگی۔ وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا اور ٹھٹھاتی بتی کو نہ بجھائے گا۔“ ① (یسعیاہ: ۴۲)

اس پیشین گوئی اور اس قسم کی دوسری پیشین گوئیوں سے اس قسم کے الفاظ مل جاتے ہیں۔

ثانیاً: یہ عرض ہے کہ تورات کے محرف ہونے پر داخلی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ اسی طرح انجیل کے محرف ہونے پر بھی دلائل موجود ہیں۔ یہ وہ تورات نہیں، جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھی۔

باب: ۳۴، آیت: ۵ میں ہے:
”پس خداوند کے بندہ موسیٰ نے خداوند کے کہے کے موافق وہیں مواب کے ملک میں وفات پائی“

اور آیت: ۶ میں ہے:
”پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں۔“

اور آیت: ۱۰ میں ہے:

”اب تک بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ کی مانند جس سے خداوند نے روبرو باتیں کیں، نہیں اٹھا۔“ ②

① یسعیاہ: باب ۲۲، آیت: ۱-۴، نیز دیکھیں: باب: ۹، آیت: ۶-۷، باب: ۴۲، آیت: ۱۱،

باب: ۵۴، آیت: ۱-۲،

② استثناء: باب ۴۳، آیت: ۵، ۶، ۱۰ ان عبارات سے بائیں طور تحریف ثابت ہوتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام

پر نازل ہونے والی آیات میں ایسے امور کا ذکر ہے، جن کا تعلق موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہے، جس میں ان کی مقام وفات اور قبر وغیرہ کا ذکر ہے، جس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ یہ الفاظ کسی بعد میں آنے والے فرد نے تورات میں درج کر دیے ہیں۔

یہ تین آیتیں علی الاعلان کہہ رہی ہیں کہ یہ تورات موسیٰ علیہ السلام کے بعد کچھ زمانہ گزرنے پر لکھی گئی، جب کہ لوگوں کو ان کی قبر بھی یاد نہ رہی۔

دوسری شہادت یہ ہے کہ تورات میں انبیاء کے متعلق زنا تک بلکہ بت پرستی کرانے کا بھی ذکر ہے،^① اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں بعد کی لکھی ہوئی ہیں۔

یہی حال انجیل کا ہے، چار انجیلوں میں بھی اختلاف ہے، کسی میں کچھ اور کسی میں کچھ۔ ان میں رطب و یابس پایا جاتا ہے۔

باقی رہی یہ بات ہے کہ مسیح نے جو یہ کہا تھا کہ ”تورات کا ایک شوشہ بھی نہیں ٹلے گا۔“ تو اس کا تعلق منسوخ ہونے کے ساتھ ہے۔ یعنی جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے، اس وقت تک منسوخ نہیں ہوگی، انجیل کے الفاظ اس طرح ہیں:

”منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں، کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین نہ ٹل جائیں، ایک نقطہ یا ایک شوشہ تورات سے ہرگز نہ ٹلے گا، جب تک سب کچھ پورا نہ جائے۔“ (متی،

باب: ۵ آیت: ۱۸)

① دیکھیں: عہد نامہ قدیم: ۱۹، پیدائش: باب: ۱۹، آیت: ۳۰-۳۸، سموئل (۲)، باب: ۱۱، آیت: ۲-۵، ان عبارات میں تصریح ہے کہ حضرت داود اور لوط علیہ السلام نے (معاذ اللہ) زنا کیا، اور لوط علیہ السلام کے متعلق (معاذ اللہ) لکھا ہے کہ انھوں نے شراب پی کر اپنی بیٹیوں سے زنا کیا، اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق لکھا ہوا ہے کہ انھوں نے شراب پی اور وہ برہنہ ہو گئے۔ (پیدائش: باب: ۹، آیت: ۲۰-۲۲، حضرت ہارون علیہ السلام کا شرک، پیدائش: باب: ۳۲، آیت: ۱-۶۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بت پرستی: سلاطین (۱)، باب: ۱۱، آیت: ۱-۱۳۔

علاوہ ازیں بائبل میں ایسے بے شمار واقعات منقول ہیں، جن سے انبیاء کرام علیہم السلام کا جھوٹا، شرابی، مکار، بت پرست، زنا کار، ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن نصاریٰ کے اندر اتنی جرأت نہیں کہ وہ بائبل میں تحریف کے خوف سے ان مقدس ہستیوں کے متعلق حق و سچائی کا اعلان کریں اور ان کو ان تمام اتہامات سے مبرا قرار دیں۔

یعنی جب وہ پیشین گوئیاں پوری نہ ہوں، جن کا پورا ہونا منسوخ ہونے سے پہلے ضروری ہے، آسمان اور زمین بھی ٹل جائیں، مگر اس وقت تک تورات منسوخ نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جب تک آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف نہ لائیں، اس وقت تک تورات کا ایک شوشہ بھی منسوخ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یہ کہنا کہ یہودی نیک بھی تھے، وہ کسی طرح تحریف پر راضی نہ ہو سکتے تھے، اسی صورت میں قابل استدلال ہو سکتا ہے، جب ان کی رضا سے تحریف ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تورات کے نسخے چرا کر تلف کر دیئے جائیں اور ان کی جگہ تحریف شدہ نسخے رکھ دیئے جائیں۔ مصر میں عیسائیوں نے عربی میں قرآن کے مقابلہ میں ایک کتاب لکھی اور بہت شائع ہوئی۔ مگر جب ان کو اس کتاب کی کمزوری معلوم ہوئی، تو پوشیدہ طور پر اس کے تمام نسخے جمع کر کے خرد برد کر دیئے۔ آج اس کا ایک نسخہ بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تحریف نہیں ہو سکتی تھی، مگر سابق تحریف کا تو کوئی تسلی بخش جواب نہیں۔ صرف یہ کہہ دینا کہ محض من گھڑت داستان ہے، کوئی معقول جواب نہیں۔ خاص کر جب تورات میں اندرونی شہادتوں سے تحریف معلوم ہوتی ہو، پس ہو سکتا ہے کہ تحریف شدہ نسخوں میں یہ عبارت نہ ہو۔ اور بعض دیگر کتابوں میں یہ بطور نقل موجود ہو، اور عبداللہ بن عمرو نے اس دوسری کتاب سے تورات کا حوالہ پڑھ لیا ہو۔ اور قرآن سے عدم تحریف پر جو آیتیں ذکر کی گئی ہیں، ان سے عدم تحریف پر استدلال کرنا درست نہیں کہ وہ وحی جوں کی توں اب بھی موجود ہے۔ اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس بات کو ماننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ رشد و ہدایت شروع سے جاری کیا اور اب تک چلا آیا، خواہ وہ محفوظ رہا ہو یا نہ۔

اسی طرح جس آیت میں انجیل کے متعلق یہ لکھا ہے کہ: ”اس میں ہدایت اور

نور ہے“ خواہ محرف ہو یا اصلی، کیونکہ قرآن مجید نے یہ نہیں کہا کہ انجیل محفوظ ہے۔ اور قرآن نے یہ بھی نہیں کہا کہ موجودہ انجیل میں نور اور ہدایت ہے، کیونکہ عیسائی کے ہاں اناجیل ہیں اور قرآن صرف انجیل کہتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو انجیل مسیح پر نازل ہوئی اور جو وہ تلقین کرتے رہے، اور جس کا ذکر موجودہ اناجیل میں بھی ہے، اس میں نور و ہدایت ہے۔

اسی طرح قرآن نے جو تورات و انجیل کی تصدیق کی، تو انہی مسائل میں کی ہے، جو قرآن سے ملتے ہیں، جیسے قرآن ”مصدق“ ہے، ساتھ ساتھ ”مہیمن“^① بھی ہے۔ ان کتابوں پر رقیب بھی ہے، ان کے تحریف شدہ احکام کی اصلاح بھی کرتا ہے۔

اسی طرح تیسری آیت میں جو یہ ذکر ہے کہ ”جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہ کرو۔“ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ قرآن پر ایمان لاؤ، کیونکہ قرآن پر ایمان لانا ہی تورات و انجیل کو قائم کرنا ہے، جیسے ایک جگہ فرمایا:

﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ﴾^②
 ”جو فرقہ قرآن سے کفر کرے، اس کا ٹھکانہ بھی جہنم ہے۔“

ایک جگہ فرمایا:

﴿فَالَّذِينَ آمَنُوا هُمُ الْبَارُونَ وَمَنْ هُوَ الْبَارُونَ﴾^③
 ”جو کتاب سے واقف ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان مشرکین

① المائدة: ٤٨

② ہود: ١٧

③ الغنکبوت: ٤٧

سے بھی بعض ایماندار ہیں۔“

اور جس آیت میں یہ ذکر ہے: ”فیہا حکم اللہ“ (اس میں اللہ کا حکم ہے) اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ لوگ تجھے حکم اس لئے نہیں بناتے کہ وہ اللہ کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کرتے ہیں، اگر ایسی بات ہوتی، تو جس مسئلہ میں تیرے پاس آئے تھے، کیا اس میں اس مسئلہ کا کوئی جواب نہ تھا۔ کیا وہ اللہ کا حکم نہ تھا، یعنی اللہ کا حکم تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تورات میں تحریف احکام میں نہ ہوئی ہو، بلکہ اعتقادات اور واقعات میں ہوئی ہو۔

یہاں ایک نحوی نکتہ بھی بیان کیا ہے، شاید یہ درس نظامی کا بھولا ہوا کوئی مسئلہ ہو، جار و مجرور کے متعلق بتایا ہے کہ ”کائن“ محذوف ہے، پس معنی ہوا: ”تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے۔“ اور اس بات کو فراموش کر دیا کہ ”اسم فاعل“ یا ”مفعول“ کو مقدر کرنا کوئیوں کا مذہب ہے۔ بصری ”ثبت“ یا ”وجد“ نکالتے ہیں۔ اگر ”کائن“ سے موجود ہونا سمجھا جاتا ہے، تو ”ثبت“ اور ”وجد“ سے یہ سمجھا جائے گا کہ اس میں اللہ کا حکم تھا۔

آگے ایک اور آیت ہے:

﴿فیہا ہدیٰ ونور﴾

”اس میں ہدایت اور نور موجود ہے۔“

حالانکہ یہ جملہ حال واقعہ ہوا ہے۔ یعنی ہم نے تورات کو اس حالت میں نازل کیا کہ اس میں ہدایت اور نور ہے۔

اس کے بعد ایک آیت غلط لکھ دی ہے:

”ولو آمن أهل الكتاب وما أنزل إليهم من ربهم.....“

صحیح آیت اس طرح ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ.....﴾^①

”اگر یہ لوگ تورات و انجیل اور دوسری کتابوں پر عمل کرتے، جو ان پر ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی تھیں، ان کی معیشت میں فراوانی ہوتی۔“

آگے اس اعتراض کے ”جب تورات و انجیل اصل حالت میں تھیں، تو قرآن کی کیا ضرورت پڑی“ کا جواب یہ دیا ہے کہ ”قرآن اس لئے آیا کہ وہ کتابیں عربی زبان میں نہ تھیں۔ نہ یہ کہ وہ مسخ ہو چکی تھیں“ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن صرف عربوں کے لئے ہے، ہمارے لئے اردو یا پنجابی میں کتاب ہونی چاہئے۔ قرآن کی اس آیت میں جو وجہ قرآن کے نزول کی بیان کی گئی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی وجہ ہے، بلکہ یہ وجہ بھی ہے کہ تمہارا یہ اعتراض بھی نہ رہے، اگرچہ اعتراض کوئی معقول نہیں، ورنہ لازم تھا کہ کچھ مدت پہلے ہی قرآن اترتا، اس واسطے اس آیت سے یہ سمجھنا کہ پہلی کتب کا مسخ ہونا، اس کے نزول کی وجہ نہیں، باطل ہے۔ بلکہ قرآن مجید کے نزول کے بہت سے اسباب ہیں:

نزول قرآن کے اسباب:

① اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ عرب کے ذریعہ سارے عالم کو دعوت دی جائے اور وہ دعوت اسی صورت میں مکمل ہو سکتی تھی کہ پہلے ان کی زبان میں کتاب اتاری جائے، تاکہ کتاب سے کما حقہ واقف ہو سکیں۔

② پہلی کتابیں محرف ہو چکی تھیں، ان میں واقعات اور عقائد میں رد و بدل ہو چکا تھا، ان سے حقیقتِ حال کا معلوم کرنا بہت مشکل تھا۔ قرآن نے جا بجا یہودیوں اور عیسائیوں کے رد میں ان کے فاسد عقائد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اناجیل پڑھ کر توحید کا خالص پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔

③ وہ کتابیں مکمل نہ تھیں، مثلاً یوم جزا کی تفصیل سے دونوں کتابیں معرا ہیں اور عقائد اور مسائل کی حکمتیں اور ان کے دلائل بیان کرنے میں کم زبان ہیں۔

④ ان کے بعض مسائل پر عمل کرنے کا وقت گزر چکا ہے، وہ احکام وقتی تھے۔

⑤ وہ کتابیں اور ان کے احکام عالمگیر نہ تھے، بلکہ خاص خاص قوموں کیلئے وہ کتابیں آئیں۔

اس کے بعد صفحہ (۱۹۲) میں چوتھے پارہ کی آیت ﴿لِیَسُوْا سِوَاءً.....﴾ سے یہ سمجھا ہے کہ اس میں جس جماعت کی تعریف کی گئی ہے، وہ ابھی تک اپنے مذہب پر قائم ہے۔ غلط ہے، بلکہ اس جگہ اس جماعت سے وہ لوگ مراد ہیں، جو حلقہٴ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ اس جگہ ”آیات“ سے مراد قرآن کی ”آیات“ ہیں۔^①

”اسلام“ کا معنی:

اسلام اگرچہ سب انبیاء کا مذہب تھا، مگر آنحضرت ﷺ کی آمد پر ”اسلام“ کا لفظ اسی مذہب پر بولا جاتا ہے، جو قرآن و سنت کی شکل میں مسلمانوں کے پاس ہے اور اسی کے پیروؤں کو مسلمان کہتے ہیں، کیونکہ پہلے ادیان منسوخ ہو چکے ہیں۔ کے بعد اب ان کو اسلام نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اسلام کے معنی فرمانبرداری کے ہیں،

① دیکھیں: تفسیر الطبری: ۳/۳۹۷، تفسیر البغوی: ۱/۴۰۶، تفسیر القرطبی: ۴/۴۷۱، زاد

المسیر: ۱/۴۴۱، الدر المنثور: ۲/۲۹۶، تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۲۷،

جب تک فرمان ہے، اس وقت تک تو اس کی تعمیل کو فرمانبرداری کہیں گے، مگر جب حکم اور فرمان کا وقت ہی گزر گیا، تو اس وقت اس کی تعمیل کو نافرمانی کہتے ہیں۔ پس عیسائی اور یہود کو اس وقت مسلمان کہہ سکتے ہیں، جب وہ آنحضرت ﷺ کی اتباع کریں۔

یہ کہنا ”قرآن چونکہ پہلی کتابوں میں ہے، اس لئے پہلی کتابوں پر عمل کرنے والا قرآن کا عامل ہے“ یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا ذکر پہلی کتابوں میں ہے یا اس کے بعض مسائل، نہ جمیع مسائل۔ اس آیت ﴿إِن هَذَا لَفِي الصَّحَفِ الْأُولَى﴾ (یہ مسئلہ پہلی کتابوں میں ہے) سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ سارا قرآن پہلی کتابوں میں ہے۔^① پس ثابت ہوا کہ تورات کے غیر محرف ہونے پر کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں، بلکہ داخلی اور خارجی ایسی دلیلیں موجود ہیں، جن سے تورات اور انجیل کا محرف ہونا پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث کا حوالہ ہم ”یسعیاہ“ کی کتاب (باب: ۳۲) سے دے چکے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے جس کتاب سے یہ حوالہ نقل کیا ہے، وہ اصل کتاب نہ ہو، بلکہ اس میں نقل ہو اور نقل میں ناقل کی غلطی ہو۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کوئی معصوم نہ تھے کہ ان سے غلطی کا تصور ممنوع ہو، یعنی ہو سکتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے ناقل پر اعتماد کر کے لکھ دیا ہو۔

چھٹا اعتراض:

اس کے بعد بخاری پر ایک اور اعتراض کرتے ہیں:

① اکثر مفسرین کے نزدیک مذکورہ بالا آیت کریمہ میں مذکورہ اشارہ (هذا) کا مرجع اس سورت میں مذکور تزکیہ نفس، ذکر اللہ اور آخرت کے متعلق عقیدہ ہے، اس سے سارا قرآن مجید مراد

نہیں۔ (تفسیر القرطبی: ۲۰/۲۵، زاد المسیر: ۴/۴۳۳، فتح القدیر: ۵/۶۰۳)

”چہارم: قرآن اور تاریخ ہر دو شاہد ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نہ لکھ سکتے اور نہ لکھی ہوئی چیز پڑھ سکتے تھے۔ لیکن ”بخاری“ میں ہے: ”وہ لکھ سکتے تھے۔“ حدیث یوں چلتی ہے کہ جب حضور ﷺ ذیقعدہ میں عمرہ کیلئے تشریف لے گئے، تو اہل مکہ نے کچھ پابندیاں عائد کر دیں اور اس سلسلہ میں ایک تحریری معاہدہ ہوا، جسے ”محمد رسول اللہ“ تسلیم کرتے ہیں۔ اہل مکہ نے ”رسول اللہ“ کے لفظ پر اعتراض کیا اور کہا کہ ہم آپ کو ”رسول اللہ“ ماننے کیلئے تیار نہیں، اس لئے آپ ”محمد بن عبد اللہ“ کی حیثیت سے معاہدہ کریں۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”رسول اللہ“ کے الفاظ مٹا دو:

”قال لا والله لا أمحوك أبدا فأخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم الكتاب فكتب هذا ما قاضى عليه محمد بن عبد الله.....“^①

”علی نے جواب دیا: خدا کی قسم میں آپ کے نام سے ”رسول اللہ“ کا لفظ جدا نہیں کروں گا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے وہ کاغذ اٹھا لیا اور اس پر لکھ دیا: یہ وہ فیصلہ ہے جسے محمد بن عبد اللہ تسلیم کرتے ہیں۔“ بخاری کی ایک اور روایت (۱۳۵/۲) بتلاتی ہے کہ حضور ﷺ نے ”رسول اللہ“ کا لفظ کھرچ ڈالا تھا^② اور کاتب نے ”ابن عبد اللہ“ کے لفظ کا اضافہ کر دیا تھا۔ اسی حدیث پر باقی محدثین اعتماد کرتے ہیں

① صحیح البخاری: کتاب الصلح، باب کیف یكتب هذا ما قاضى فلان بن فلان.....

الحديث (۲۵۵۲)

② صحیح البخاری: کتاب الخمس، باب المصالحة على ثلاثة أيام أو وقت معلوم، رقم

الحديث (۳۰۱۳)

اور تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے، اس لئے لکھنے والی حدیث غلط ہے۔“ (دوا اسلام: ۱۹۶)

جواب:

پہلی حدیث میں جو ”کَتَبَ“ (لکھا) ہے، اس کے معنی ”لکھانے“ کے ہیں، جیسے قرآن مجید میں جا بجا اس صیغہ کو اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے:

﴿کتاب اللہ علیکم﴾^①

”یہ حکم اللہ نے لکھا ہے۔“

یعنی اس کو قرآن میں نازل کیا ہے، جس کے لکھنے کا حکم ہے۔

﴿ونکتب ما قدموا﴾^②

ہم لکھتے ہیں، جو انہوں نے آگے بھیجا۔“

﴿سنکتب ما قالوا﴾^③

”جلدی لکھیں گے ہم ان کی بات۔“

ان تینوں مقامات پر لکھنے سے مراد لکھانا اور لکھنے کا حکم کرنے کے ہیں۔ لہذا یہ پہلی حدیث بھی صحیح ہے اور ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض بھی نہیں!



① النساء: ۲۴

② یسین: ۱۲

③ آل عمران: ۱۸۱

نواں باب

”حضور کی تصویر حدیث میں“

”قرآن میں حضور ﷺ کے متعلق ارشاد ہے:

﴿إِنَّكَ لَعَلَىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ﴾^①

”اے رسول! تمہارا کردار عظیم الشان ہے۔“

اس میں کلام نہیں کہ حضور کے ان اوصاف جمیلہ کا چرچا صرف احادیث کی بدولت ہوا، اور ہم حدیث کے اس گراں بہا ذخیرے پر ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ لیکن بعض ایسی احادیث بھی ہیں، جو کائنات کے اس محسن اعظم کا کردار نہایت بھیانک شکل میں پیش کرتی ہیں، اتنا بھیانک کہ ہم شرم سے کسی کو بتا بھی نہ سکیں۔ درست کہا تھا مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے کہ ”میں کسی نو مسلم یورپین کو صحیح بخاری نہیں پڑھا سکتا اور اس کی وجہ میں مجلس عام میں نہیں بتا سکتا۔“ (الفرقان شاہ ولی اللہ: ۲۸۵)

دہ وجہ کیا تھی؟ آئیے آج ہم اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں!

اعتراض:

صحیح بخاری میں روزے کی نہایت عمدہ تشریح درج ہے:

”فإنه يترك طعامه وشرابه وشهوته من أجلي“^②

”روزے دار اپنا کھانا پینا اور اپنی شہوت میرے لئے چھوڑ دیتا ہے۔“

① القلم: ۴

② صحيح البخاري: كتاب الصوم، باب فضل الصوم، رقم الحديث (۱۷۹۵)

ایک اور حدیث دیکھئے:

”من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة في أن يدع طعامه وشرابه“ (بخاری) ^①

”جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ اور بدکاری سے باز نہیں رہ سکتا، اسے کہہ دو کہ اس کو بھوک اور پیاس کی قطعاً ضرورت نہیں!“
ان احادیث میں روزے کا فلسفہ واضح ہو گیا۔

آئیے ذرا دیکھیں کہ حضور ﷺ نے اپنے ان ارشادات پر خود کہاں تک عمل کیا؟
”عن عائشة رضي الله عنها قالت كان النبي صلى الله عليه وسلم يقبل ويباشر وهو صائم“ (بخاری) ^②

”حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ روزہ رکھ کر اپنے ازواج کے بوسے لیتے اور ان سے مباشرت فرماتے۔“

مباشرت کے معنی ہیں مجامعت اور بوس و کنار وغیرہ۔ لیکن اس حدیث میں مباشرت سے کیا مراد ہے؟ مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی سنئے!

آپ ”صحیح مسلم“ کی اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
”المباشرة فوق السرة وتحت الرقبة بالذكر والقبلة أو المعانقة أو اللمس وغير ذلك حلال باتفاق المسلمين“

(فتح الملهم ۱/۴۵۶)

”آپ روزہ رکھ کر عورت کے ساتھ ٹانف سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے

① صحیح البخاری: کتاب الصوم، باب من لم يدع قول الزور والعمل به في الصوم، رقم

الحدیث (۱۸۰۴)

② صحیح البخاری: کتاب الصوم، باب المباشرة للصائم، رقم الحدیث (۱۸۲۶)، صحیح

مسلم: کتاب الصیام، باب بیان أن القبلة في الصوم ليست محرمة، رقم الحدیث (۱۱۰۶)

مباشرت کر سکتے ہیں۔ یعنی اسے چھو سکتے ہیں، چوم سکتے ہیں، گلے لگا سکتے ہیں اور آلہ تناسل کا استعمال کر سکتے ہیں۔“
یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے:

اول: روزے کا مقصد شہوت کو ترک کرنا ہے، نہ کہ بوس و کنار اور گھٹنوں کے نیچے آلہ تناسل کا استعمال!

ملاحظہ ہو: یہ حدیث اوپر والی دو حدیثوں سے متصادم ہوتی ہے۔

سور: یہ قرآن سے ٹکراتی ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَاءِكُمْ﴾^①
”ماہ صیام میں رات کے وقت ہم تمہیں بیویوں سے متنع ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔“

آغاز اسلام میں رات کے وقت بیویوں سے اختلاط ممنوع تھا، بعض صحابہ رک نہ سکے، تو یہ پابندی دور کر دی گئی، تو فرمایا کہ ”اب تم مباشرت کر سکتے ہو۔“^②

یعنی صرف رات کے وقت مباشرت کی اجازت ہے، لیکن یہ حدیث مکمل چھٹی دیتی ہے۔

چھٹا اور: گناہ اور محرمات گناہ ہر دو سے بچنا ضروری ہے، اپنے آپ کو دیکھو اور انصافاً کہو کہ کیا آج تک کوئی شوہر بیوی کو چومنے چاٹنے اور گلے لگانے کے بعد جماع سے بچ سکا ہے؟

پنجم: حضور ﷺ کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم یہ سن لے کہ حضور ۵۶

① البقرة: ۱۸۷

② صحيح البخاري: كتاب التفسير، باب ﴿أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَاءِكُمْ﴾ رقم الحديث (۴۲۳۸)، تفسير الطبري: ۱۶۷/۲

برس کی عمر میں روزہ رکھ کر مباشرت فرمایا کرتے تھے، تو وہ ہمارے نبی کے متعلق کیا رائے قائم کریگا؟ یہی وہ حدیث ہے، جس نے مجھے احادیث سے بدظن کیا اور اس کتاب کی محرک بنی۔“ (دو اسلام: ۲۰۲)

جواب

ان تمام اعتراضات کا مار دو چیزوں پر ہے:

۱۔ روزہ کی حقیقت۔

۲۔ مباشرت کے حقیقی اور کنائی معنی میں فرق۔

روزہ بالاتفاق اکل و شرب و جماع کے ترک کا نام ہے، جس کی ابتداء صبح صادق سے ہوتی ہے اور اختتام سورج کے غروب ہونے پر۔ پہلی اور دوسری حدیث میں جو لفظ ”شہوت“ آیا ہے، اس سے مراد جماع ہے، پس باقی چیزیں حرام نہیں۔ مباشرت کا لفظ قرآن مجید میں جماع سے کنایہ ہے اور حدیث میں لغوی معنی مراد ہے، مگر جماع اس میں داخل نہیں۔ کیونکہ مائی صاحبہ سے ہی دوسری حدیث میں آیا، کہ آنحضرت ﷺ اپنی حاجت کو روکنے پر قادر تھے۔^۱ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ”مباشرت“ سے مراد ماسوا جماع ہے۔ اور ”مباشرت“ کا لفظ لغوی معنی کے اعتبار سے اگرچہ ماسوا جماع کے سبب کو شامل ہے، مگر یہ ضروری نہیں کہ جتنے معانی اس کے مولانا شبیر احمد صاحب نے یہ گنوائے ہیں، وہ سب یہاں مراد ہوں، صرف بدن سے بدن لگ جائے، تو بھی ”مباشرت“ کا لفظ بولا جاسکتا ہے۔^۲

۱۔ بلکہ اس حدیث میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں، جو برق صاحب نے کسی غرض کی وجہ سے نقل نہیں کیے، حدیث کا بقیہ حصہ ہے: ”وكان أملككم لإربه“ یعنی رسول اللہ ﷺ اپنی خواہشات پر تم سب سے زیادہ قابو رکھتے تھے۔ صحیح البخاری (۱۸۲۶)

۲۔ لفظ ”مباشرت“ کا اصل اشتقاق ”بشّر“ ہے، جس کا معنی ظاہری چیز ہے، اسی سے لفظ ”بشرۃ“ مأخوذ ہے، جس کا معنی انسان کی ظاہری جلد ہے۔ (معجم مقاییس اللغة: ۱۱۷) لہذا ”مباشرت“ کا

آپ کا پہلا اعتراض اس لئے غلط ہے کہ روزے کی حقیقت میں ہر قسم کی شہوت کو روکنا داخل نہیں، بلکہ شہوتِ جماع سے روکنا داخل ہے اور دوسری حدیث میں بد عملی اور جھوٹ سے بچنا بھی لازمی قرار دیا گیا ہے۔ مگر بوس و کنار وغیرہ سے بچنا مقصدِ روزہ نہیں ^① نہ اس پر کوئی آیت و حدیث صراحتاً دلالت کرتی ہے۔ آپ اپنے

← لغوی معنی ہوا: دو انسانوں کی جلد کا ملنا“ اور اس کا استعمال جماع اور بدون جماع بدن کے ملاپ پر ہوتا ہے۔ اور علماء لغت نے بھی مذکورہ بالا حدیث میں مباشرت کا معنی ”ملا مسہ“ کیا ہے۔ یعنی جسم کا کسی دوسرے جسم سے ملنا۔ دیکھیں: کتاب العین: ۶/۲۵۹، لسان العرب: ۴/۵۹، النہایۃ لابن الاثیر: ۱/۳۳۳، تاج العروس، مادة (بشر) نیز دیکھیں: فتح الباری: ۴/۱۴۹

① اور اس حدیث سے یہی بیان کرنا مقصود ہے..... دین اسلام دین فطرت ہے۔ یہ دین انسانوں کے لیے نازل ہوا اور انسانی فطرت کے کسی بھی پہلو اور کسی بھی گوشہ کو اس نے نظر انداز نہیں کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس طرح کی باتیں (جن کے متعلق صاحب ”دو اسلام“ نے لکھا ہے کہ ہم ”مارے شرم کے کسی کو بتا بھی نہ سکیں) امت کو بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ اسلام اگر بعض باتوں سے منع کر سکتا اور ان پر پابند عائد کر سکتا ہے، تو اسی قسم کی بعض دوسری باتوں کی اجازت بھی تو دے سکتا ہے۔ اسلام اگر روزے کی حالت میں جماع سے منع کر سکتا ہے (جو منع ہے) تو بوس و کنار کی اجازت کیوں نہیں دے سکتا (جو کہ روزے کی حالت میں جائز ہے؟)

دین اسلام صرف عقائد کا نام نہیں، بلکہ انسان کی عملی زندگی بھی اس میں داخل ہے، جہی تو انسانی افعال میں سے بعض پر پابندی عائد کرتا ہے، بعض کو جائز قرار دیتا ہے اور بعض کو ثواب کا درجہ دے دیتا ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ انسانی افعال کے ساتھ اس دین کا گہرا تعلق ہے، تو پھر ان کی تفریق و توضیح میں شرم کا کیا سوال؟..... یہ باتیں تو دین کا حصہ ہیں، اسی لیے ایک ایک بات پر نہایت باریک بینی کے ساتھ بحث کی گئی، مبادا کوئی شخص اپنے اعمال ضائع کر بیٹھے یا بلاوجہ شکوک و شبہات اور اوہام و فتنوں کا شکار ہو کر رہ جائے۔

پھر یہ بات بھی زیرِ نظر رہنی چاہیے کہ حدیث قرآن کی تفسیر ہے، اگر قرآن مجید ﴿فَالَا يَٰٓبَٰشِرُ وُھُنَّ﴾، ﴿فَاتَّوَا حَرَنُکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ﴾، ﴿اَلَمْ تَکْ تُطْفِئْ مِنْ مَّیْنِیْ یٰۤمُنٰی﴾ (ایک صاحب کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ حدیث میں نہایت گندی گندی باتوں کا ذکر ہے، حتیٰ کہ منی کے مسائل پر بھی بحث کی ←

دماغ میں روزہ کا مقصد یہ فرض کر رہے ہیں کہ مطلقاً شہوت کو ترک کر دے، یعنی اچھا کپڑا نہ پہنے، بدن میں تیل نہ لگائے، کنگھی نہ کرے، یعنی کوئی بھی کام خواہش کے مطابق نہ کرے..... یہی بنیادی غلطی ہے، جس کی بناء پر آپ نے حدیث پر اعتراض کیا۔

دوسرا اعتراض بھی اس لئے غلط ہے کہ بوس و کنار اور بدن کا چھونا شہوتِ ممنوعہ میں داخل نہیں۔ نہ ”مباشرت“ کے مرادی معنی میں داخل ہے۔ اس واسطے حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔ تیسرا اعتراض بھی باطل ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ”مباشرت“ کنایہ ہے جماع سے، اور حدیث میں اس کا لغوی معنی مراد ہے۔ اس لفظ کے مختلف معنے ہوں، تو ان کے احکام میں نفی و اثبات کی صورت بن جاتی ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾^①

﴿محی ہے..... فکر ہر کے بقدر ہمت دوست﴾ وغیرہ قسم کے الفاظ و فقرات کا استعمال کر سکتا ہے۔ تو حدیث پر بے شری کا فتویٰ کیوں لگایا جاتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ آپ کا فلسفہ شرم، حدیث اور قرآن کے فلسفہ سے مختلف ہے۔ کتاب و سنت میں اگر کسی مسئلہ کو فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مفصل بیان کیا جاتا ہے، تو یہ چیز شرم سے بعید معلوم ہوتی ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ بات بات میں فحش گالیوں کا بے محابا استعمال ہوتا ہے، حتیٰ کہ کلام میں زور ہی گالیوں کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے۔ آپ کے شاعر اور ادیب عورت کے جسمانی اعضاء کے ایک ایک حصہ کی تفصیل بیان کریں۔ آپ کے مصوران نقوش کو اپنی تصاویر میں بڑھ کر اجاگر کریں۔ آپ کے رسائل و اخبارات نگلی تصویریں چھاپیں تو کوئی حرج نہیں؟ معاف کیجیے کہ اگر نو مسلم یورپین موجودہ دور کے مسلمانوں کی ان حرکتوں کو دیکھ کر دینِ اسلام سے متنفر نہیں ہو سکتے، تو مطمئن رہیے کہ وہ بخاری شریف کی ان احادیث کو پڑھ کر دینِ اسلام سے قطعاً دور نہیں بھاگیں گے، جو انسانی فطرت کو حد کمال تک ملحوظ رکھ کر مسائل بیان کرتی ہیں۔

”جو تزکیہ کرے (یعنی اپنے آپ کو پاک کرے) وہ کامیاب ہوگا۔“

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَلَا تَزْكُوا أَنْفُسَكُمْ﴾^①

”اپنا تزکیہ (اپنے آپ کو پاک سمجھنا) نہ کرو۔“

چوتھا اعتراض اس لئے باطل ہے کہ سڈ ذرائع کا مسئلہ شریعت میں مستقل ہے۔

اس میں ہر جگہ کلی قانون نہیں ہوتا، ہر آدمی اس معاملہ میں اپنے نفس کا فقیہ ہے۔ جس

کو ڈر ہو، وہ ایسا نہ کرے، جس کو نہ ڈر ہو، وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اگرچہ عمر رسیدہ ہونے

کی بناء پر بعض آدمیوں کے لئے موزوں نہیں، مگر بیوی اگر جوان ہو، اور اس کی

خواہش ہو، تو رکنا بھی دانشمندی نہیں۔ بہر کیف شریعت نے بھی اس میں سڈ ذرائع کا

خیال رکھا ہے۔^② یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک جوان کو بوس و کنار کی

اجازت نہ دی، لیکن ایک بوڑھے نے اجازت چاہی، تو اس کو اجازت دیدی۔^③

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس سے منع کرتے تھے،^④ مالکی مذہب میں بھی منع ہے۔^⑤

اعتراض

”عن عائشة أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يقبلها و هو

① النجم: ۳۲

② حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ ایسی ہی خود ساختہ پابندیوں کے متعلق فرماتے ہیں: ومن خاف على أمة

محمد مالم يخفه عليها نبيها فقد جاء من التعسف بما لا يخفى“ (التمهيد: ۲۲/۲۶۷)

③ سنن أبي داود: كتاب الصيام، باب كراهيته للشباب، رقم الحديث (۲۳۸۷)

④ الموطن: ۱/۲۹۳، مصنف عبد الرزاق: ۴/۱۸۹، مصنف ابن أبي شيبة: ۲/۳۱۷، مرفوع

حدیث سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے اور کئی صحابہ سے بھی اس کا جواز مروی ہے، لہذا اگر انسان کو

اپنے آپ پر قابو ہو، تو یہ عمل مباح ہے۔ واللہ اعلم۔

⑤ الاستذکار: ۳/۲۹۶، المدونة الكبرى: ۱/۲۶۸

صائم ویمص لسانہا“^①

”نبی ﷺ روزہ کی حالت میں بوسہ لیتے اور زبان چوستے!“
کیا زبان چوسنے سے دوسرے کا تھوک اپنے تھوک میں مل کر پیٹ میں
نہیں چلا جاتا اور کیا اس صورت میں روزہ باطل نہیں ہو جاتا؟

(دوا سلام: ۲۰۵)

جواب:

چوسنے سے لازم نہیں آتا کہ زبان کی تھوک کو نگل لیں، چوس کر انسان تھوک
بھی سکتا ہے، اس میں کوئی اشکال نہیں، اشکال جب ہوتا، اگر حدیث میں ننگلنے کا لفظ
ہوتا۔^②

اعتراض:

اس کے بعد ایک حدیث بیان کی ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ
”مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھتیجے عبداللہ بن عبدالرحمن کو کہا کہ اپنی
بیوی کا بوسہ لینے اور اس کے ساتھ دل لگنی کرنے سے تجھے کیا چیز مانع
ہے؟ عبداللہ نے کہا: میں روزہ کی حالت میں ایسا کر سکتا ہوں؟ آپ نے

① سنن أبي داود: كتاب الصيام، باب الصائم يبلع الريق، رقم الحديث (۲۳۸۶)، مسند
أحمد: ۱۲۳/۶، صحيح ابن خزيمة: ۲۴۶/۳، سنن البيهقي: ۴/۲۳۴، اس حدیث کو ابن
عدی، زیلعی، ابن حجر اور البانی رحمہم اللہ نے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔ (الکامل: ۱۹۸/۶،
۴۶۸، نصب الراية: ۴/۳۲۲، فتح الباري: ۴/۱۵۳، ضعيف أبي داود: ۱/۲۳۶ (۵۱۵)

② اسی لیے امام زیلعی فرماتے ہیں کہ امام ابو داود کی اس حدیث پر بایں الفاظ تہویب متنازع اور درست
نہیں، کیونکہ چوسنے سے نگلنا لازم نہیں آتا، ممکن ہے کہ آپ ﷺ چوسنے کے بعد تھوک باہر پھینک
دیں۔ نصب الراية: ۴/۳۲۲، نیز دیکھیں: عون المعبود: ۱۰/۷

فرمایا: ہاں! ^① مائی صاحبہ نے اُسود کو روکا ^② اور اپنے بھتیجے کو اجازت دیدی!“

جواب:

ان دونوں میں فرق ہوگا، ایک کے متعلق خطرہ ہوگا، دوسرے کے متعلق خطرہ نہیں ہوگا اور یہ باتیں مخاطب متکلم سمجھ سکتا ہے۔ بوسہ اور عورت سے کھیلنا فی نفسہ برائی نہیں۔ اگر خطرہ ہو، تو منع ہے، ورنہ نہیں۔ مفتی کو حالات کو سامنے رکھ کر فتویٰ دینا چاہئے۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اور حالات، ماحول، ملک اور رواج کے اختلاف سے گفتگو میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔

اعتراض:

آگے ایک عجیب بات تحریر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ:
”آج تک کسی بیوی نے اپنے شوہر سے مباشرت کی التجا نہیں کی اور نہ مرد کے سامنے عریاں بات کہی۔“

جواب:

اس جگہ مصنف کو قرآن کی آیت بھی یاد نہیں رہی:
﴿وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ﴾

① الموطا: ۲۹۲/۱، مصنف عبد الرزاق: ۱۸۳/۴، شرح معانی الآثار: ۹۵/۲،

② مسند أحمد: ۱۲۸/۶، سنن النسائی الكبرى: ۲/۲۱۰، سنن البيهقي: ۴/۲۳۲، مسند

إسحاق بن راهويه: ۳/۸۸۷، اس کی سند میں ”حماد بن أبي سليمان“ ہے۔ علامہ ناصر الدین

البانی رحمۃ اللہ علیہ اس اثر کے متعلق فرماتے ہیں: ”و هو بهذا السياق عن الأسود غريب، تفرد به

جماعة عن إبراهيم عنه، و حماد هو ابن أبي سليمان مع فضله و فقهه في حفظه ضعف،

فلا يقبل منه ما تفرد به مخالفا فيه الثقات (إرواء الغلیل: ۴/۸۰).

وقالت هیت لك ﴿١﴾

کہ جس عورت کے گھر یوسف علیہ السلام رہتے تھے، اس نے مباشرت کی التجا کی اور دروازے بند کر کے عریاں بات کہی۔

اعتراض: مباشرت در حیض

قرآن شریف میں مذکور ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ﴾ ﴿٢﴾

اس آیت میں دو حکم دیئے گئے ہیں:

اول: حیض کی حالت میں عورتوں سے دور رہیے۔

دوم: ان کے قریب تک مت جائیے۔

ذرا دیکھیں کہ حدیث نے اس ”قریب و دور“ کی کیا تشریح پیش کی ہے:

”عن عائشة كان يأمرني فأتزر فيباشرنى وأنا حائض“ ﴿٣﴾
 ”حضرت عائشہ فرماتی ہیں: مجھے آپ حکم دیتے، میں ازار باندھ لیتی، پھر مجھ سے مباشرت کرتے۔“

اس سے اگلی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ ”عائشہ فرماتی ہیں: جب حضور حیض

١ یوسف: ٢٣

٢ البقرة: ٢٢٢

٣ صحيح البخاري: كتاب الحيض، باب مباشرة الحائض، رقم الحديث (٢٩٥)

کی حالت میں مباشرت کا ارادہ فرماتے، تو پہلے ایک تہہ پوش پہنا دیتے، پھر مباشرت کرتے۔“^① یہ ہے قریب و دور کی تشریح حدیث کی! ہم عرض کر چکے ہیں کہ محرکات گناہ سے بچنا بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنا گناہ سے، اور اسی لئے قرآن نے بار بار کہا ہے کہ حدود الہی کے قریب مت جاؤ،^② فواحش کے قریب مت جاؤ،^③ مشہور حدیث ہے: ”من حام حول الحمی وقع فیہ“^④ ”چراگاہ کے ارد گرد گھومنے والا جانور عموماً چراگاہ میں گھس جاتا ہے۔“ ایک اور حدیث ہے کہ جو شبہات سے بچے، وہ اپنے دین اور عزت کو بچا لیتا ہے^⑤ اور حضور ﷺ اس معاملہ میں سخت محتاط واقع ہوئے ہیں: ”واللہ انی لأتقاکم“^⑥

① مصدر سابق، رقم الحدیث (۲۹۶)، برق صاحب نے اس حدیث کے باقی ماندہ حصہ کو نقل کرنے کے بعد اس کا ترجمہ نہیں کیا، کیونکہ وہ ان کے خود ساختہ مفہوم کے منافی ہے، ملاحظہ فرمائیں: ”وایکم یملک لربہ کما کان النبی ﷺ یملک لربہ“ ان الفاظ میں اشارہ ہے کہ قوت ضبط کی موجودگی میں یہ امر مباح ہے، مطلقاً نہیں!

② ویکم: البقرة: ۱۸۷

③ الأنعام: ۱۵۱

④ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس معنی کی حدیث روایت کی ہے، جس کے الفاظ ہیں: ”من یرتع حول الحمی یوشک أن یواقعہ“ (بخاری: ۱۹۴۶) مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نہیں ملی۔ واللہ اعلم

⑤ صحیح البخاری: کتاب الإیمان، باب فضل من استبرأ لدینہ، رقم الحدیث (۵۲)، صحیح

مسلم: کتاب المساقاۃ، باب أخذ الحلال وترك الشبهات، رقم الحدیث (۱۵۹۹)

⑥ صحیح مسلم: کتاب الصیام، باب بیان أن القبلة فی الصوم لیست محرمة علی من لم

تحرك شہوتہ، رقم الحدیث (۱۱۰۸)

”اللہ کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔“

پھر ہم کیسے تسلیم کر لیں کہ آپ اس حالت میں مباشرت کریں!

(دوا سلام: ۱۱۰)

جواب:

اس اعتراض میں پھر وہی کنایہ اور لغوی معنی میں عدم فرق ہے۔ قرآن میں اعتزال اور عدم قرب ”ترک جماع“ سے کنایہ ہے، جس طرح عورت کے پاس آنا بھی جماع سے کنایہ ہے، یہاں ان الفاظ کا استعمال لغوی معنی میں نہیں، اور حدیث میں جو ”مباشرت“ کا لفظ آیا ہے، وہاں لغوی معنی مراد ہے۔ جس کی تفصیل ہم گذشتہ ابواب میں بیان کر آئے ہیں۔

شبہات کی حدیث کا بیان یہاں بے معنی ہے، کیونکہ ”مباشرت“ بمعنی لغوی حلال ہے اور مباشرت جو جماع سے کنایہ ہے، وہ بحالت حیض و روزہ حرام ہے، لہذا کوئی بات یہاں مشتبہات میں داخل نہیں!

اسی طرح اس حدیث ”لا تقاکم“ (کہ میں تم سب سے زیادہ متقی ہوں) کا یہاں پیش کرنا بھی بے محل ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جو کام آنحضرت ﷺ نے کیا، وہ تقویٰ کے خلاف نہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ تقویٰ کے انتہائی مقام پر ہیں۔

اسی طرح جو حدیث میں ہے: ”وکان أملكکم“

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی حاجت پر قابو رکھتے تھے۔ دواعی شہوت سے آپ ﷺ کے مغلوب ہونے کا اندیشہ نہ تھا، یعنی جس کو اندیشہ ہو، وہ ایسا نہ کرے۔ دوسرا یہ مطلب ہے کہ دواعی شہوت کا استعمال کرنا، اس لئے نہ تھا

کہ آپ ﷺ کو اپنی ذات پر کنٹرول تھا، بلکہ اس لئے تھا کہ اس میں کسی قسم کی قباحت نہ تھی۔

اعتراض:

اس کے بعد ایک اور حدیث ذکر کرتے ہیں:

”کردار رسول ﷺ پر ایک اور جھوٹ“

”عن عائشة قالت كنت أغتسل أنا والنبي صلى الله عليه

وسلم من إناء واحد“^① (بخاری)

”حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن میں

نہاتے تھے۔“

مسلم میں اس طرح ہے: ”جنابت کے غسل میں، میں اور رسول اللہ ﷺ

ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے۔“^②

مطلب یہ کہ حضور ازواج کے ہمراہ برہنہ غسل کرتے تھے (دو اسلام: ۲۱۱)

جواب:

حدیث میں تو صرف یہ ذکر ہے کہ دونوں ایک برتن میں سے غسل کیا کرتے

تھے۔ اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ دونوں برہنہ ہوتے تھے۔ آگے جا کر خود ہی

لکھتے ہیں۔ ”میں مانتا ہوں کہ شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔“!!

① صحیح البخاری: کتاب الغسل، باب هل يدخل الجنب يده في الإناء قبل أن يغسلها إذا لم

يكن على يده قدر غير الجنابة، رقم الحديث (۲۵۸)

② صحیح مسلم: کتاب الحيض، باب القدر المستحب من الماء..... رقم الحديث (۴۲۱)

اعتراض:

اس کے بعد ایک اور حدیث ذکر کی ہے:

”عن عائشة قالت كنت أشرب وأنا حائض ثم أنا وله النبي ﷺ فيضع فاه على موضع في فيشرب“^① (مسلم)

”حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں حیض کی حالت میں پانی پی کر رسول اللہ کو دے دیتی، وہ میرے منہ والی جگہ پر منہ رکھ کر بچا ہوا پانی پی جاتے۔“

(دو اسلام: ۲۱۲)

جواب:

اس سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ حیض والی عورت کا بچا ہوا پانی پلید نہیں اور نہ اس کا منہ پلید ہے۔

اعتراض:

اس کے بعد کہتے ہیں:

”اور سنئے! ابوسلمہ کہتے ہیں: میں اور حضرت عائشہ کا بھائی حضرت عائشہ کے پاس گئے، آپ کے بھائی نے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح غسل فرمایا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ نے پانی سے بھرا ہوا ایک برتن مگلوایا، جس سے آپ نے غسل کیا اور سر پر بھی پانی ڈالا، درمیان میں ایک پردہ لٹکا ہوا تھا۔ (بخاری)^②

① صحیح مسلم: کتاب الحيض، باب جواز غسل رأس زوجها و ترجمه و طهارة سورها والاتكاء في حجرها وقراءة القرآن فيه، رقم الحديث (۳۰۰)

② صحیح البخاری: کتاب الغسل، باب الغسل بالصاع ونحوه، رقم الحديث (۲۴۸) ←

سوال یہ ہے کہ آیا یہ دونوں اس پردے میں حضرت عائشہ کو غسل کرتے دیکھ رہے تھے؟ اگر جواب نفی میں ہے، تو غسلِ رسول کی نمائش کرنے کا مقصد کیا تھا، اگر اثبات میں ہے، تو پھر وائے افسوس کہ چار نامحرم آنکھیں حضرت عائشہ کو غسل کرتے دیکھیں!“ (دوا اسلام: ۲۱۳)

جواب:

محدثین جنہوں نے ذخیرہ احادیث ہم تک پہنچایا، اتنی عقل تو رکھتے تھے کہ اس حدیث پر ایک معمولی عقل والا آدمی بھی اعتراض کر سکتا ہے اور ایک کمزور ایمان والا عام مسلمان بھی ایسی بات کو غیرت کے منافی خیال کرے گا۔ لہذا ایسی احادیث کو نقل نہ کرنا چاہئے۔ پھر بھی انہوں نے اس حدیث کو نقل فرمایا، تو اس سے ان کا مقصد کیا ہے؟

اصل میں حدیث کو بڑے غلط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہاں مقصد غسلِ رسول کی نمائش نہ تھا، بلکہ یہ بتلانا مقصود تھا کہ آنحضرت ﷺ غسل کیلئے نہایت قلیل مقدار میں پانی استعمال فرماتے تھے۔

مائی صاحبہ نے ایک صاع کے قریب پانی منگایا اور پس پردہ اس سے غسل فرمایا، ابوسلمہ اور آپ کے بھائی نے آپ کو غسل کرتے ہوئے نہیں دیکھا، کیونکہ درمیان میں پردہ تھا اور اصل مقصد یہ بتلانا تھا کہ اتنے قلیل پانی سے بھی غسل ہو سکتا ہے۔ مائی صاحبہ نے یہ خیال فرماتے ہوئے کہ شاید اس قدر قلیل پانی سے غسل کر لینا کسی کیلئے ناقابل یقین ہو، ایک صاع یا اس کے قریب پانی سے خود غسل کر کے اس امر کو حد یقین تک پہنچا دیا۔ اور یہ ہم تاویل نہیں کر رہے، بلکہ یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے ہی

« صحیح مسلم: کتاب الحيض، باب القدر المستحب من الماء في غسل الجنابة، وقم

الحدیث (۳۲۰)

یہ باب باندھا ہے:

”باب الغسل بالصاع ونحوہ“

”ایک صاع اور اس کے قریب اتنے مقدار سے غسل جائز ہے۔“

اور یہ حدیث اسی باب کے ذیل میں دی گئی ہے۔ حدیث میں یہ لفظ ہیں:

”قدعت بإناء نحواً من صاع“

”آپ ﷺ نے ایک برتن میں جو صاع کے قریب تھا، پانی منگایا“

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سوال حقیقت میں پانی کی مقدار سے تھا، نہ کہ غسل کے طریقہ سے، مؤخر الذکر صورت میں غسل کا پورا طریقہ زبانی بھی بتایا جا سکتا تھا، جو کسی صورت بھی ناقابل یقین نہ تھا۔

پھر یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ صاحبہ کے رضاعی بھانجے تھے اور دوسرے ان کے اپنے بھائی تھے۔ لہذا دونوں محرم تھے، جیسا کہ فتح الباری میں ہے۔^①

اعتراض:

اس کے بعد لکھتے ہیں:

ذرا اس حدیث کے الفاظ دیکھئے:

”عن أبي هريرة أن النبي صلى الله عليه وسلم قال إذا جلس بين شعبها الأربع ثم جهدها فقد وجب عليه الغسل وإن لم ينزل“^②

① فتح الباری: ۱/۳۶۵

② صحیح البخاری: کتاب الغسل، باب إذا التقى الختان الختان، رقم الحدیث (۲۸۷)،

صحیح مسلم: کتاب الحيض، باب نسخ الماء من الماء، رقم الحدیث (۳۴۸)

ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی مرد عورت کی ٹانگوں کے درمیان بیٹھ کر زور لگانا شروع کر دے، تو اس کیلئے نہانا ضروری ہو جاتا ہے، خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔“
حدیث کی زبان دیکھئے! (دو اسلام: ۲۱۴)

جواب:

یہ تو مترجم کا اختیار ہے، چاہے مہذب لفظ استعمال کرے یا برہنہ، حدیث میں جو لفظ ہیں، اس کا ترجمہ ”ٹانگوں کے درمیان بیٹھ کر زور لگانا“ صریح بے انصافی ہے۔ حدیث میں ”شعب“ کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی شاخوں اور ٹہنیوں کے ہیں اور یہ کنایہ ہے، لیکن ٹانگوں کا لفظ صریح ہے۔ پھر ”جَهْدَهَا“ کا معنی زور لگانے کے بھی ٹھیک نہیں، بلکہ اس سے بہتر لفظوں میں اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً پوری حدیث کا ترجمہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ

”جب کوئی شخص عورت کے پاس آئے، تو خواہ انزال ہو یا نہ ہو، اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے!“

اعتراض: حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح

”حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جنگ خیبر کے اسیروں میں شامل تھیں۔ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ خود چن لو۔ اس نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو منتخب کیا، بعد میں کسی نے کہا کہ یہ ایک رئیس کی بیٹی ہے، اسے لونڈی بنا کر اس سے خدمت لینا ظلم ہے۔ اس لئے حضور ﷺ اسے حرم نبوی میں داخل کر لیں۔ حضور ﷺ نے یہ تجویز مان لی اور اسے آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ بات

سیدھی سادی تھی اور تمام احادیث میں یہ واقعہ اسی طرح بیان ہوا تھا، لیکن ”بخاری“ کی ایک روایت میں اس واقعہ کو یوں مسخ کیا گیا ہے کہ تمام داستان ہجو بن کر رہ گئی ہے۔ حضرت انس کہتے ہیں:

”.....ثم قدمنا خيبر فلما فتح الله عليه الحصن ذكر له جمال صفية بنت حيي بن أخطب وقد قتل زوجها وكانت عروسا فاصطفاه رسول الله لنفسه“^①

”پھر ہم خیبر میں آئے، جب اللہ کے فضل و کرم سے حضور ﷺ نے قلعہ خیبر فتح کر لیا، تو کسی نے کہا کہ صفیہ بنت حبی بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کا خاوند جنگ میں مر چکا ہے اور وہ ابھی دلہن ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے لئے پسند کر لیا۔“

یعنی رسول اللہ ﷺ نے کسی اور خیال سے نہیں۔ بلکہ صفیہ کی شہرت حسن سن کر اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ (دو اسلام: ۲۱۵)

جواب:

پہلے خود ایک معنی تجویز کرتے ہیں، پھر اس پر اعتراض کرتے ہیں اور اصل واقعہ جو پہلے ذکر کیا ہے، اس کو خوب اپنی خاص عبارت میں پیش کیا ہے۔ مثلاً یہ لفظ ”اسے لونڈی بنا کر خدمت لینا ظلم ہے“ پہلی روایت میں اضافہ کیا ہے۔ اصل روایت تو اتنی تھی کہ وہ رئیس کی بیٹی ہے، مگر کہنے والے کا اس سے غالباً مطلب یہی ہوا کہ اسے لونڈی بنا کر خدمت لینا ظلم ہے۔ اس لئے اس کا اضافہ مناسب سمجھا۔ اسی طرح اس حدیث کا ترجمہ اگر اس طرح کر لیتے:

”آنحضرت ﷺ کو لوگوں نے کہا: یہ عورت بہت خوبصورت ہے اور ایسی

① صحیح البخاری: کتاب الجہاد والسير، باب من غزا بصبي للخدمة، رقم الحديث (۲۷۳۶)

عورت سے لوٹدی بنا کر خدمت لینا ظلم ہے، تو آپ ﷺ اس بات کو سمجھ گئے، اس کو اپنے لئے چن لیا اور آزاد کر کے نکاح کر لیا، تو کتنا اچھا تھا! احادیث کے متعلق یہ قاعدہ ہے کہ ان کے ایک لفظ پر ہی عقیدے یا عمل کی بنیاد نہیں ہوتی، کیونکہ راوی بسا اوقات اختصار سے کام لیتے ہیں۔ محدث کو ان تمام الفاظ کو جمع کر کے مطلب نکالنا پڑتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں بھی ایک مسئلہ ایک جگہ مختصر ہوتا ہے اور دوسری جگہ مفصل، یہی حال احادیث کا ہے۔

اعتراض:

”سیرتِ رسول ﷺ کا ایک اور منظر“

”حضور کی کل گیارہ ازواج تھیں، جن میں سے دو حضرت خدیجہ الکبریٰؓ اور حضرت زینب بنت خزيمةؓ فوت ہو چکی تھیں اور نو باقی تھیں، جو علیحدہ علیحدہ مکانات میں رہتی تھیں، حضور ہر گھر باری باری جاتے تھے، ایک رات حضرت عائشہؓ کے ہاں گزارتے، دوسری حضرت صفیہؓ کے ہاں، تیسری حضرت میمونہؓ کے ہاں۔ وقس علیٰ هذا! اگر کسی وجہ سے حضور اپنے اس دستور العمل میں رد و بدل کرنے پر مجبور ہوتے، تو جس کی باری ہوتی، اس سے اجازت حاصل کر لیتے۔

اس تمہید کے بعد اب حدیث سنئے:

”عن قتادة عن أنس بن مالك قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يدور على نسائه في الساعة الواحدة من الليل والنهار وهن إحدى عشرة قال قلت لأنس أو كان يطيقه؟ قال كنا نتحدث أنه أعطي قوة ثلاثين رجلاً“^① (بخاری)

① صحیح البخاری: کتاب الغسل، باب إذا جامع ثم عاد و من دار علی نسائه فی غسل واحد، رقم الحدیث (۲۶۵)، صحیح بخاری میں ”ثلاثین“ کے بعد ”رجلاً“ کے الفاظ نہیں ہیں۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ دن ہو یا رات، ایک ہی وقت میں اپنی گیارہ بیویوں کے پاس مجامعت فرمایا کرتے تھے، میں نے پوچھا: رسول اللہ ﷺ میں اتنی طاقت تھی؟ کہا: آپ میں تیس مردوں کی طاقت موجود تھی۔“

ملاحظہ کی آپ نے حضور کی یہ دلچسپ تصویر! یہ حدیث صریحاً غلط ہے۔
اول: اس کا راوی انس رضی اللہ عنہ ہے اور یہ وہی بزرگ ہیں، جنہیں رسول اکرم ﷺ کی عمر بھی معلوم نہیں تھی!

دوم: ۷۷ میں حضور کے ہاں صرف سات ازواج زندہ تھیں، ۷۷ میں دو کا اور اضافہ ہوا۔ کل نو ہوئیں۔ زینب بنت خزیمہ نکاح کے بعد صرف تین ماہ زندہ رہی تھیں۔ پھر خدیجہ الکبریٰ کے بغیر کسی اور بیوی سے اولاد نہیں ہوئی۔
سوم: حضرت عائشہ کے سوا سب بیوائیں تھیں اور بعض کی پہلے شوہروں سے اولاد بھی تھی، قرآن کہتا ہے۔

﴿إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾^①

”رسول تم جیسے بشر ہیں۔“

لیکن حدیث کہتی ہے کہ ان میں تیس مردوں کی طاقت تھی لیکن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بغیر کسی بیوی سے اولاد کیوں نہیں ہوئی؟
میرا خیال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ میں آکر ازواج مطہرات کیلئے خود کو بطور شوہر استعمال نہیں فرمایا تھا۔ (دو اسلام)

جواب:

پہلا اعتراض کہ راوی انس رضی اللہ عنہ ہے اور اس کا جواب پہلے ہو چکا ہے کہ انس رضی اللہ عنہ

کی روایت عمر کے متعلق صحیح ہے۔^①

دوسرا اعتراض ”نویسیاں صرف ۷ھ میں تھیں، گیارہ کا قصہ غلط ہے“ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نو اور گیارہ میں یہ تطبیق دی ہے کہ جس نے گیارہ کہا ہے، اس نے ریحانۃ اور ماریۃ کو بھی شمار کیا ہے، حالانکہ دونوں لوٹیاں تھیں۔ ریحانۃ کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو آزاد ہونے اور ملک میں رہنے کا اختیار دیا تھا، اس نے ملک کو پسند کیا اور انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اختلاف ہے۔ سعید، قتادہ رضی اللہ عنہ سے نو کا ذکر کرتے ہیں اور ہشام گیارہ بتاتے ہیں۔ ان دونوں میں ترجیح دی جاسکتی ہے۔ مثلاً سعید کی روایت کو ترجیح دی جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پھر نو (۹) کا لفظ بھی تغلیبی ہے، کیونکہ مائی سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری بہہ کر دی تھی، باقی صرف آٹھ رہ جاتی ہیں۔^② انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے سیاق و سباق سے تو اس حدیث کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ عورتوں کے پاس اس لئے جاتے تھے، جس سے غسل لازم ہو۔ مگر اس حدیث میں جماع کی صراحت نہیں۔ آپ ﷺ کا یہ جانا صرف خبر گیری کیلئے بھی ہو سکتا ہے۔

باقی رہا راوی کا یہ استفسار ”أَوْ كَانَ يَطْبِقُهُ“ (کیا آپ ﷺ میں اتنی طاقت تھی؟) ہو سکتا کہ اس نے یہی سمجھا ہو کہ انس رضی اللہ عنہ کی مراد اس سے جماع ہے اور اپنی سمجھ کے مطابق اس نے سوال کر دیا اور انس رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کی بات کا جواب دے دیا کہ ہم باتیں کرتے تھے کہ آپ ﷺ کو تیس مردوں کی طاقت ہے۔ یہ باتیں صحابہ کی اپنی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ صرف تخمینی ہوں، اور حقیقت میں یہ کوئی قابل اعتراض بھی نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی قوت دوسرے آدمیوں سے زیادہ ہو۔ آج بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ قوت و ذہانت میں آدمیوں میں تفاوت ہوتا ہے۔ ایک

ایک آدمی سو سو پر بھاری ہوتا ہے۔ اس میں کیا تعجب ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راوی نے بھی حدیث کا مطلب یہی سمجھا ہو کہ آپ ﷺ بیویوں کے پاس خبر گیری کیلئے جاتے ہیں۔ مگر ایک اور بات جو الفاظ سے مترشح ہوتی تھی، اگرچہ مراد نہ تھی، اس کے متعلق استفسار کر دیا۔ اثناء گفتگو میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

اگر اس کا معنی جماع کا لیا جائے، تو اس پر یہ اعتراض کہ آپ ﷺ نے باری مقرر کر دی تھی، چنداں وزنی نہیں، کیونکہ آپ ﷺ کا باری مقرر کرنا، اس لئے نہ تھا کہ آپ ﷺ پر باری باری جانا فرض تھا۔ کیونکہ قرآن مجید نے اس فریضہ سے آپ ﷺ کو بری الذمہ قرار دیا ہے، فرمایا:

﴿ترجي من تشاء منهن وتؤوي إليك من تشاء﴾^①

کہ ”آپ ﷺ اپنی بیویوں میں سے جس کے پاس جانا چاہیں، جائیں اور جس کو چھوڑنا چاہیں، چھوڑ رکھیں۔“

بلکہ آپ ﷺ نے اپنی طرف سے باری بطیب خاطر مقرر کی تھی، اس واسطے اس کو ترک بھی کر سکتے تھے۔ اور محدثین نے ایک اور صورت بھی بیان کی ہے کہ جب آپ ﷺ سفر سے واپس آئیں، تو اس وقت قبل اس کے کہ آپ باری باری جانا چاہیں، پہلے کا یہ واقعہ ہو، نیز یہ بھی ہو سکتا کہ باری والی عورت سے اجازت لے لیں۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ ”آپ ﷺ میں اتنی قوت تھی، تو آپ کے ہاں اولاد کیوں نہ ہوئی؟ حالانکہ جو عورتیں آپ نے بیاہیں، ان کی پہلی اولاد تھی، اور آنحضرت ﷺ کی بھی پہلی اولاد تھی، لیکن اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ ﷺ اپنی بیویوں کو بطور شوہر استعمال نہیں کرتے تھے“ قرآن کے لحاظ سے بالکل لغو ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذَّكَورَ ۝ أَوْ

یزوجہم ذکرا واناثا ویجعل من یشاء عقیما ﴿۱﴾
 ”جس کو چاہے لڑکیاں دے، جس کو چاہے لڑکے اور جس کو چاہے لڑکے
 لڑکیاں دونوں عطا کرے اور جس کو چاہے بانجھ کر دے۔“
 نیز فرمایا:

﴿أفرأیتما تمنون ۝ أنتم تخلقونہ أم نحن الخالقون﴾ ﴿۲﴾
 ماریہ قبطیہ سے آپ ﷺ کا فرزند ابراہیم پیدا ہوا، مگر آپ تو اس کو بھی داستان
 ہی بتاتے ہیں اور محض اس وجہ سے کہ لونڈی رکھنا، آپ کے نزدیک اس حدیث کے
 خلاف ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ لونڈی کو آزاد کر کے نکاح کرنے میں دوہرا اجر
 ہے۔ اگر قرآن پڑھتے، تو آپ کو اس کی وجہ معلوم ہو جاتی!
 قرآن نے کہا ہے:

﴿لا یحل لک النساء من بعد ولا أن تبدل بہن من أزواج
 ولو أعجبک حسنہن إلا ما ملکک یمینک﴾ ﴿۳﴾
 ”اے پیغمبر! اس کے بعد تیرے لئے نہ کسی اور عورت سے نکاح جائز ہے
 اور نہ ہی اس میں رد و بدل کی اجازت ہے ہاں لونڈیاں رکھ سکتے ہو۔“

جب قرآن نے لونڈیاں رکھنے کی اجازت دے دی اور مزید نکاح کرنے سے
 منع کر دیا، تو آپ اس حدیث پر کیسے عمل کر سکتے تھے؟ اور اس آیت سے سابقہ مسئلہ
 پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ آنحضرت ﷺ میں اتنی قوت موجود تھی، جس کی بناء پر باوجود
 اتنی عورتوں کے لونڈیوں کی اجازت دی گئی۔

① الشوری: ۴۹-۵۰

② الواقعة: ۵۸-۵۹ ترجمہ: تو کیا تم نے دیکھا وہ نطفہ جو تم نکالتے ہو کیا تم اسے پیدا کرتے ہو یا ہم ہی
 پیدا کرنے والے ہیں؟

③ الأحزاب: ۵۲

پس انس رضی اللہ عنہ کی روایت کا ظاہری مفہوم بھی کوئی قابل اعتراض نہیں۔ مصروفیات کے بڑھنے سے اگرچہ قوت میں کمی پیدا ہو جاتی ہے، مگر اس میں طبائع کا اختلاف ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ جب دنیا سے تشریف لے گئے، تو آپ ﷺ کی داڑھی مبارک میں صرف بیس بال سفید تھے۔^① حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ سے دو سال چھوٹے تھے،^② دیکھنے میں بڑے معلوم ہوتے تھے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ ان مصروفیات میں شریک تھے۔ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے سفر میں آپ رضی اللہ عنہ کے ہاں محمد بن ابوبکر پیدا ہوا۔^③ پھر آنحضرت ﷺ کے بعد سارا بوجھ ان پر آن پڑا۔ مسیلہ کذاب سے مقابلہ، مرتدین سے لڑائی اور منکرین زکوٰۃ سے جنگ کی۔ مگر پھر بھی آپ رضی اللہ عنہ کے ہاں آپ کی وفات کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ (موطأ)^④

اعتراض:

اس کے بعد ایک اور حدیث لکھتے ہیں، کہتے ہیں:

”چلتے چلتے ذرا اس حدیث پہ بھی نظر ڈالتے جائیے:

”حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میرا نکاح رسول اللہ ﷺ سے چھ برس کی عمر میں ہوا تھا، اور آپ ﷺ نے مجھ سے نو برس کی عمر میں مجامعت کی۔“ (مسلم)^⑤

① سنن ابن ماجہ: کتاب اللباس، باب من ترك الخضاب، رقم الحدیث (۳۶۲۹)، مسند

أحمد: ۱۰۸/۳، صحیح ابن حبان: ۱۴/۲۰۴، مسند أبي يعلى: ۳۸۵/۶

② أسد الغابة- ۱۰۴/۱، الإصابة: ۱۶۹/۴

③ صحیح مسلم: کتاب الحج، باب حجة النبي ﷺ رقم الحدیث (۱۲۱۸)

④ المؤطا: ۷۵۲/۲ (۱۴۳۸)

⑤ صحیح البخاری: کتاب النکاح، باب تزویج الأب ابنته من الإمام، رقم الحدیث (۴۸۴۱)،

صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب تزویج الأب البکر الصغیرة، رقم الحدیث (۱۴۲۲) و

لفظه: و بنی بی و أنابت تسع سنین (نوسال کی عمر میں میری رخصتی ہوئی) برق صاحب کا لکھا ہوا

لفظ ”مجامعت“ حدیث میں نہیں ہے۔

یہ مت بھولے کہ اس وقت حضور کی عمر ۵۴ برس تھی اور یہ بھی مت بھولے کہ مسلم کی ایک حدیث کے مطابق حضور ﷺ کے ہاں آنے سے پہلے حضرت عائشہؓ تپ محرقہ میں مہینہ بھر بتلارہ چکی تھیں اور آپ کے تمام بال جھڑ چکے تھے۔^① اتنی نابالغ بچی ہو، مہینہ بھر تپ محرقہ میں بتلارہ کر کاٹا ہو چکی ہے، کیا ایسی بچی مجامعت کی تاب لا سکتی ہے؟ اور مجامعت بھی ایسے مرد کے ساتھ جس میں بقول بخاری تیس مردوں کی طاقت تھی!“ (دو اسلام: ۲۲۳)

جواب:

اس اعتراض کی نوعیت صرف یہ ہے کہ عمر کم ہے، نابالغ ہے اور یہی غلطی کی وجہ ہے۔ نو سال کی عمر میں بعض علاقوں اور خاندانوں میں لڑکیاں بالغ ہو جاتی ہیں۔ بلکہ بعض لڑکے بھی دس سال کے بالغ ہو جاتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرو اپنے باپ عمرو بن عاص سے صرف گیارہ سال چھوٹے تھے۔ (تذکرہ ذہبی)^②

ان کا نکاح کم از کم دس سال کی عمر میں ہوا ہوگا اور سال کے بعد وہ پیدا ہوئے ہونگے، لڑکیاں ہمیشہ لڑکوں سے پہلے بالغ ہوتی ہیں۔ آپ اپنے علاقہ اور اپنے خاندان کی لڑکیوں پر عربوں اور قریش خاندان کی لڑکیوں کو قیاس کرتے ہیں!!^③

① صحیح البخاری: کتاب فضائل الصحابة، باب تزویج النبی ﷺ عائشہ.....، رقم الحدیث (۳۶۸۱)، صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب تزویج الأب البکر الصغیرہ، رقم الحدیث (۱۴۲۲)

② تذکرہ الحفاظ: ۴۲/۱

③ مختلف مناطق کی آب و ہوا اور روزہ مرہ استعمال ہونے والی غذا انسانی طبائع پر متنوع اثر ڈالتی ہے، جن سے انسانی اجسام کی نشوونما میں مختلف اثرات ظاہر ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عرب جیسے گرم خشک علاقے میں رہنے والوں کے اندر کم سنی میں شادی کوئی اجنبی کی بات نہیں اور نہ یہ کوئی ایسا عجوبہ ہے، جس پر ناک بوں چڑھائی جائے، انہی وجوہ کی بناء پر حضرت عائشہؓ کی ہمر نو ←

پھر اگر پہلے بخار آیا، بال جھڑ گئے تھے، تو اس کے بعد اتنی مدت بھی گزر چکی تھی کہ بال دوبارہ اگ کر کان سے نیچے کندھے تک پہنچ چکے تھے۔ (بخاری) ^①

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخار کا اثر کافی حد تک دور ہو چکا تھا۔ اور مسلم کے الفاظ کا جو ترجمہ کیا ہے ”آپ نے مجھ سے نو برس کی عمر میں مجامعت کی“ نہایت بیہودہ ہے۔ پاس ادب تو بڑی دور کی بات ہے!

مسلم کے الفاظ ہیں:

”و بنی بی و أنا بنت تسع سنین“ (یہ الفاظ مصنف نے بھی نقل کئے ہیں)

”بناء“ کا لفظ اس امر سے کنایہ ہے کہ عورت کو خاوند کے ہاں بھیج دیا جائے۔ ^②

اعتراض:

آگے ایک اور حدیث لکھتے ہیں:

← سال شادی کوئی عجیب بات نہیں، کیونکہ یہ وہاں کے رواج کے متعلق ایک معمول کی بات تھی، جیسے حضرت ہشام بن عروہ نے فاطمہ بنت منذر سے شادی کی اور بوقت زواج فاطمہ کی عمر نو سال تھی۔ (الضعفاء للعقبی: ۴/۲۴، الکامل لابن عدي: ۶/۱۰۳، تاریخ بغداد: ۱/۲۲۲)

اسی طرح عبد اللہ بن صالح کہتے ہیں کہ ان کے پڑوس میں ایک عورت نو سال کی عمر میں حاملہ ہوئی اور مزید فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے ان کو بتایا کہ اس کی بیٹی دس سال کی عمر میں حاملہ ہوئی۔ (الکامل لابن عدي: ۴/۲۰۶) اسی طرح حضرت معاویہ نے اپنی بیٹی ہندہ کی شادی نو سال کی عمر میں عبد اللہ بن عامر بن کریر سے کرائی۔ (تاریخ دمشق: ۷۰/۱۸۸) مزید برآں أبو عاصم النبیل کہتے ہیں کہ میری والدہ ایک سو دس (۱۱۰) ہجری میں پیدا ہوئی اور میں ۱۲۲ھ میں پیدا ہوا۔ (سیر أعلام النبلا: ۹/۴۸۳) یعنی بارہ سال کی عمر میں ان کا بیٹا پیدا ہوا، تو ظاہر ہے کہ ان کی والدہ کی شادی دس گیارہ سال کی عمر میں وقوع پذیر ہوئی! لہذا عرب معاشرہ میں کم سنی کی شادی معمول کی بات ہے۔ ﴿فمال هؤلاء بقوم لا يكادون يفقهون حديثاً﴾!!

① صحيح البخاري (۳۶۸۱)

② مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: النہایۃ فی غریب الحدیث: ۱/۴۱۷

”ذرا یہ حدیث بھی دیکھئے:

سبرہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے متعہ (متعہ کی تفسیر وہ واقعہ ہے، جو اسی حدیث میں بیان ہو رہا ہے) کی اجازت طلب کی، آپ نے دے دی، چنانچہ میں اور میرا ایک ساتھی بنی عامر کی ایک عورت کے پاس گئے، جو ایک خوبصورت ناقدہ کی طرح حسین تھی۔ ہم نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس نے پوچھا: کیا دو گے؟ میں نے کہا یہ چادر، پھر میرے ساتھی سے بھی یہی سوال کیا، اس کے پاس بھی صرف چادر ہی تھی، اس کی چادر خوبصورت تھی اور میں خود خوبصورت! چنانچہ اس نے مجھے پسند کیا اور میں اس عورت کے پاس تین راتیں ٹھہرا۔“ (مسلم: ۴۴۳/۳) ^①

تو پھر کیا حکم ہے، ان خوانین کے متعلق جو پشاور سے چل کر ٹبی بازار میں کچھ ایسے ہی مقاصد کے لئے جاتے ہیں؟
”صحیح مسلم“ میں ہے:

”إن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى يوم الفتح عن متعة النساء“ ^②

کہ ”رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر کے دن متعہ سے روک دیا تھا۔“

① صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب نکاح المتعة و بیان أنه أبيع ثم نسخ ثم أبيع ثم نسخ و استقر تحریمه إلى يوم القيامة، رقم الحديث (۱۴۰۶)، حدیث کے آخر میں الفاظ ہیں: ”ثم إن رسول الله ﷺ قال من كان عنده شيء من هذه النساء التي يتمتع فليخل سبيلها“ جن سے ”متعہ“ کی صریح ممانعت معلوم ہوتی ہے، جنہیں برق صاحب دیدہ دانستہ حذف کر گئے ہیں، کیونکہ یہ الفاظ ان کے اعتراض کی قلعی کھول دیتے ہیں، اس لیے کہ اس حدیث سے بھی متعہ کی حرمت ہی معلوم ہوتی ہے!

② مصدر سابق

لیکن صفحہ (۴۴۱) میں یہ روایت موجود ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ اور حضرت صدیق کے زمانہ میں مٹھی بھر آٹا دیکر عورتوں کو استعمال کیا کرتے تھے اور اس حرکت سے ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روک دیا۔^①

اس تمام عبارت کا مطلب یہ ہے کہ متعہ بھی آج کل کی بازاری عورتوں کے کسب کی طرح ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ جائز نہیں اور اس میں احادیث بھی متعارض ہیں، کسی میں اجازت، کسی میں ممانعت؟ اور کسی میں آنحضرت کے زمانہ میں ممانعت اور کسی میں حضرت عمر کے زمانہ میں ممانعت؟ (دو اسلام: ۲۲۵)

جواب:

اصل بات یہ ہے کہ متعہ کا رواج جاہلیت کے زمانہ میں تھا۔ مگر قرآن نے مکہ ہی میں اس کو بند کر دیا تھا:

﴿فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ﴾^②
 ”یعنی جو بیوی اور لونڈی کے علاوہ کسی جگہ اپنی شہوت پوری کرے، وہ حد سے بڑھنے والا ہے۔“

مگر نکاح باقی رہا اور نکاح کی مختلف شکلیں تھیں۔ ایک شکل وہ ہے، جو آج کل جاری ہے، اس کے علاوہ اور شکلیں بھی تھیں۔^③ ان میں ایک نکاح مؤقت کی صورت تھی، یعنی ایک عرصہ معینہ کیلئے نکاح کرنا، اس میں نکاح بھی ہوتا تھا، مگر ایام معین ہوتے تھے، اسی کا ذکر ”سبرہ“ کی حدیث میں ہے، اس کو مجازاً ”متعہ“

① مصدر سابق، رقم الحدیث (۱۴۰۵)

② المومنون: ۷

③ صحیح البخاری: کتاب النکاح، باب من قال لا نکاح إلا بولي، رقم الحدیث: ۴۸۳۴، نیز

دیکھیں: فتح الباری: ۱۸۴/۹

کہا گیا ہے۔ حالانکہ ”متعہ“ حظ“ تو مکہ میں ہی حرام ہو گیا تھا۔ مگر لوگ نکاح مؤقت کرتے تھے اور اس پر بھی ”متعہ“ کا اطلاق کرتے تھے۔

اور یہ نکاح مؤقت جس پر متعہ کا اطلاق کیا گیا ہے، اس کی ممانعت بھی آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں کر دی گئی تھی۔ مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ یہ قیامت تک حرام کر دیا گیا ہے۔^① مگر بعض لوگ جن کو اس نہی کا علم نہ ہوگا، تو اپنی جگہ حلال سمجھ کر کرتے رہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا، تو آپ نے منع کر دیا، یہ مطلب نہیں کہ جائز تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع کر دیا۔^②

① صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب نکاح المتعة و بیان أنه أبیح ثم نسخ ثم أبیح ثم نسخ و

استقر تحریمہ إلى يوم القيامة، رقم الحديث (۱۴۰۶)

② اب بتائیے! احادیث میں کیا تعارض ہے؟ نیز یہ بھی کہ اس بات کو ٹہی بازار میں پشاور سے چل کر

آنے والے خوانین پر کیونکر قیاس کیا جاسکتا ہے، جب کہ اسلام نے اسے مطلقاً قیامت تک حرام کر دیا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اسے حلال سمجھ کر کرتے رہے، ظاہر ہے غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ اور غلط

فہمی کی وجہ سے کسی چیز کو حلال سمجھ کر اس کا ارتکاب کرنا اور بات ہے اور دیدہ دانستہ اس کا ارتکاب الگ بات! پھر ایک ایسی غلط بات سے جو لاعلمی میں سرزد ہوئی ہے۔ جواز کا پہلو کہاں سے نکل آیا؟

اور پھر طرفہ یہ کہ حدیث کے الفاظ موجود ہیں کہ ”جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا، تو آپ نے اس سے منع کر دیا“ اور اگر واقعی جواز کا پہلو نہیں نکلتا، بلکہ یہ مطلقاً حرام ہے، تو معاملہ صاف ہے،

پھر اسے آج کل کی بازاری عورتوں کے کسب پر قیاس کر کے حدیث پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے! نہ جانے معترض صاحب یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ اسلام نے بعض چیزوں کی اصلاح بتدریج کی

ہے۔ مثلاً شراب کو ایک دم حرام نہیں کیا گیا، مال غنیمت کی محبت کو رفتہ رفتہ مسلمانوں کے دلوں سے محو کیا گیا۔ یہی حال متعہ کا ہے کہ پہلے متعہ حظ حرام قرار دیا گیا، مگر نکاح مؤقت باقی رہا، پھر اسکو بھی

قیامت تک کے لئے حرام کر دیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں جو احادیث بیان کی گئی ہیں، ان کا مقصد ذہنی عیاشی نہیں ہے (جیسا کہ معترض کے الفاظ سے مترشح ہے) بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ دور جاہلیت کی اس لعنت کو بتدریج مسلم معاشرہ سے دور کیا گیا حتیٰ کہ یہ مطلقاً حرام قرار پایا۔ (ساجد)

اعتراض:

اس کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں:

”حضرت جابر کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حج کیلئے روانہ ہوئے۔ جن کے پاس قربانی کیلئے کچھ بھی نہیں تھا۔ انہیں ذی الحجہ کی پانچویں تاریخ کو احرام توڑنے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ ہم نے خوب جماع کیا اور پانچویں دن کے بعد جب ہم عرفہ کے لیے روانہ ہوئے، تو ”تقطر مذاکیرنا المنی“ ہمارے اعضاء تناسل سے نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا۔“ (صحیح مسلم)

جواب:

حدیث کا مطلب غلط بیان کیا، پھر اس پر اعتراض کیا۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو جن کے پاس قربانی نہ تھی، حلال ہونے کے لئے کہا اور ان پر ان کی عورتیں بھی حلال ٹھہرائیں، مگر جماع کو فرض نہیں کیا۔ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، ہم نے کہا: جب صرف عرفہ میں پانچ دن باقی رہ گئے ہیں، ہم کو عورتوں کے پاس جانے کے لئے کہا ہے، یعنی اجازت دی ہے۔ اگر ہم ایسا کریں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم جماع سے فارغ ہو کر فوراً عرفات پہنچیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ عرفہ میں اور جماع میں فاصلہ بہت سے دنوں کا ہونا چاہئے۔ چنانچہ لفظ یہ ہیں:

① ”فَنَاتِي عَرَفَةَ وَتَقَطَّرُ مَذَاكِيرُنَا الْمَنِي“

اس کے نیچے امام نووی لکھتے ہیں:

① صحیح البخاری: کتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب نهى النبي ﷺ على التحريم إلا

ما تعرف إباحته و كذلك أمره، رقم الحديث (٦٩٣٣)، صحیح مسلم: کتاب الحج، باب

بيان وجوه الإحرام..... رقم الحديث (١٢١٦)

② ”هو إشارة إلى قرب العهد بوطي النساء“

”یہ جماع کے زمانہ کے قرب کی طرف اشارہ ہے۔“

مقرض صاحب اس طرح احادیث کو مسخ کرتے ہیں اور اعتراض یہ ہے کہ ملا نے حدیث بنائی اور مسخ کی ہے۔ (فیاللعجب)



دسواں باب:

”حدیث میں نماز کی صورت“

اس باب میں حدیث میں نماز کی صورت بتلائی ہے، مطلب یہ ہے کہ حدیث کی نماز رواجی نماز کے خلاف ہے، لہذا حدیث کو معلم نماز کہنا درست نہیں۔ اس کا ذکر قدرے ہو چکا ہے کہ حدیث رواجی نماز کے خلاف نہیں۔ بعض کام اس قسم کے ہیں کہ ان کو دونوں طرح کرنا جائز ہے۔ مگر رواج میں صرف ایک چیز کو اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں سہولت ہے اور بعض جگہ حدیث میں ایک چیز مستحب ہے، مگر رواج میں وہ لازم قرار دی گئی اور بعض احادیث اس قسم کی ہیں، جو منسوخ ہیں۔ اس لئے رواج دوسری احادیث کے موافق ہے، جو ناسخ ہیں۔

پھر نماز کے فرض ہونے پر اعتراض کیا ہے۔

اعتراض:

اس جگہ معراج کی حدیث بیان کی ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ پہلے پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے، تو آپ ﷺ کے کہنے پر اللہ تعالیٰ سے تخفیف کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر بار بار ہوا۔ تھوڑی تھوڑی تخفیف ہوتی گئی، یہاں تک کہ پانچ رہ گئیں اور اللہ نے فرمایا: میری بات نہیں بدلتی، پانچ ہی پچاس ہیں۔^①

① صحیح البخاری: کتاب الصلاة، باب کیف فرضت الصلاة في الإسراء، رقم الحديث

(۲۴۲)، صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ، رقم الحديث (۱۶۳)

جواب:

یہ واقعہ ایک مثالی واقعہ ہے۔ اگرچہ معراج جسمانی ہے، مگر بعض واقعات اس کے مثالی ہیں۔ یعنی پانچ نمازیں مثالی شکل میں پچاس کی صورت میں نمودار ہوئیں۔ اس کی مثال خواب کی ہے۔ انسان چونکہ شہادی صورتوں کے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس واسطے اس کا دماغ اسی طرف جاتا ہے کہ اس کا وجود عالم شہادت میں اس طرح ہے۔ چنانچہ وہ جذباتی طور پر اس سے متاثر ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جو پہلے رسول تھے، یہ حقیقت منکشف ہوئی۔ یعنی یہ وجود مثالی ہے، ان کا ثواب پچاس کا ہے، دراصل یہ پانچ ہی ہیں۔

اعتراض:

اب ان کا اعتراض سنئے، لکھتے ہیں:

”اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ امت رسول کی استعداد کا علم نہ خدا کو تھا اور نہ حضور کو۔ اگر موسیٰ (علیہ السلام) پیچھے نہ پڑتے، تو امت پہ پچاس نمازیں فرض ہو جاتیں اور یہ امت صبح سے لیکر شام تک نمازیں ہی پڑھتی رہتی۔ نہ کما سکتی، نہ کھا سکتی۔ نہ ضروریات حیات کی طرف توجہ دے سکتی۔ مجبوراً ہر شخص اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرتا۔ یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عقل کی داد دیجئے کہ اسلام کو بچا لیا۔ ورنہ خدا اور رسول تو بقول انس ”یہ غلطی“ کر ہی بیٹھے تھے۔ ماشاء اللہ! کیا داستان تراشی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا اور رسول کا معلم دانش بنا ڈالا۔ اور یہ آخری فقرہ بھی خوب ہے کہ ”ہم اپنا قول نہیں بدلا کرتے“ اگر نہیں بدلا کرتے، تو پچاس

سے پچیس اور پچیس سے پانچ کیونکر ہوئیں۔ (دو اسلام: ۲۲۹)

جواب:

یہ ہے لب و لہجہ مصنف کا۔ نہ بات کو سمجھا، نہ حقیقت کو پایا، بس اعتراض جڑ دیا۔ یہ مسئلہ تو قرآن میں موجود ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ادعونی أستجب لکم﴾^①

”مجھے پکارو، میں تمہاری پکار قبول کروں گا۔“

اس پر آپ جیسے آزاد منش یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے اس کی دعا کا فیصلہ کر دیا ہے، تو ہم دعا کر کے اللہ تعالیٰ کو اپنی ضروریات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ اگر یہ جواب دیں کہ دعا سے آگاہ کرنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ ہم دعا کریں، تو وہ ہماری ضرورت پوری کرے، تو یہی حکمت وہاں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ ہماری مصالح سے واقف تھا، مگر اس کی حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ درخواست سے اس میں تخفیف کی جائے اور متنبہ کرنے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واسطہ قرار دیا۔

اعتراض:

اس کے بعد فقہ اور حدیث میں جو اختلاف ہے، اس کا ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

وضوء:

”فقہ کی بنیاد قرآن و حدیث پر رکھی گئی تھی، فقہ بتلاتی ہے:

① وضو میں اعضاء کو تین تین مرتبہ دھونا چاہئے۔

② مجامعت سے غسل فرض ہوتا ہے۔

① غافر: ۶۰

۴) خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

۵) نیند کے بعد وضو ضروری ہے۔

۶) جنابت کے پانی سے وضو درست نہیں۔

لیکن احادیث کچھ اور ہی کہتی ہیں:

ہر نماز کے لیے وضوء:

”كان النبي صلى الله عليه وسلم يتوضأ عند كل صلوة“

”آنحضرت ﷺ ہر نماز کیلئے نیا وضو کیا کرتے تھے۔“ (بخاری) ①

تردید بالا:

ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہ کے گھر میں تھا کہ

رسول اللہ ﷺ کچھ دیر سوچنے کے بعد جاگے، وضو کیا، نماز پڑھی:

”ثم اضطجع فنام حتى نفع ثم أتاها المنادي فأذنه بالصلوة“

فقام معه إلى الصلوة فصلّى ولم يتوضأ“

”پھر آپ لیٹ گئے، یہاں تک کہ خراثوں کی آواز آنے لگی۔ اس کے

بعد نماز کیلئے بلائے والا آیا، آپ اس کے ہمراہ مسجد میں چل دیئے اور

وہاں جا کر وضو کے بغیر نماز ادا کی۔“ (بخاری) ②

اس حدیث سے دو باتیں واضح ہو گئیں:

اول: حضور ہر نماز کیلئے نیا وضو نہیں کرتے تھے۔

① صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب الوضوء من غیر حدث، رقم الحدیث (۲۱۱)

② صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب التخفيف في الوضوء، رقم الحدیث (۱۳۸)

دوم: نیند کے بعد وضو ضروری نہیں۔

اگر آپ یہ کہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی صرف آنکھیں سوتی تھیں اور دل جاگتا تھا۔ اس لئے ان کے لئے وضو ضروری نہیں تھا اور یہ ہدایت صرف امت کے لیے تھی، تو ملاحظہ کیجئے صحیح مسلم کا یہ قول کہ:

”کان أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینامون ثم یصلون ولا یتوضاؤون“

”رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سو جاتے، پھر نماز پڑھتے اور وضو نہ کرتے۔“^①

کیا صحابہ کے دل بھی نبی ﷺ کی طرح جاگتے رہتے تھے؟ (دو اسلام: ۲۳۰)

جواب:

ہر نماز کے لیے نیا وضو مستحب ہے، اس لئے آپ ﷺ ایسا کرتے تھے اور نماز سے مراد یہاں پُنجوقتہ نماز ہے۔ یعنی ایک فرضی نماز کیلئے جو وضو کرتے، دوسری نماز کیلئے اس پر اکتفاء نہ فرماتے۔ اور حدیث مذکور میں ایسا نہیں، بلکہ آپ ﷺ نے پہلے تہجد کیلئے وضو کیا، پھر اسی پر اکتفاء کیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہر نماز کیلئے نیا وضو کرنا دائمی نہیں تھا، کبھی کبھی ایک ہی وضو سے متعدد نمازیں بھی پڑھ لیا کرتے تھے، جیسے ”سنن“ میں ہے۔^②

① صحیح مسلم: کتاب الحيض، باب الدلیل علی أن نوم الجالس لا ینقض الوضوء رقم الحدیث (۳۷۶)

② صحیح مسلم: کتاب الطہارۃ، باب جواز الصلوات کلھا بوضوء واحد، رقم الحدیث (۲۷۷)، سنن أبي داود: کتاب الطہارۃ، باب الرجل یصلی الصلوات بوضوء واحد، رقم الحدیث (۱۷۲)، سنن الترمذی: أبواب الطہارۃ، باب ما جاء أنه یصلی الصلوات بوضوء واحد، رقم الحدیث (۶۱)، سنن النسائی: کتاب الطہارۃ، باب الوضوء لكل صلاة، رقم

نیند کے بعد وضو کرنے کے متعلق پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نیند فی نفسہ ناقض نہیں، بلکہ نیند سے چونکہ مفاصل ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، اس لئے وضو کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ رکوع، قیام، اور بدوں ٹیک لگائے بیٹھنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ کیونکہ اس میں مفاصل ڈھیلے نہیں ہوتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالت بھی یہی تھی۔

لہو سے وضوء ٹوٹنے کا مسئلہ:

اس میں اختلاف ہے، اصل تحقیق یہ ہے کہ مستحب ہے، مگر فقہ نے اس مستحب کو رواج دے دیا ہے۔

مجامعت کے بعد غسل:

مجامعت کے بعد غسل کے ضروری ہونے پر پہلے بحث ہو چکی ہے کہ جس حدیث سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مجامعت سے غسل واجب نہیں ہوتا، اس میں مجامعت کا ذکر نہیں اور وہ حکم منسوخ ہے۔ آخری حکم وجوب غسل کا ہے۔

آگ کی پکی ہوئی چیز سے وضوء:

آگ کی پکی ہوئی چیز سے وضوء مستحب ہے، اس لئے آپ ﷺ نے کبھی کیا اور کبھی نہیں کیا، اس میں کوئی تعارض نہیں۔

وضوء میں اعضاء دھونے کی تعداد

وضوء ایک بار اعضاء دھونے سے بھی ہو جاتا ہے۔ دوبار بھی، تین بار بھی۔ یہ آخری درجہ ہے۔ ان مسائل میں فقہ اور حدیث کا کوئی اختلاف نہیں۔

← الحدیث (۱۳۳)، سنن ابن ماجہ: کتاب الطہارۃ باب الوضوء لكل صلاة و الصلوات

كلها بوضوء واحد، رقم الحدیث (۵۱۰)

غسل کے پانی سے وضوء:

کیا غسل سے بچے ہوئے پانی سے وضوء جائز ہے؟ ایک حدیث میں منع ہے اور ایک میں جواز، معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہیں تنزیہی ہے۔ یعنی بہتر ہے کہ وضوء نہ کرنے، ویسے جائز ہے۔

تعدادِ رکعات:

حضر میں ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعات ہیں اور سفر میں ان کی دو دو رکعات ہیں۔ باقی مغرب کی حضر و سفر میں تین اور فجر کی دو ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں موجود ہے کہ رات و دن کی نماز دو دو رکعت ہے۔^① اس سے مراد نوافل ہیں۔

اور ابو جیفہ کی روایت میں جو ظہر اور عصر کی دو دو رکعت پڑھنے کا ذکر ہے، وہ سفر کی روایت ہے۔ چنانچہ بخاری میں یہ لفظ ہیں:

”فصلی بالبطحاء الظهر والعصر رکعتین“^②
 ”م حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے بطحاء مقام پر دو دو رکعتیں ظہر و عصر کی پڑھیں۔“

اور بخاری نے یہاں باب باندھا ہے:

”باب السترة بمكة وغيرها“

① سنن أبي داود: كتاب الصلاة، باب في صلاة النهار، رقم الحديث (۱۲۹۵)، سنن الترمذي:

باب ما جاء أن صلاة الليل والنهار مثنى مثنى، رقم الحديث (۵۹۷)، سنن النسائي: كتاب قيام

الليل و تطوع النهار، باب كيف صلاة الليل، رقم الحديث (۱۶۶۶)، سنن ابن ماجه:

كتاب إقامة الصلاة، باب ما جاء في صلاة الليل والنهار مثنى مثنى، رقم الحديث (۱۳۲۲)،

مسند أحمد (۲/۲۶)، ابن خزيمة (۲/۲۱۴)، ابن حبان (۶/۲۳۱)

② صحيح البخاري: أبواب سترة المصلي، باب السترة بمكة وغيرها، رقم الحديث (۴۷۹)

”مکہ اور مدینہ ہر جگہ سترہ ہونا چاہئے“

اور یہ واقعہ ہجرت کے بعد کا ہے، جبکہ آپ ﷺ سفر پر تھے۔

اب مصنف کا یہ کہنا کہ

”اس حدیث میں قطعاً یہ مذکور نہیں آپ ﷺ سفر پر تھے اور اس لئے

نماز میں تخفیف کر لی تھی“ جہالت پر مبنی ہے۔

عصر کے بعد نماز

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عصر کے بعد نماز سے منع کرتے تھے ^① اور آنحضرت ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ ^② حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس لئے منع کرتے تھے کہ آہستہ آہستہ غروب کے وقت نہ نماز پڑھنے لگیں، ورنہ فی نفسہ منع نہیں سمجھتے تھے۔ (فتح الباری) ^③

تکبیر اقامت

حنفیہ میں اگرچہ تکبیر، اقامت میں دو دو مرتبہ رائج ہے، مگر ایک ایک مرتبہ بھی

① صحیح البخاری: أبواب السهو، باب إذا كلم و هو يصلي فأشار بيده واستمع، رقم الحديث (١١٧٦)

② صحیح البخاری: کتاب مواقیب الصلاة، باب ما یصلی بعد العصر من الفوائت ونحوها، الحديث (٥٦٧)

③ مصنف عبد الرزاق: ٤٣١/٢، مسند أحمد: ١١٥/٤، المعجم الكبير: ٢٢٨/٥، فتح الباری: اس کی سند میں ”أبو سعد الأعمی“ راوی مجہول ہے۔ (تقریب التہذیب: ٦٤٣، تعجیل المنفعة: ٤٨٨) لہذا یہ سند ”ضعیف“ ہے۔ اس کی ایک دوسری سند بھی ہے۔ (المعجم الكبير: ٥٨/٢، المعجم الأوسط: ٢٩٦/٨) اس کی سند میں ”عبد اللہ بن صالح کاتب اللیب“ ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”صدوق کثیر الغلط، ثبت فی کتابہ و کانت فیہ غفلة“ (تقریب التہذیب: ٣٠٨)

جائز سمجھتے ہیں، جیسے احکام القرآن جصاص میں ہے۔^①

نماز میں صرف فاتحہ کافی ہے

پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملانے پر عمل چلا آ رہا ہے، مگر فرض کسی کے نزدیک نہیں۔ حنفیہ واجب کہتے ہیں اور باقی سنت، یہ کوئی اختلاف نہیں! دعائے قنوت کا وقت

”ہم دعائے قنوت نماز عشاء میں پڑھتے ہیں، لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے

ہیں کہ دعائے قنوت ہم نے نماز فجر میں پڑھی۔“^② (دواسلام)

دعائے قنوت دو قسم کی ہے، ایک وہ جو کسی مصیبت کے وقت پڑھی جاتی ہے، انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اسی کا ذکر ہے۔ اور دوسری جو پڑھی جاتی ہے، وہ اس کے علاوہ ہے۔

دعاءِ استفتاح

دعائے استفتاح کے متعلق یہی دستور ہے کہ آہستہ پڑھی جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جہر اس لئے کیا تھا^③ کہ لوگوں کو علم ہو جائے کہ تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھی جائے۔^④ جس روایت میں یہ ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز ”الحمد“ سے

① احکام القرآن للجصاص الرازی (۲۴۲/۳)

② صحیح البخاری: کتاب الوتر، باب القنوت قبل الركوع و بعده، رقم الحدیث (۹۵۶)،

صحیح مسلم: کتاب المساجد، باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوة، رقم الحدیث (۶۷۷)

③ صحیح مسلم: کتاب الصلوة، باب حجة من قال لا یجهر بالبسملة، رقم الحدیث (۳۹۹)

④ سنن دارقطنی کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تعلیم کی غرض سے ایسا کرتے تھے،

حضرت اسود کہتے ہیں ”بسمعنا ذلك و یعلمنا“ (سنن الدارقطنی: ۳۰۱/۱) اس کے بعد امام دارقطنی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی یہ عمل نقل کیا ہے۔

شروع کرتے تھے،^① اس کا یہ مطلب ہے کہ قرأت یہاں سے شروع کرتے تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ دعائے افتتاح بالکل نہیں پڑھتے تھے، مگر سمجھنے کیلئے غور و فکر کی ضرورت ہے!

نماز میں مختلف اعمال کی اجازت

اس میں منبر پر نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔^② اور یہ مسئلہ پہلے بھی ذکر ہوا کہ یہ واقعہ تعلیم کیلئے ہے^③ ورنہ امام کو اونچا کھڑا ہونا منع ہے۔^④ دوسرا واقعہ اپنی نواسی ”أمامة“ کو اٹھا کر آپ ﷺ کے نماز پڑھانے کا ہے۔^⑤ اور جو اس طرح کی حرکات نماز میں جائز نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ بچے خود بخود اتر جاتے اور کندھے پر چڑھ جاتے ہیں، اس طرح فقہ کی رو سے بھی نماز میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اقتداء کا واقعہ ہے، جس میں وہ بائیں طرف

① صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب حجة من قال لا یجهر بالبسملة، رقم الحدیث (۳۹۹)

② صحیح البخاری: کتاب الصلاة، باب الصلاة فی السطوح والمنبر والخشب، رقم

الحدیث (۳۷۰)، صحیح مسلم: کتاب المساجد، باب جواز الخطوة والخطوتين فی

الصلاة، رقم الحدیث (۵۴۴)

③ دیکھیں: ابن حبان: ۵/۵۱۴، فتح الباری: ۱/۸۷

④ سنن أبي داود: کتاب الصلاة، باب الإمام یقوم مکاناً أرفع من القوم، رقم الحدیث

(۵۹۸، ۵۹۷)، مصنف عبد الرزاق: ۲/۴۱۳، مصنف ابن أبي شیبہ: ۲/۶۶، ابن

خزيمة: ۳/۱۳، ابن حبان: ۵/۵۱۴، المستدرک: ۱/۳۲۹، سنن البيهقي: ۳/۱۰۸، المتقی

لابن الجارود: ۱/۸۷

⑤ صحیح البخاری: أبواب سترة المصلي، باب إذا حمل جارية صغيرة على عنقه فی

الصلاة، رقم الحدیث (۴۹۴)، صحیح مسلم: کتاب المساجد، باب جواز حمل الصبيان

فی الصلاة، رقم الحدیث (۵۴۳)

کھڑے ہوئے، تو آپ ﷺ نے انہیں پیچھے سے دائیں جانب کر دیا۔^① اس طرح کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

نمازی کے آگے سے گزرنا

نمازی کے آگے سے گزرنا فقہ اور حدیث کی رو سے منع ہے۔ مگر جماعت اور انفرادی حالت کا فرق ہے، جماعت میں امام کے آگے سے گزرنا منع ہے، اور صف کے آگے سے گزرنا جائز ہے اور انفرادی حالت میں نمازی کے آگے سے گزرنا منع ہے۔ باقی رہا یہ کہ نمازی کے آگے سے گزرنا نماز کو باطل کرتا ہے یا نہیں، اس میں اصل بات یہ ہے کہ عورت، کتا اور گدھا نمازی کے اس تعلق کو توڑتے ہیں، جو نمازی کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے، مگر نماز باطل نہیں ہوتی۔ جن روایات میں یہ آیا ہے کہ یہ چیزیں نماز کو کاٹ دیتی ہیں،^② اس جگہ کاٹنے سے مراد تعلق کا کاٹنا ہے، جس کا ذکر ہوا ہے۔ اور جن احادیث میں یہ وارد ہے کہ نماز کو کوئی شے قطع نہیں کرتی۔^③ اسکا

① صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب قراءة القرآن بعد الحدث وغیره، رقم الحدیث (۱۸۱۰)، صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرين، باب الدعاء فی صلاة اللیل و قیامہ، رقم الحدیث (۶۷۳)

② صحیح البخاری: أبواب ستره المصلي: باب الصلاة إلى التيميم، رقم الحدیث (۴۸۶)، صحیح مسلم: کتاب الصلاة باب الاعتراض بین یدیه المصلي، رقم الحدیث (۵۱۲) بعض روایات میں نماز لوٹانے کا حکم ہے، ابن خزيمة: (۸۳۱)

③ یہ حدیث مختلف طرق سے مروی ہے، لیکن اس کی کوئی بھی سند ضعف سے خالی نہیں اور ضعف بھی اس درجہ کا ہے کہ تمام اسانید کو ملا کر بھی مرثیہ احتجاج کو نہیں پہنچتی۔ دیکھیں: فتح الباری لابن رجب ۲/۶۹۶، فتح الباری لابن حجر ۱/۵۸۸، السلسلة الضعیفة (۵۶۶۰، ۵۶۶۱)، تمام المنة (۳۰۶)

مطلب یہ ہے کہ باطل نہیں ہوتی کہ اس کو دوبارہ ادا کرنے کا حکم ہو۔ آگے سے گزرنے سے نماز میں خلل پیدا ہوتا ہے، مگر آگے لیٹنے اور بیٹھنے سے یہ خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے لیٹنے اور گزرنے کی احادیث میں کوئی تعارض نہیں۔ مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جس روایت میں یہ فرمایا ہے کہ تم لوگوں نے ہم عورتوں کو گدھوں اور کتوں جیسا سمجھ لیا ہے، اس سے ان کی غرض حدیث سے انکار نہیں، کیونکہ قطع والی حدیث تو مائی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے ^① بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ عورت میں قطع صلوٰۃ کی اور وجہ ہے اور گدھے اور کتے میں اور وجہ ہے۔ گدھے اور کتے میں ان کا نجس اور شریر ہوتا ہے، جبکہ عورت برے خیال کا باعث بنتی ہے۔ آپ ﷺ فرماتی ہیں کہ میں حضور ﷺ کے آگے لیٹی رہتی اور آپ ﷺ نماز پڑھتے رہتے۔ ^② اگر ہم عورتیں بھی کتوں کی طرح ہوتیں، تو آپ ﷺ مجھے آگے نہ لیٹنے دیتے۔

رفع الیدین

رفع الیدین بعض آئمہ کے نزدیک سنت ہے اور بعض نے ترک کو ترجیح دی ہے، مگر جو لوگ ترک کو ترجیح دیتے ہیں، ان کے ہاں بھی جائز ہے، جیسے امام جصاص حنفی نے ”أحكام القرآن“ میں لکھا ہے۔ ^③

① مسند أحمد ۸۴/۶ اس کی سند ضعیف ہے۔ اور متن بھی ”مکر“ ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح

الباری لابن رجب: ۷۰۵/۲، السلسلة الضعيفة (۵۵۴۲)

② صحيح البخاري: أبواب سترة المصلي، باب الصلاة إلى اليسير، رقم الحديث (۴۸۶)،

صحيح مسلم: كتاب الصلاة، باب الاعتراض بين يدي المصلي، رقم الحديث (۵۱۲)

③ أحكام القرآن للجصاص الحنفی: ۲۵۳/۱

اجتماعِ صلوٰتین

”جمع بین الصلوٰتین“ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ ظہر آخری وقت، عصر اول وقت۔ یہ حنفیہ کے نزدیک بھی ضرورت کے وقت جائز ہے اور ”موطا“ وغیرہ کی روایت میں جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ^① وہ اسی پر محمول ہے۔
کیا حائضہ نماز ادا کرے؟

کہتے ہیں ”فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے کہ حائضہ روزے رکھے اور نماز نہ پڑھے۔“
 معلوم نہیں فقہ کی کوئی کتاب میں یہ لکھا ہے، پھر آگے بخاری سے بھی نقل کیا ہے:
 ”إن الحائض تقضي الصيام ولا تقضي الصلوة“ ^②
 ”حائضہ روزے رکھے اور نماز ادا نہ کرے۔“

اس جگہ جہاں فقہ کی طرف غلط نسبت کی ہے، وہاں بخاری کی عبارت کا بھی غلط مطلب لیا ہے۔ بخاری کا مطلب قضاء کی ادائیگی سے ہے کہ روزوں کی قضاء دینا ضروری ہے، جبکہ نماز معاف ہے۔ ورنہ یہ مسئلہ تو اتفاق ہے کہ حائضہ (ان ایام میں) نہ روزے رکھے اور نہ نماز پڑھے۔ اس کے بعد یہ بھی اتفاق ہے کہ روزے کی قضاء دے اور نماز کی قضاء نہ دے۔

آگے ایک عجیب غلطی کی ہے۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ اُمہات المؤمنین میں سے ایک بیمار تھیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اعتکاف بیٹھیں۔ بیماری کی وجہ سے ان کو خون آتا تھا۔ ^③ مصنف نے یہ سمجھ لیا ہے کہ شاید حائضہ تھیں! یہ مسئلہ پہلے بھی

① صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرين و قصرها، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر، رقم الحدیث (۷۰۵)، الموطا: ۱/۱۴۴،

② صحیح البخاری: کتاب الصوم، باب الحائض، ترک الصوم والصلاة، یہ ابو الزناد کا قول ہے، جسے امام بخاری نے ترجمۃ الباب کے بعد مطلق ذکر کیا ہے۔

③ صحیح البخاری: کتاب الحيض، باب اعتكاف المستحاضة، رقم الحدیث (۳۰۳)

ذکر ہو چکا ہے۔

رکوع و سجود میں قرآن

ایک حدیث میں منع آیا ہے،^① جبکہ دوسری حدیث مصنف کے خیال میں اس کے معارض ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ ”سبوح قدوس رب الملكة والروح“ رکوع و سجود میں پڑھا کرتے تھے۔^② مصنف اس ورد کو قرآن کی آیت سمجھ رہے ہیں!!

نماز میں انسانی کلام

ایک حدیث میں تو منع آیا ہے کہ نماز میں کلام نہیں کرنا چاہئے۔^① مگر مصنف کہتا ہے کہ آپ نے خود کلام کی، کیونکہ حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے کہا تھا: ”ألعنك بلعنة الله“^② مصنف نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ بددعا بھی اس کلام میں داخل ہے، جو منع ہے، مگر دونوں حدیثوں کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دعا کلام ممنوع میں داخل نہیں اور ایک جواب یہ بھی ہے کہ حدیث میں یہ کہیں ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے نماز کو اس وقت چھوڑ نہیں دیا۔ اور عارضہ کیلئے نماز کو چھوڑنا جائز ہے۔

① صحیح مسلم: کتاب اللباس والزینة، باب النہی عن لبس الرجل الثوب المعصر، رقم

الحديث (۲۰۷۸)

② صحیح مسلم: کتاب الصلاة باب ما یقال فی الركوع والسجود، رقم الحديث: ۴۸۷، یہ دعائے کلمات ہیں، جن کو رسول اکرم ﷺ رکوع و سجود میں پڑھا کرتے تھے، برق صاحب النکاح قرآنی الفاظ سمجھ بیٹھے ہیں، بنا بریں احادیث میں تعارض ثابت کر رہے ہیں!!

③ صحیح مسلم: کتاب المساجد، باب تحریم الکلام فی الصلاة و نسخ ما کان من اہل الجاہلۃ

رقم الحديث (۵۳۷)

④ صحیح مسلم: کتاب المساجد، باب جواز لعن الشیطان فی أثناء الصلاة والتغویذ منہ وجواز

العمل القلیل فی الصلاة، رقم الحديث (۵۴۲)

اس کے بعد دعاءِ قنوت میں بعض آدمیوں کا نام لے کر جو ان کیلئے استخلاص کی دعا کی،^① اس کو بھی کلام میں داخل کر رہے ہیں۔ ”إنا لله وإنا إليه راجعون“! دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا

”ہم دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ بارش کی دعا کے بغیر کسی اور دعا میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔“^②

جواب

مگر اس جگہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ بلند صرف استسقاء میں ہی کرتے تھے۔ بعض روایات میں اس کی تصریح موجود ہے۔ بلکہ بخاری میں یہ لفظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ ہاتھ اس قدر اٹھاتے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو جاتی۔^③ جو توں میں نماز

اس میں کوئی قباحت نہیں، سب جائز سمجھتے ہیں، بشرطیکہ جوتے پاک ہو۔ لیکن عرب میں جو ”نعلین“ کا لفظ وارد ہے، اس کا معنی ”جوتا“ کرنا ٹھیک نہیں، بلکہ اس کا معنی چپل ہے۔ چپل اور جوتے میں فرق ہے۔ چپل میں انگلیاں بغض وقت زمین پر لگ جاتی

① صحیح مسلم: کتاب المساجد، باب استحباب القنوت فی جمیع الصلاة إذا نزلت بالمسلمین نازلة، رقم الحدیث (۶۷۵) رسول اکرم ﷺ نے اسیر مسلمانوں کے لیے نماز میں رکوع کے بعد قنوت نازلہ کی تھی، جس کو برق صاحب ممنوع انسانی کلام میں داخل کر رہے ہیں!

② صحیح البخاری: کتاب الاستسقاء، باب رفع الإمام یدہ فی الاستسقاء، رقم الحدیث (۹۸۴)، صحیح مسلم: کتاب صلاة الاستسقاء، باب رفع الیدین بالدعاء فی الاستسقاء، رقم الحدیث (۸۹۵)

③ صحیح البخاری (۹۸۴) کے الفاظ ہیں: ”وإنه یرفع حتی یری بیاض إبطیه“ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ”فتح الباری: ۵۱۷/۲“

ہیں، لیکن جوتے میں سجدے کی حالت میں پاؤں معلق رہتا ہے۔

سجدے میں بازو کھولنا

کہتے ہیں ”انس سے روایت ہے: ”لَا يَسْطُ ذِرَاعِيَهُ كَالْكَلْبِ“^① ”کتے کی طرح بازو نہ کھولے“

اس جگہ مصنف نے ترجمہ غلط کیا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”کتے کی طرح زمین پر بازو نہ پھیلائے“ اب دوسری حدیث^② کے ساتھ معارض نہ ہوگا، کیونکہ ہاتھ کھولنے اور کروٹوں سے ہٹا رکھنے کا اس میں ذکر ہے۔ اور انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں زمین پر پھیلانے کی ممانعت ہے۔

پہلی رکعت کے بعد بیٹھنا

یہ ثابت ہے،^③ مگر حنفیہ کا خیال کسی عذر کی بناء پر تھا۔

نماز چھوٹی ہو یا لمبی

دونوں طرح جائز ہے، امام کیلئے بہتر یہ ہے کہ قیام اور تشہد ذرا لمبا کرے اور

- ① صحیح البخاری: کتاب مواقیب الصلاة، باب المصلي يناجي ربه، رقم الحديث (۵۰۹)
- ② یعنی جس حدیث میں یہ ذکر ہے کہ رسول اکرم ﷺ سجدہ میں بظوں کو اتنا کھول دیتے تھے کہ آپ ﷺ کی بظوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی، (صحیح البخاری: کتاب الصلاة، باب یدی ضعیفہ و یجافی فی السجود، رقم الحديث (۲۸۲)، صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب ما یجمع صفة الصلاة، رقم الحديث (۴۹۵)
- ③ صحیح البخاری: کتاب صفة الصلاة، باب من استوی قاعدًا فی الأرض إذا قام من الركعة، رقم الحديث (۷۹۰) چونکہ احتناف کے پاس اپنے موقف (ترک جملہ استراحت) کی کوئی صریح و صحیح دلیل نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے بذریعہ تراش کر اس حدیث کو ناقابلِ عمل بنانے کی سعی مذموم کی ہے، جو کہ اہل تقلید کی قدیم روش ہے۔ أعاذنا الله منه!

باقی ارکان میں اختصار سے کام لے۔

قومہ میں اختصار اور طول دونوں طرح وارد ہے۔^① مگر طول عارضی ہوتا ہے۔ ظہر کی نماز کے قیام میں اگر طوالت اختیار کی جائے، تو کچھ حرج نہیں۔ ہاں عشاء کی نماز میں بہت زیادہ لمبی قرأت نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ وہ نیند کا وقت ہوتا ہے۔

وقتِ عصر

”عصر کی نماز کے متعلق بخاری میں ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

”کنا نصلی العصر ویذهب الذاہب منا إلی قباء فیأتیہم والشمس مرتفعة“^②

”ہم عصر کی نماز پڑھ لیتے، تو اگر کوئی جانے والا قباء جاتا، تو اس کے قبا پہنچنے تک سورج بلند ہوتا۔“

ایک روایت میں ہے کہ عوالی کی طرف جاتا، جب وہاں پہنچتا، تو سورج ابھی بلند ہوتا۔ اور بعض عوالی چار میل کے قریب ہیں۔^③ اس جگہ عوالی سے مراد قباء ہے، جیسا کہ پہلی روایت میں تصریح ہے۔

حدیث میں صرف ایک طرفہ مسافت طے کرنے کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے غلطی سے دو طرفہ مسافت طے کرنا سمجھنا ہے۔ اور لفظ ”یرجع“ سے غلط فہمی ہوتی ہے۔ حالانکہ ”یرجع“ کا معنی ہے: مدینہ سے عوالی کی طرف رجوع کرنا، نہ یہ کہ جا کر واپس آنا۔

اور عصر کا وقت گرمیوں میں سورج کے غروب ہونے سے تین گھنٹے قبل شروع ہو

① صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب اعتدال، ارکان الصلاة و تخفیفها فی تمام۔

② صحیح البخاری، کتاب مواقیب الصلاة، باب وقت العصر، رقم الحدیث (۵۲۶)

③ مصدر سابق، رقم الحدیث (۵۲۵)

جاتا ہے۔ گھنٹہ ڈیڑھ میں تین چار میل مسافت کا طے کرنا مشکل نہیں۔ اور سورج کے غروب ہونے میں آدھ گھنٹہ باقی بھی ہو، تو سورج بلند ہی ہوتا ہے۔ پس سورج کے غروب ہونے سے اگر دو گھنٹہ پہلے بھی نماز پڑھی جائے، تو اتنی مسافت سورج غروب ہونے سے آدھ گھنٹے پہلے طے کی جاسکتی ہے۔ مصنف نے یہ سمجھا ہے کہ اتنی مسافت طے کرنے کیلئے آدھا دن چاہئے، لہذا عصر ۲ بجے یا بارہ پونے بارہ بجے پڑھی جاتی ہو گی..... یہ اعتراض معتمد خیز ہی تو ہے!!

اعتراض:

”ابو امامہ کہتے ہیں کہ میں اور عمر بن عبدالعزیز نماز ظہر پڑھ کر معا حضرت مالک بن انس کے ہاں چلے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ نماز عصر پڑھ رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیا؟ کہنے لگے کہ حضور کا وقت یہی تھا۔“ (دو

اسلام: ۲۴۸)

جواب:

اس حدیث کا ترجمہ بھی غلط کیا اور مطلب بھی غلط سمجھا۔ ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھی (یعنی ان کی اقتداء میں) پھر انس بن مالک کے ہاں گئے، تو وہ عصر پڑھ رہے تھے۔^① یہاں لفظ ”ثم“ ہے، جو تراخی کیلئے ہوتا ہے۔ یعنی ذرا ٹھہر کر گئے، یہ مطلب نہیں کہ معا چلے گئے۔

جب ظہر کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اس وقت عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اس دن ظہر کی نماز تاخیر کر کے پڑھی ہوگی۔ جیسے ان کے

① صحیح البخاری: کتاب مواقیت الصلاة، باب وقت العصر، رقم الحدیث (۵۲۴)، صحیح

مسلم: کتاب المساجد: باب استحباب التکیف بالعصر، رقم الحدیث (۶۲۳)

خاندان کی عادت تھی، کیونکہ بنو امیہ نماز میں تاخیر کیا کرتے تھے۔ (فتح الباری)^①
اس کے بعد لکھتے ہیں:

”چند اور اختلاف:

① سجدہ میں آنحضرت ﷺ ”سبحانک اللہم ربنا وبحمدک اللہم اغفر لی“ پڑھا کرتے تھے۔^②

② آپ نماز میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

”اللہم انی أعوذ بک من عذاب القبر“^③

③ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے یہ دعا پڑھنے کی ہدایت فرمائی:

”اللہم انی ظلمت نفسی..... إنک أنت الغفور الرحیم“^④

④ عبد اللہ بن ابی اوفی کہتے ہیں کہ حضور رکوع کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

”ربنا لك الحمد ملء السموات وملء الارض“^⑤..... ”لمبی دعا ہے۔

⑤ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: حضور ﷺ نے ہم کو ”التحیات“ یوں پڑھایا تھا:

① فتح الباری: ۲۸/۲

② صحیح البخاری: کتاب صفة الصلاة، باب الدعاء في الركوع، رقم الحديث (۷۶۱)

③ صحیح البخاری: کتاب صفة الصلاة، باب الدعاء قبل السلام، رقم الحديث (۷۹۸)،

صحیح مسلم: کتاب المساجد، باب ما يستعاذ منه في الصلاة، رقم الحديث (۵۸۷)

④ صحیح البخاری: کتاب صفة الصلاة، باب الدعاء قبل السلام، رقم الحديث (۷۹۹)

⑤ صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب ما يقول إذا رفع رأسه من الركوع، رقم

الحديث (۴۷۶) دعا کے الفاظ ہیں: ”اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءُ السَّمَاوَاتِ وَمِلْءُ الْأَرْضِ وَمِلْءُ

مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدَ“

”التحيات المباركات الصلوات الطيبات“^①

② أبو حميد الساعدي نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ نماز میں ہم آپ پر کس طرح ”صلوة“ بھیجا کریں؟ کہا اس طرح:

”اللهم صل على محمد وعلى أزواجه وذريته كما صليت على إبراهيم وبارك على محمد وأزواجه وذريته كما باركت على إبراهيم!“^③

④ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تم ”التحيات“ ”عبدة ورسولة“ تک پڑھ چکو، تو پھر جو جی میں آئے، دعا مانگو۔“^⑤ (دوا اسلام: ۲۴۹)

جو کچھ ان احادیث میں مذکور ہے وہ متبادل دعائیں ہیں یا زائد ہیں، جو مستحب ہیں۔ اس واسطے مروجہ نماز اور ان احادیث میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ ان احادیث میں یہ نہیں کہ یہی پڑھو۔ جو دعائیں اور درود مروجہ ہیں، ان کا ثبوت بھی احادیث سے ملتا ہے۔ کوئی عالم یہ نہیں کہتا کہ احادیث والی دعائیں منع ہیں۔



① صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب التشهد في الصلاة، رقم الحديث (۴۰۳)

② صحیح البخاری: کتاب الأنبياء، باب ﴿يَرْفَعُونَ﴾ رقم الحديث (۳۱۸۹)، صحیح مسلم:

کتاب الصلاة، باب الصلاة على النبي ﷺ في التشهد، رقم الحديث (۴۰۷)

③ صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب التشهد في الصلاة، رقم الحديث (۴۰۲)

گیارہواں باب

بہترین عمل

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں چونکہ جہاد کی بہت فضیلت اور تاکید آئی ہے، اس لئے وہ بہترین عمل ہے، مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانا کھلانا اور آشنا اور نا آشنا سب کو سلام کہنا، اچھا اسلام ہے۔ نیز مسلمان کو زبان اور ہاتھ سے دکھ نہ پہنچانا، اچھا اسلام ہے۔ ان دو احادیث میں جہاد کا ذکر ہی نہیں۔

اعتراض:

اب ایسی احادیث سنئے، جن میں جہاد کو تیسرے یا چوتھے درجہ کی نیکی بتایا گیا ہے:

① عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت سے پوچھا کہ سب سے بہتر عمل کونسا ہے؟ فرمایا: نماز بہ پابندی وقت۔ اس کے بعد والدین کی خدمت اور اس کے بعد جہاد۔ (بخاری) ①

دیکھا آپ نے نماز کو کہاں رکھ دیا اور جہاد کو کہاں پھینک دیا!

② ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے کہا:

”نزی الجہاد أفضل العمل، أفلا نجاهد؟ قال لا ولكن أفضل

① صحیح البخاری: کتاب مراقبت الصلاة، باب فضل الصلاة، لوقتها، رقم الحدیث

(۵۰۴)، صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب کون الإیمان بالله تعالیٰ أفضل

الأعمال، رقم الحدیث (۸۵)

① الجہاد حج مبرور

”ہماری رائے میں جہاد بہترین عمل ہے، کیا ہم جہاد نہ کریں؟ فرمایا نہیں،

بلکہ حج بہترین جہاد ہے۔“ ②

③ کسی شخص نے حضور سے پوچھا کہ بہترین عمل کونسا ہے؟ فرمایا: خدا اور رسول

پر ایمان، اس کے بعد جہاد اور اس کے بعد حج۔ ④

اوپر والی حدیث میں بہترین عمل حج تھا اور اس کے بعد جہاد، اس حدیث

کے مطابق حج سے جہاد بہتر ہے۔ قرآن کہتا ہے: جان و مال کی قربانی

کے بغیر جنت نہیں ملے گی۔ لیکن حدیث کا فیصلہ یہ ہے کہ جہاد کرو، نہ کرو،

جنت تمہاری ہے!

قرآن لاکھ چلائے کہ ہم جہاد کے بغیر جنت نہیں دیں گے، لیکن حدیث کہتی

ہے کہ اللہ نمازی اور روزہ دار کو جنت میں بھیجنے پر مجبور ہے۔

ابن ماجہ اور ترمذی کی ایک حدیث ملاحظہ ہو:

① صحیح البخاری: کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور، رقم الحدیث (۲۴۴۸)

② اس حدیث سے جہاد کی افضلیت ثابت ہو رہی ہے نہ کہ حج افضل ثابت ہوتا ہے، اس غلط فہمی کی

اصل وجہ یہ ہے کہ برق صاحب نے حدیث میں وارد لفظ ”لَکُنَّ“ کو ”لَکِنَّ“ (حرف استدراک)

کچھ کر ترجمہ غلط کیا ہے۔ جس کی وجہ سے حدیث پر اعتراض کر رہے ہیں، حدیث کا صحیح ترجمہ یہ

ہے:

”ہم جہاد کو سب سے افضل عمل سمجھتے ہیں، تو کیا ہم بھی جہاد نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم

عورتوں کے لیے بہترین جہاد حج مبرور ہے۔“ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کے حق میں حج

افضل عمل ہے۔ دیکھیں: فتح الباری: ۳/۳۸۲

③ صحیح البخاری: کتاب الایمان، باب من قال إن الایمان هو العمل، رقم الحدیث (۲۶)،

صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب کون الایمان بالله تعالیٰ افضل الأعمال، رقم

الحدیث (۸۳)

”کیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بہتر عمل کونسا ہے؟ ایسا عمل جو تمہارے درجوں کو بلند کر دے، جو سونے اور چاندی کی قربانی سے بہتر ہو اور اس جہاد سے بھی اچھا ہو، جس میں تم دوسروں کی گردنیں کاٹتے اور اپنی کٹاتے ہو؟“ لوگوں نے کہا: بتائیے!، کہا: اللہ کا ذکر! ①

جواب:

حدیثوں میں جہاد پر آنحضرت ﷺ کے بہت زیادہ اقوال موجود ہیں:

① ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کسی نے کہا: یا رسول اللہ! بہترین آدمی کون ہے؟ فرمایا: وہ مومن جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں! ②

② ”اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام صرف کرنا، دنیا کا بہترین عمل ہے۔“ ③

اسی طرح دیگر احادیث میں جہاد کی فضیلت آئی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ”أفضل الأعمال“ یعنی بہترین اعمال کی تعیین میں اختلاف ہے۔ اور وجہ اختلاف کی یہ ہے کہ وجوہ افضلیت مختلف ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

① کبھی ایک عمل اس لئے افضل ہوتا ہے کہ کفر اور اسلام میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا عمل فارق نہیں ہوتا، جیسے ایمان۔

- ① سنن الترمذی: أبواب الدعوات، باب منه، رقم الحديث (۳۳۷۷)، سنن ابن ماجہ: کتاب الأدب، باب فضل الذکر، رقم الحديث (۳۷۹۰)
- ② صحیح البخاری: کتاب الجہاد والسمیر، باب أفضل الناس مؤمن یجہد بنفسه و ماله فی سبیل اللہ، رقم الحديث (۲۷۳۴)، صحیح مسلم: کتاب الإمارة، باب فضل الجہاد۔ والرباط، رقم الحديث (۱۸۸۸)
- ③ صحیح البخاری: کتاب الجہاد والسمیر، باب الغدوة والروحة فی سبیل و قاب قوس أحدکم من الجنة، رقم الحديث (۲۶۳۹)، صحیح مسلم: کتاب الإمارة، باب فضل الغدوة والروحة فی سبیل اللہ تعالیٰ، رقم الحديث (۱۸۸۰)

- ① کبھی اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جتنا دخل ایک عمل کو اظہارِ شعائرِ اسلام میں ہوتا ہے، دوسرے کو نہیں ہوتا، جیسے حج۔
- ② اور بعض اعمال اس قسم کے ہیں کہ حقوق العباد میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہوتا، جیسے والدین سے احسان کرنا۔
- ③ اور کبھی ایک عمل کی افضلیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عمل اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے پیش پیش ہوتا ہے، جیسے جہاد فی سبیل اللہ۔
- ④ اور کبھی ایک عمل اس لئے افضل ہوتا ہے کہ وہ وسائل سے نہیں، بلکہ مقاصد میں سے ہوتا ہے اور تقرب الی اللہ کے لیے پیش پیش، جیسے نماز اور ذکر اللہ۔

ان وجوہ مذکورہ کا آپس میں بھی تفاوت ہے، مثلاً وسیلہ مقصد سے بہتر نہیں ہوتا۔ اس لئے نماز، روزہ، جہاد سے افضل ہوں گے۔ کیونکہ نماز مقصد ہے اور جہاد اس کا وسیلہ۔ یعنی جہاد سے اصل مقصد یہ ہے کہ امن و امان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكْنَهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾^①

”اگر ہم نے ان کو زمین میں اقتدار بخشا، تو یہ لوگ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔“

ایک جگہ فرمایا:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾ و ذکر اسم ربہ فصلی^②

① الحج: ٤١

② الأعلى: ١٤-١٥

”جو شخص پاک ہو کر اللہ کا نام لے اور نماز پڑھے، وہ کامیاب ہوا۔“
 نیز جو وسیلہ ہو گا وہ اسی وقت تک رہے گا، جب تک مقصد حاصل نہ ہو اور
 مقصد اس کے بعد بھی رہے گا۔ پس جہاد اسی وقت تک ہے، جب تک دنیا میں فتنہ
 ہے، جب فتنہ نہ رہے گا، تو جہاد ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح جب فتنہ ہوگا، جہاد کو ہی
 اولیت اور افضلیت حاصل ہوگی۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ﴾^①

”لڑو یہاں تک کہ فتنہ (شرک) نہ رہے۔“

جب قتال ختم ہو گیا، تو اس وقت اس کو نیک عمل بھی نہیں کہہ سکتے، چہ جائیکہ
 اس کو بہترین عمل کہیں۔ پھر عمل کا مرتبہ متعین کرنے میں عامل کی حالت کو بھی دخل
 ہوتا ہے۔ ایک مالدار آدمی کیلئے کھانا کھانا خصوصاً قحط میں بہترین عمل ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعُقْبَةُ ۖ فَكْ رَقَبَةً ۖ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذَمِّ

مَسْغَبَةٍ ۖ﴾^②

”آپ کو کیا علم کہ وہ دشوار گزار گھائی کیا ہے؟ وہ غلام آزاد کرنا اور قحط

میں کھانا کھانا ہے۔“

اور سورہ حاقہ میں فرمایا:

﴿إِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيمِ ۖ وَلَا يَحْضُ عَلَىٰ طَعَامِ

الْمَسْكِينِ﴾^③

① البقرة: ۱۹۳

② البلد: ۱۲-۱۳-۱۴

③ الحاقہ: ۳۳-۳۴

”وہ جہنم میں اس لئے گیا کہ اللہ عظیم پر اس کا ایمان نہ تھا اور مسکین کے کھلانے پر ترغیب نہ دیتا تھا۔“
سورۃ مدثر میں فرمایا:

﴿قَالُوا لِمَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۚ وَلَمْ يَكُنْ نَظْعُمِ الْمَسْكِينِ ۚ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۚ وَكُنَّا نَكْذِبُ يَوْمَ الدِّينِ ۚ﴾^①
(دوزخی کہیں گے ہم جہنم میں اس لئے گرے کہ) ”ہم نمازی نہ تھے، نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے، بیہودہ باتیں کرتے اور دن جزاء کو جھٹلاتے تھے۔“

بلکہ جہاد میں کامیابی کا راز ہی ”ذکر اللہ“ کو بتایا گیا ہے۔ فرمایا:
﴿إِذَا الْقِيَمَةُ فَثَبَّتُوا وَادْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾^②
”جب کسی (دشمن) جماعت سے ملو، تو جم کر لڑو، اور اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“
قرآن مجید نے جس قدر ”ذکر اللہ“ کی تاکید کی ہے، کسی اور عمل کی نہیں کی:
﴿ادْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا﴾^③
”اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو۔“

اس تمہید کے بعد بالا اختصار بالترتیب جواب سنئے:

① اس حدیث میں کھانا کھلانا اور سلام کہنا اچھا بتایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں، بعض حالات میں کھانا کھلانا، بہترین عمل ہوتا ہے اور سلام کا پھیلانا، اُس اور

① المدثر: ۴۳-۴۶

② الأنفال: ۴۵

③ مصدر سابق

الفت پیدا کرنے کیلئے بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔

❑ کسی مسلمان کو کسی مسلمان سے اذیت نہ پہنچنا، اتحاد و اتفاق و انسیت و محبت کا بہترین وسیلہ ہے اور اتفاق و اتحاد جہاد کا مقدمہ ہے۔ کیونکہ منتشر قوم جہاد نہیں کر سکتی۔ اس واسطے قرآن نے جہاد کے مقام پر نزاع سے روکا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَنَازَعُوا فِتْنَةً﴾^❶

”نزاع نہ کرو، اس سے بددل ہو جاؤ گے۔“

❑ مقصد اور تقرب الی اللہ کے لحاظ سے نماز سب سے بہتر ہے۔ اور حقوق العباد میں سب سے بہتر عمل والدین کے ساتھ احسان ہے۔ پھر اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے جہاد۔ نماز بلحاظ مقصد کے جہاد اور والدین کے ساتھ احسان کرنے سے بہتر ہے۔ جہاد میں نفع اکثر مخلوق کو ہے اور والدین کے ساتھ احسان کرنے میں نفع صرف والدین کو ہے۔ والدین کے ساتھ احسان کرنا، دوسری مخلوق کے ساتھ احسان کرنے سے بہتر ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے، جب فرض عین نہ ہو۔ اگر فرض عین ہو، تو جہاد والدین کے ساتھ احسان کرنے سے بھی افضل اور مقدم ہے۔

❑ عورتوں کیلئے جب جہاد فرض عین نہ ہو، تو حج جہاد سے بہتر ہے۔ اگر فرض عین ہو، تو پھر عورتوں کے لیے جہاد افضل ہے۔ حدیث میں اولاً تو مخاطب عورتیں ہیں، ثانیاً اس میں لفظ ”لَکُنَّ“ استعمال ہوا ہے۔ اس لئے یہ حکم عورتوں کے لیے ہے۔

❑ کفر اور اسلام میں فرق صرف ایمان کے ساتھ ہوتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر نجات نہیں ہوتی۔ اس کے بعد جہاد، اگر فرض ہو اور پھر حج۔ اگر جہاد فرض عین نہ ہو اور حج فرض ہو، تو حج بہتر ہوتا ہے، کیونکہ فرض عین، فرض کفایہ سے افضل ہوتا ہے۔

۱۶ اللہ کا ذکر تقرب الی اللہ کے بارہ میں سب سے بہتر ہے۔ جہاد چونکہ وسیلہ اور ذکر اللہ مقصد ہے، اس واسطے ذکر اللہ بہتر ہے۔ مگر جہاد فرض عین یا فرض کفایہ ہونے کی بناء پر ذکر اللہ سے بہتر ہے۔ افضلیت کے وجہ مختلف ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾^۱

”اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔“

اور قرآن مجید نے بھی بعض جگہ جہاد کے بغیر جنت کا وعدہ کیا ہے اور مجاہدین کو غیر مجاہدین سے افضل قرار دیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ

دَرَجَةً وَكَلَّا وَعَدَ اللَّهُ الْحَسَنَى﴾^۲

”مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بیٹھنے والوں پر فضیلت

دی ہے اور ہر ایک کو اچھا وعدہ دیا ہے۔“ (یعنی جنت کا)^۳

اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد بعض وقت فرض عین ہوتا ہے اور کبھی کفایہ۔ پہلی صورت میں نجات کیلئے جہاد کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسری صورت میں فضیلت کا جزو ہوتا ہے۔ کیا اب بھی معترض کیلئے کوئی اشکال باقی رہ جاتا ہے؟



① العنکبوت: ۴۵

② التخت: ۹۵

③ تفسیر الطبری: ۴/۲۲۹، تفسیر القرطبی: ۵/۳۲۴، تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۱۸

بارہواں باب

”اللہ کی عبادت“

لکھتے ہیں:

”اس وقت مسلمانوں کی تعداد آٹھ کروڑ سے کم نہیں۔ ان کی آٹھ نوٹوں پھوٹی سلطنتیں بھی موجود ہیں، لیکن ذرا عبرت سے دیکھئے کہ ان کی حالت کیا ہے؟ اول درجے کے جاہل، غیر منظم، بدمعاشرت، نہ کھانے کی تمیز، نہ بات کرنے کا ڈھنگ، نہ قبائح سے نفرت، نہ محاسن کا شوق، چھ کروڑ روسیوں کو دیکھو، ڈھوروں سے بدتر، ایک کروڑ قبائلیوں کی حالت کہ جہالت میں چوٹی تک ڈوبے ہوئے اور صابن سے نا آشنا، چالیس لاکھ کشمیریوں اور پانچ کروڑ چینی مسلمانوں کی حالت ان سے بھی بدتر، مسلمان ہر آب و ہوا ہر ملک میں ملتے ہیں، لیکن ہر جگہ چند چیزیں ان میں مشترک ہیں۔ یعنی جہالت، غلاظت، افلاس، پستی، کام چوری، کاہلی اور اپنی قوم سے غداری۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس بری حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا جواب صرف ایک ہے، ملا اور اس کا حدیثی اسلام! دنیائے اسلام میں لاکھوں مساجد ہیں۔ ان میں لاکھوں ملا، اور ہر ملا صبح و شام مسلمانوں کو مندرجہ ذیل اسباق دے رہا ہے کہ:

① صرف تم اللہ کے محبوب ہو، یہ امت بخشی بخشی بخشائی ہے اور اللہ تمہیں کبھی عذاب نہیں کرے گا۔

- ② ”الدنيا خيفة وطلا بها كلاب“^①
- ”دنیا ایک مردار ہے جس کے طالب گتے ہیں۔“
- ③ ”المؤمن لا ینجس“^②
- ”مومن جسم پر کتنی ہی غلاظت مل لے، وہ ناپاک نہیں ہوتا۔“
- ④ صرف کلمہ پڑھ لینے سے بہشت مل جاتی ہے۔
- ⑤ فقہ اور حدیث کے بغیر باقی تمام علوم ناپاک ہیں۔ سائنس گناہ اور کائنات میں غور کرنا کفر ہے۔
- ⑥ دنیا کا سب سے بڑا عمل رات کے وقت دو نفل ہیں۔
- ⑦ ہر تھو خیرا، خواہ وہ چنگیز ہو یا ہٹلر، اگر ہم پہ حکومت کر رہا ہے، تو وہ ہمارا اولی الامر ہے اور اس کی اطاعت ہم پر فرض ہے۔
- ⑧ خرقة دنیا کا بہترین لباس ہے۔
- ⑨ فلاں دعا ایک لاکھ حج اور لاکھ شہیدوں کا ثواب دلاتی ہے اور جنت میں ایک لاکھ محل مفت بناتی ہے۔
- ⑩ مرشد پکڑے بغیر نجات ناممکن ہے۔
- ⑪ اللہ نے فلاں اختیارات فلاں مُردے کے حوالے کر دیئے ہیں، اس لئے اس سے مرادیں مانگو۔
- انصافاً کہو کہ اگر کسی آدمی کے دماغ میں اس قسم کے عقائد ٹھونس دیئے جائیں کہ دنیا مردار ہے، سائنس گناہ ہے، سب سے اچھا لباس گدڑی

① یہ روایت ”موضوع“ ہے۔ (کشف الخفاء: ۱۳۱۳)

② صحیح البخاری: کتاب الفضل، باب الجنب یخرج و یمشی فی السوق وغیرہ، رقم الحدیث (۲۸۱)، صحیح مسلم: کتاب الحيض، باب الدلیل علی أن المسلم لا ینجس، رقم الحدیث (۳۷۱) اس حدیث کی تشریح آگے آرہی ہے۔

ہے۔ بہشت ہمارے پاس رہن ہو چکی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کو تنظیم کی کیا ضرورت؟ جہاد کیوں کیا جائے؟

ملا تیرہ سو برس سے ان عقائد کی تبلیغ کر رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادہام و باطل ملت کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے۔ ہر فرد دعا گو اور دعا خواں بن کر دنیا کے عمل سے کوسوں دور جا پڑا۔ نہ بلندیوں کا شوق، نہ محنت سے لگاؤ، نہ عمل سے تعلق، نہ لہو میں حرارت۔ نہ سینوں میں تڑپ، نہ نعموں میں لذت، نہ نوحوں میں اثر، پاؤں ذوقِ رفتار سے بیگانہ اور ہاتھ کا لذت سے محروم۔

ہر مرض، ہر افتاد اور ہر حادثہ کا علاج دعا سے کیا جاتا رہا، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں اتحادیوں نے مار مار کر ترکی کا حلیہ بگاڑ دیا اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ”رَبَّنَا انصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ“ کی لمبی لمبی دعائیں مانگتے رہے۔ انہیں کون سمجھائے کہ دنیا دارِ العمل ہے۔ یہاں صرف عمل سے پیڑے پار ہوتے ہیں۔ سارا قرآن محنت، صبر، ابتلاء، جاں سپاری اور جہاد کی طرف بلا رہا ہے اور قدم قدم پر یہ دھمکی دے رہا ہے کہ اگر تم نے عمل چھوڑ دیا، تو ہم کسی اور قوم کو تمہارا وارث بنا دیں گے۔ وہ امیہ، وہ عباسیہ، وہ ہسپانوی، وہ سلاجقہ، وہ تیموری، وہ ایوبی اور اس طرح کے ایک سو بیس اور سلسلے، جب یہ سب عیاش بن گئے، کام چھوڑ دیا، محنت سے کترانے لگے، تو اللہ (تعالیٰ) نے ان کی داستانِ عظمت و شہمت افسانہ بنا کے رکھ دی۔ دنیا میں ہر عمل کا ایک صلہ ہے، جو کسی صورت میں اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن حدیث کچھ اور ہی کہتی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ کے

بمراہ ایک سواری پر تھا، آپ نے فرمایا کہ جو شخص منہ سے ”لا إله إلا الله“ کہے گا، اس پر جہنم کو حرام کر دیا جائے گا۔ معاذ نے پوچھا: میں سب کو ارشاد سناؤں؟ فرمایا کہ لوگ اس پر اعتماد کر کے سُست ہو جائیں گے۔ چنانچہ معاذ نے مرتے وقت یہ حدیث ظاہر کی۔^①

بعض علماء کہتے ہیں کہ کلمہ اسلام کا دروازہ ہے۔ جو شخص اس دروازے میں داخل ہوگا، یا یوں کہے کہ اسلامی سوسائٹی کا ممبر بن جائے گا، اسے لازمی اسلامی کردار اختیار کرنا پڑیگا، لیکن یہ فرمائیے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ کو اس حدیث کی تبلیغ سے کیوں روک دیا؟ کیا اسلامی کردار سستی پیدا کرتا ہے؟ ہمارے اس استدلال کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ (آگے مسلم والی ایک حدیث بیان کی ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔)^②

(اس کے بعد ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ) ابوذر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس گیا، آپ نے فرمایا: جب کوئی آدمی ”لا إله إلا الله“ کہتا ہے اور اس کی موت اسی عقیدے پر ہو جاتی

① صحیح البخاری: کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوما دون قوم کراہیۃ أن لا یفہموا، رقم الحدیث (۲۱۸)، صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب الدلیل علی أن من مات علی التوحید دخل الجنة قطعاً، رقم الحدیث (۱۲۸)

② یعنی جس حدیث میں ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ جو شخص بھی دل کے یقین کے ساتھ ”لا إله إلا الله“ کی گواہی دیتا ہے، اس کو جنت کی خوشخبری دے دو، جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ حدیث سنائی، تو وہ ان کو نبی اکرم ﷺ کے پاس لے گئے اور بعد میں آپ ﷺ نے عام لوگوں کو اس حدیث کی خبر دینے سے منع کر دیا۔ (صحیح مسلم)

کتاب الایمان، باب الدلیل علی أن من مات علی التوحید دخل الجنة قطعاً، رقم الحدیث (۳۱)

ہے، تو وہ جنت میں چلا جاتا ہے، میں نے پوچھا: اگر وہ زانی اور چور ہو تو پھر؟ فرمایا: پھر بھی جنت میں جائے گا۔ میں نے تین مرتبہ یہی سوال پوچھا اور آپ نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا، اور چوتھی مرتبہ کہنے لگے۔ ”علیٰ رِغْمِ أَنْفِ أَبِي ذَرٍّ“^① کہ وہ جنت ہی میں جائے گا، خواہ ابو ذر کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو!

حالانکہ بعض ایسی احادیث بھی ہیں، جو ان احادیث کے بالکل خلاف ہیں، مثلاً:

① غمّاز جنت میں نہیں جائے گا۔^②

② تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ گفتگو کرے گا، نہ انہیں دیکھے گا اور نہ ان کے گناہ معاف کرے گا، بلکہ انہیں سخت عذاب دے گا:

⑤ اَوَّلُ : دامن گھسیٹ کر چلنے والا۔

⑥ صَوْم : احسان کر کے جتانے والا۔

⑦ لُصُوم : جھوٹی قسم کھا کر سوزا بیچنے والا۔^③

ایک حدیث میں ہے، جو شخص کسی مسلمان کا حق کھاتا ہے، اس پر جنت حرام کر دی گئی ہے۔ ایک شخص نے پوچھا: خواہ وہ حق بہت تھوڑا ہو؟ فرمایا: وہ درخت کی ایک ٹہنی ہو۔“^④ (دوا سلام)

① صحیح البخاری: کتاب اللباس، باب الثياب البيض، رقم الحديث (۵۴۸۹)، صحیح

مسلم: کتاب الإیمان، باب من مات لا یشرک باللہ شیئاً دخل الجنة، رقم الحديث (۹۴)

② صحیح البخاری: کتاب الأدب، باب ما یکره من النمیمۃ، رقم الحديث (۵۷۰۹)، صحیح

مسلم: کتاب الإیمان، باب بیان غلط تحریم النمیمۃ، رقم الحديث (۱۰۵)

③ صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب بیان غلط تحریم إسبال الإزار..... رقم الحديث (۱۰۶)

④ صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم یمین فاجرة بالنار، رقم

الحديث (۱۳۷)

جواب:

ابو ہریرۃؓ، معاذ اور ابوذر رضی اللہ عنہم کی حدیث کا جواب ہو چکا ہے۔ ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صدق دل سے کلمہ پڑھے، ضرور ہے کہ قرآن و سنت پر عمل کرنے پر آمادہ ہوگا، مگر پھر بھی بشر ہے اور بشر سے غلطی ہو سکتی ہے۔ اگر کسی وقت اس سے اس قسم کی غلطی سرزد ہو، تو ضرور ہے کہ وہ فوری طور پر سنبھل جائے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ غلطی کے بعد توبہ کرے اور پشیمان ہو کر استغفار کرے،^① اور فتح الباری میں ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے اخیر میں یہ لفظ ہیں کہ ”ثم ندم واستغفر“ پھر پشیمان ہو کر تائب ہو جائے، تو اس صورت میں وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اور اس معنی کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

باقی تیرہ باتیں جو ملا اور حدیثی اسلام کی طرف منسوب کی ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں۔ بعض کی نسبت حدیث کی طرف تو بہتان ہے۔ اور بعض حدیثیں موضوع ہیں اور بعض کا مطلب غلط بیان کیا گیا ہے:

① ”یہ امت بخشی بخشائی ہے“ یہ اس امت کیلئے ہے، جو متبع ہو، نہ اس امت کیلئے، جو نافرمان ہو۔ حدیثوں میں اس کی تعیم ثابت نہیں۔

② دنیا سے وہ چیزیں مراد ہیں، جو اللہ سے غافل کریں۔ نہ مال دنیا، خواہ غافل کرے یا نہ کرے۔

③ ”مومن نجس نہیں ہوتا“ کا تو یہ مطلب ہے کہ مومن کی عادت ہے کہ وہ نجاست سے پرہیز کرتا ہے، اس لئے حدیث اور جنابت میں بھی وہ پاک ہی رہتا ہے۔ یہ کہنا کہ ”مومن جسم پر کتنی ہی غلاظت مل لے، ناپاک نہیں ہوتا“ جہالت ہی

نہیں، حدیث سے استہزاء بھی ہے!

③ صرف کلمہ پڑھنے سے نجات کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔

⑤ ”فقہ اور حدیث کے علاوہ باقی علوم ناپاک ہیں۔“ یہ فتویٰ کسی عالم کا نہیں، جبکہ درس نظامی میں صرف ونحو، ادب، اصول فقہ، تفسیر، اقلیدس، حساب، علم ہندسہ موجود ہیں۔ بلکہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کا فتویٰ موجود ہے کہ مسلمانوں کو انگریزی سیکھنی چاہئے۔

⑥ ”دنیا کا سب سے بڑا عمل رات کے وقت دو نفل ہیں۔“ اس حدیث کا غلط ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”تمام دنیا و مافیہا سے دو رکعتیں بہتر ہیں۔“ ① یعنی یہ دو رکعتیں آخرت کا زاد ہیں۔ اس لئے وہ دنیا سے بہتر ہیں۔

④ ہر تنخوا خیرے کو اہل علم امیر نہیں مانتے، اگر کسی نے غلطی کی ہے، تو تمام علماء کیوں کر مطعون ٹھہرے؟!

⑧ گدڑی والی حدیث پر پہلے بحث ہو چکی ہے کہ یہ ”صحیح“ نہیں۔ ② نہ علماء محققین اس قسم کی احادیث بیان کرتے ہیں۔

⑨ لاکھ شہید کے ثواب والی روایات موضوعۃ کو بھی اہل علم جو حدیث سے

① یہ روایت انقطاع وارسال کی وجہ سے ضعیف ہے، اس روایت کے متعلق حافظ عراقی فرماتے ہیں: وہ صحیح نہیں ہے۔ (الزهد لابن المبارك: ۴۵۶ (۱۲۸۹)، التہجد و قیام اللیل لابن أبي الدنيا: ۳۵۵ (۲۹۴)، تخريج أحاديث الإحياء للعراقي: ۳۲۶/۱، السلسلة الضعيفة: ۱۳۵/۸)

② یہ روایت ”موضوع“ ہے۔ (الموضوعات لابن الجوزي: ۴۸/۳، الفوائد المجموعة: ۱۹۲، السلسلة الضعيفة: ۲۰۶/۱ (۹۰))

واقف ہیں، بیان نہیں کرتے۔

⑮ ”مرشد پکڑے بغیر نجات ناممکن نہیں۔“ یہ بھی محققین علماء کا مذہب نہیں ہے۔

اسی طرح مُردوں کے سپرد اختیارات کا ہونا بھی علماء واقف کار کا خیال نہیں۔ اگر بعض ملاؤں نے جو بالکل جاہل تھے، ایسی باتیں کہی ہوں، تو اس کا اثر تمام دنیا کے مسلمانوں پر کیسے پڑ سکتا ہے؟

مسلمانوں کی پستی و زوال و عکبت و افلاس کا جائزہ لینے کیلئے بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ملا کی یہ بات تو مان لی گئی کہ جہاد کو چھوڑ دیا۔ مگر ملا کا یہ کہنا کہ ”نماز پڑھو اور روزے رکھو۔“ اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ حقیقت پر پردہ نہ ڈالئے۔ اصل وجہ جس کی بناء پر یہ سب عیوب مذکورہ پیدا ہوئے، کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لوگ اندھی تقلید کے عادی ہو گئے اور قرآن و سنت میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا، اور بعض لوگ اس قدر آزاد ہو گئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف کی روش کو چھوڑ کر غور کرنے لگے۔

قرآن و سنت میں مجموعی نظر کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور یہی آئمہ و محدثین، اہلحدیث اور محققین اہل سنت کا مسلک چلا آ رہا ہے کہ سلسلہ اسباب میں دعا بھی داخل ہے۔ جیسے نتائج کے ظاہر اسباب ہیں، اسی طرح بعض اسباب پوشیدہ بھی ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں جا بجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً تقویٰ و نیکی رزق کی وسعت کا سبب ہے، جب کہ بدکاری رزق کی تنگی کے اسباب میں داخل ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تجارت، زراعت، صنعت و ملازمت کو وسعت رزق میں کوئی دخل نہیں۔ کبھی کبھی باطنی اور ظاہری اسباب موافق ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تعارض ہوتا ہے۔ اس تعارض میں کبھی ظاہر کو ترجیح ہوتی ہے، اور کبھی باطنی اسباب کو، اس کیلئے کوئی قاعدہ مقرر نہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کیلئے حکمت ہوتی ہے، پس حکمت کے مطابق ”نتائج کا ٹکٹا“ اسی کا نام ”سنة اللہ“ ہے۔ اور جیسے ظاہری اسباب کا

حاصل کرنا نتیجہ کے حصول کیلئے ضروری ہے۔ اسی طرح باطنی اسباب مثلاً نماز، روزہ، ذکر اللہ اور خلق سے رحم وغیرہ کو اختیار کرنا بھی لازمی ہے۔ جیسے توپ و تفنگ کی ضرورت ہے۔ ویسے ہی ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾^① کہنے کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح اخلاقی اصلاح اور حاکمانہ اوصاف کا پیدا کرنا بھی فرض ہے۔



تیرہواں باب

لفظ ”مغفرت“ کی تحقیق

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

”مغفرت کے معنی ہیں پردہ پوشی کے، یعنی معاف نہیں ہوتا، بلکہ اس پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جو گناہ ہوتا ہے، اس کی سزا مل جاتی ہے۔ جو محنت نہ کرے وہ ایک دفعہ فیل ہو کر سزا بھگت لیتا ہے۔ سو اگر اپنی اصلاح کرے، یعنی محنت کرے، تو اس کے گناہ (نہ محنت کرنے پر) ہر جانہ ہے۔ اس میں دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک گناہ سے بچنا، دوم تلافی مافات کیلئے صحیح اور فطری کوشش کرنا۔ خرابی صحت کیلئے فطری کوشش عادت بد سے اجتناب اور ورزش وغیرہ ہے، نہ کہ ڈھول بجانا یا سر سے ہیرا بچھا پڑھنا۔ امتحان میں ناکامی کا علاج کثیف نصاب کو پڑھنا اور مضامین کو یاد کرنا ہے، نہ کہ باہر جا کر گڑھے کھودنا۔

لیکن بعض احادیث ایسی موجود ہیں، جو تلافی مافات کیلئے غیر فطری اور مضحکہ خیز تدابیر پیش کرتی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چند آدمیوں کو وضو کا طریقہ بتا کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح وضو کیا کرتے تھے۔ جو شخص اس طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے، اس کے تمام اگلے پچھلے گناہ

مغاف ہو جاتے ہیں۔ (بخاری) ^①

① صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً، رقم الحدیث (۱۵۸)، صحیح

مسلم: کتاب الطہارۃ، باب صفۃ الوضوء و کمالہ، رقم الحدیث (۲۲۶) اس حدیث کے

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص باپ کو قتل کرنے کے بعد وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے، تو گناہ معاف ہو گیا۔ یا کوئی طالب علم سال بھر کام نہ کرے اور آخر میں دو رکعت نماز پڑھ لے، تو سستی کا گناہ معاف ہو گیا۔ یا کوئی شخص درخت سے کود کر ٹانگیں تڑوا لے اور فوراً دو رکعت نفل پڑھ لے، تو گناہ معاف!

۲۔ جب نماز میں امام ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے اور مقتدی ”آمین“ کہیں اور ان کی آمین کا وقت فرشتوں کی آمین کے وقت سے مل جائے، یعنی سب ہم نوا ہو جائیں، تو ان سب کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔^①

۳۔ کتے کو پانی پلانے۔

۴۔ راستے سے کانٹا ہٹانے۔

۵۔ اور چند دعاؤں کے ورد کرنے سے یہ سارے گناہ معاف کئے جا رہے ہیں۔

۶۔ وضو کرنے سے منہ، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔^②

(دو اسلام)

جواب:

مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ گناہ معاف ہو جائے، یعنی اس کا اثر جاتا رہے۔ اس جگہ اثر سے مراد وہ اثر ہے، جو اس کے صحیفے میں درج ہو چکا ہے یا اس کے

آخر میں مندرجہ ذیل الفاظ ہیں: ”غفر له ما تقدم من ذنبه“ یعنی ایسے شخص کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، نہ کہ اگلے گناہ، جیسا کہ برق صاحب سمجھ رہے ہیں! اس حدیث میں ایسے کوئی الفاظ نہیں ہیں، جن سے مترشح ہوتا ہو کہ ایسے شخص کے آئندہ سرزد ہونے والے گناہ بھی معاف کر دیے جائیں گے۔ لہذا اس کا ترجمہ ”تمام اگلے پچھلے گناہ معاف“ کرنا درست نہیں۔

① صحیح البخاری: کتاب الصلاة، باب جهر المأموم بالتأمين، رقم الحديث (۷۴۹)

② صحیح مسلم: کتاب الطهارة، باب خروج الخطايا مع ماء الوضوء، رقم الحديث (۲۴۴)

روح پر طاری ہو چکا ہے۔ مغفرت کے بہت سے اسباب ہیں:

مغفرت کے اسباب:

① توبہ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ پچھلے گناہ کو چھوڑ دے اور آئندہ کیلئے اس سے رک جانے کا پختہ ارادہ کرے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿قُلْ لِلذِّينِ كَفَرُوا إِن يَنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ﴾^①
 ”کافروں سے کہہ دیجئے، اگر وہ رک جائیں، تو ان کے پہلے گناہوں کی مغفرت ہو جائے گی۔“

② نیکوں سے بھی گناہ کے وہ اثرات جو دل پر چڑھ گئے ہوں، دور ہو جاتے ہیں:

﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾^②
 ”نیکیاں گناہوں کو لے جاتی ہیں۔“

گناہ کی مثال بیماری کی سی ہے۔ بیماری کے ازالہ کیلئے پرہیز کی سخت ضرورت ہے۔ بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں، جو پرہیز سے زائل ہو جاتی ہیں۔ پھر غذا اور ہوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض بیماریاں اس قسم کی ہوتی ہیں، جو صرف غذا اور ہوا کی تبدیلی اور اصلاح سے رفع ہو جاتی ہیں۔ اور بعض میں علاج بالدواء کی ضرورت ہوتی ہے۔ توبہ بمنزلہ پرہیز کے ہے۔ نیکیاں بمنزلہ غذا اور ہوا کے ہیں اور استغفار و دعا بمنزلہ علاج بالدواء کے ہے۔ دعا کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾^③

① الأنفال: ۳۸

② ہود: ۱۱۴

③ غافر: ۶۰

”مجھ سے دعا کرو، میں تمہارا مقصد پورا کروں گا۔“

گناہ کے اثرات:

گناہ کے اثرات دو قسم کے ہیں:

ایک وہ طبعی نتائج جن کو مادی کہنا زیادہ مناسب ہے، جیسے نہ پڑھنے سے فیل ہو جانا، درخت پر سے کودنے سے ٹانگ ٹوٹ جانا اور باپ کو قتل کرنے سے اس کے سایہ سے محروم ہو جانا۔

اور بعض اثرات جن کو ”شرعی“ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ ان کا وجود شریعت سے معلوم ہوا ہے، جیسے دل کا سیاہ ہو جانا، نورِ دل کا مٹ جانا، برائی کی طرف راغب ہو جانا، نیکی سے متنفر ہو جانا، اللہ کی طرف سے لعنت کا اترنا، لوگوں کے دلوں میں بلا وجہ اس سے بڑی نفرت کا پیدا ہو جانا، وغیرہ وغیرہ۔

گناہ کا مفہوم:

شرعاً گناہ اسے کہتے ہیں کہ کسی واجب کو چھوڑا جائے یا کسی ممنوع کام کو کیا جائے۔ اگر کوئی شخص پھسل جائے اور اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے، تو یہ شرعاً گناہ نہیں، لیکن گرنے اور چوٹ لگنے کی وجہ سے مادی نتائج سے نہیں بچ سکا۔ پھر شرعی گناہ کی بعض صورتوں میں اس کا ایک مادی اثر بھی ہوتا ہے۔

گناہ کے اثرات کا علاج:

پھر مادی اثر کے ازالہ کیلئے مادی علاج بھی کرنا پڑتا ہے اور شرعی اثر کے ازالہ کیلئے شریعت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جب انسان سے غلطی ہوتی ہے، تو اس کے علاج کیلئے شرعاً اور طبعاً پہلے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس کام کو چھوڑ دے، جس سے وہ بیمار ہوا ہے۔ پھر اس بیماری کے ازالہ کے اسباب ڈھونڈے، مثلاً

اگر کسی شخص کو حرام کاری سے سوزاک ہو گیا ہے، تو پہلے اس کیلئے لازم ہے کہ آئندہ ایسی حرام کاری سے بچے۔ پھر سوزاک کے علاج میں ان ادویہ کو استعمال کرے، جن سے سوزاک رفع ہوتا ہے۔ صرف مخصوص حرام کاری سے بچنا ہی کافی نہیں۔ یہاں تلائی مافات سے کام نہیں چلتا۔

اگر کوئی شخص اپنے والد کو مار ڈالے، جس کی وجہ سے وہ طبعی طور پر باپ کے سایہ سے محروم ہو گیا، تو اس وقت تلائی مافات کی کیا صورت ہوگی؟ کیا اس کا آئندہ کسی کو قتل نہ کرنا، اس کے باپ کو واپس لاسکتا ہے؟ اگر کوئی نے کسی کی ٹانگ ٹوٹ جائے، تو تلائی مافات کی کیا صورت ہے۔ صرف آئندہ کو دینے سے پرہیز کرنا، اس کی ٹانگ کو درست کر سکتا ہے؟ اس کیلئے الگ علاج کی الگ ضرورت ہے۔

حقوق کی اقسام:

حقوق دو قسم کے ہیں: ایک حقوق العباد اور دوسرے حقوق اللہ۔
حقوق العباد کی تلائی کی شرعی صورت یہی ہے کہ ان کو ادا کرے یا معاف کرائے۔
اور حقوق اللہ میں توبہ سے معافی ہو جاتی ہے۔

گناہ کی اقسام:

اور گناہ بھی دو قسم کے ہیں: صغیرہ اور کبیرہ۔
چھوٹے گناہ نیکوں سے معاف ہو جاتے ہیں اور نیکوں سے گناہوں کا دور ہونا اسی طرح ہے جس طرح ادویہ سے بیماری زائل ہو جاتی ہے۔ حدیث میں جو یہ وارد ہے کہ دو رکعتوں سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، ان سے مراد چھوٹے گناہ ہیں نہ کہ بڑے، جیسے احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔ پھر چھوٹے گناہ اس وقت معاف

ہوتے ہیں، جب بڑے گناہ نہ ہوں۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔^①

مغفرت کے طریقے:

مندرجہ ذیل آیات میں اپنے خیال کے فطری طریقے گناہ کے دور ہونے کے بتائے:

① ﴿إِنْ الْحَسَنَاتِ يَذْهَبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾^②

”نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔“

② ﴿إِنْ تَخْضَوْهَا وَتُؤْتِهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيَكْفِرُ

عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾^③

”اگر تم صدقہ چھپا کر فقراء کو دو، تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے اور تمہاری

برائیاں اس سے دور ہوں گی۔“

③ قُلْ خَطَايَايَ دُوَاهُ كَا رُوْزِهِ بَتَايَا، پھر کہا:

① قرآن مجید میں بھی اس بات کی تصریح موجود ہے کہ اگر کبائر سے اجتناب کیا جائے، تو صغیرہ گناہ

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے معاف کر دیتے ہیں: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ

الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّغَمَ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ.....﴾ (النجم: ۳۲)

نیز فرمایا: ﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ.....﴾ (النساء: ۳۱)

اسی طرح کئی احادیث میں بھی اس بات کی صراحت موجود ہے کہ بعض اعمال کے نتائج میں

جو گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے، وہ اسی صورت میں ہے کہ کبیرہ گناہوں سے احتراز کیا جائے، محض

ان اعمال کے کرنے سے کبیرہ گناہ معاف نہیں ہوتے۔ دیکھیں: صحیح مسلم: کتاب الطہارۃ،

باب فضل الوضوء والصلاة عقبہ، رقم الحدیث (۲۲۸)، و باب الصلوات الخمس والجمعة إلى

الجمعة، و رمضان إلى رمضان مکفرات لما بینہما ما اجتنبت الکبائر۔

② ہود: ۱۱۴

③ البقرة: ۲۷۱

﴿توبۃ من اللہ﴾^①

”اس سے تمہاری توبہ قبول کرے گا۔“

② قسم کا کفارہ غلام آزاد کرنا، کھانا کھلانا یا کپڑا پہنانا ہے۔ اگر طاقت نہ ہو، تو روزہ رکھنا۔^②

③ احرام میں شکار کے عوض قربانی کرنا، یا روزے رکھنا، یا کھانا کھلانا۔^③

④ ظہار میں غلام آزاد کرنا، کھانا کھلانا، روزے رکھنا۔^④

⑤ ﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نَكْفُرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾^⑤

”اگر تم کبائر سے بچو گے، تو ہم تمہاری برائیاں دور کر دیں گے۔“

⑥ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونِ ذَلِكَ﴾^⑥

”اللہ شرک معاف نہیں کرتا، شرک کے سوا جسے چاہے معاف فرمادے۔“

آپ کے نزدیک تو یہ سب غیر فطری طریقے ہیں۔ کیونکہ آپ کے ہاں فطری طریقہ صرف یہ ہے کہ جس امر کے چھوڑنے پر اس کو سزا ملی، اس کو کرے۔ اگر کسی کے کرنے سے سزا ملی ہے، تو اس کو نہ صرف چھوڑے، بلکہ علاج بھی کرائے۔ یہاں قرآن میں نیک اعمال کو ہی بار بار کفارے میں ذکر کیا گیا ہے۔ قتل، زنا، چوری وغیرہ کبائر گناہ وضو اور نماز سے معاف نہیں ہوتے۔ اس کی صراحت احادیث میں موجود

① النساء: ۹۲

② دیکھیں: المائدة: ۸۹

③ دیکھیں: المائدة: ۹۵

④ دیکھیں: المجادلة: ۳-۴

⑤ النساء: ۳۱

⑥ النساء: ۱۱۶

ہے،^① کم از کم ”مشکوٰۃ“ ہی دیکھ لو!!

توجیہ:

بعض علماء نے ان ادلہ کی جو ”مکفر سیئات“ کے بارہ میں وارد ہیں، ایسی توجیہ کی ہے، جو مادی امور سے زیادہ موزوں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روزے سے وہ گناہ دور ہوتے ہیں، جن کا اثر اس اثر کے منافی ہے، جو روزے سے پیدا ہوتا ہے، یعنی جن گناہوں کا تعلق شہوتِ بطن اور فرج سے ہے، روزہ ان کا کفارہ ہوگا، کیونکہ روزہ رکھنے اور نفس پر کنٹرول کرنے سے گناہ کا میلان کم ہو جائے گا۔ اور نماز پڑھنے سے وہ گناہ دور ہوں گے، جو اللہ کی رضا کے منافی ہیں۔ وقس علیٰ هذا!



① دیکھیں: صحیح مسلم: کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء والصلاة عقبہ، رقم الحدیث (۲۲۸)، و باب الصلوات الخمس والجمعة إلى الجمعة ورمضان إلى رمضان مکفرات لما بینھن ما اجتنب الکبائر۔

چودھواں باب

شفاعت

اعتراض:

”قرآن کریم میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ آنحضرت ﷺ محشر میں سفارش کریں گے، البتہ دنیا میں استغفار کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تلافیِ مافات کیلئے کمر بستہ ہو جائیں اور حضور ان کی رہبری فرمائیں، تو ان کے پچھلے گناہ چھپ جائیں گے۔
اس مضمون کے علاوہ قرآن میں شفاعت کا اور کوئی تخیل موجود نہیں، بلکہ عدم شفاعت کا ذکر ہے:

﴿وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةً﴾^①

”نہ اس سے شفاعت قبول ہوگی۔“

آنحضرت نے اپنی لڑکی کو فرمایا:

﴿لَا أَغْنِي عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا﴾^②

”میں اللہ کے دربار میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔“

اب ذرا محدثین کا نقطہ نگاہ ملاحظہ کیجئے:

① البقرة: ۴۸

② صحيح البخاري: كتاب الوصايا، باب هل يدخل النساء والولد في الأقارب، رقم الحديث (۲۶۰۲)، صحيح مسلم: كتاب الإيمان، باب في قوله ﴿وَأَنْذِرْ غَشِيْرَتَكَ﴾ الأقرئين ﴿رقم الحديث (۲۰۴)﴾

ابوہریرہؓ کی حدیث میں شفاعت کا ذکر ہے۔^① مگر اس حدیث میں یوسفؑ کے پاس جانے کا ذکر نہیں، حالانکہ ان کے متعلق آنحضرتؐ کی شہادت ہے کہ وہ سب سے زیادہ کریم ہیں۔^② یعنی ”اکرم الناس“ ہیں۔ اگر کسی طالب علم کو معلوم ہو جائے کہ وہ محنت نہ کرے گا، تب بھی پاس ہو جائے گا، تو یقیناً محنت چھوڑ دیگا۔ احادیث شفاعت میں اس قسم کا وعدہ آنحضرتؐ سے بھی کیا جا چکا ہے:

”إنا سنرضيك في أمتك ولا نسوءك“^③
 ”ہم تجھے تیری امت میں راضی کریں گے اور مغموم نہ ہونے دیں گے۔“
 (دو اسلام)

جواب:

زندوں کیلئے استغفار ہے اور مردوں کیلئے دعا، منافقوں اور مشرکوں کے لیے البتہ

ممانعت ہے:

﴿ولا تصل على أحد منهم مات أبداً﴾^④

① صحیح البخاری: کتاب التفسیر، باب ﴿ذرية من حملنا مع نوح إنه كان عبداً شكوراً﴾
 رقم الحدیث (۴۴۳۵)، صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب أدنى أهل الجنة منزلة فيها،
 رقم الحدیث (۱۹۴)

② صحیح البخاری: کتاب الأنبياء، باب قول الله تعالى ﴿وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾
 الحدیث (۳۱۷۵)، صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب من فضائل يوسف عليه السلام،
 رقم الحدیث (۲۳۷۸)

③ صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب دعاء النبي ﷺ لأمتة و بكائه شفقة عليهم، رقم
 الحدیث (۲۰۲)

④ التوبة: ۸۴

”اگر کوئی منافق مر جائے، تو اس کے لیے دعا نہ کر۔“

﴿ربنا اغفر لنا ولإخواننا الذين سبقونا بالإيمان﴾^①

”اے ہمارے رب! ہم کو بخش دے اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے

ایمان میں سبقت کر چکے ہیں۔“

جب مردے کیلئے دعا اور استغفار ثابت ہے، تو غور کرنے کے بعد یہی شفاعت

کی حقیقت ہے، اور آیت ﴿ما للظالمين من حميم ولا شفيع﴾^② کی حقیقت ہے، (ظالموں یعنی مشرکوں کیلئے کوئی غمخوار نہیں اور شفیع نہیں) بھی اپنے اسلوب سے بتا رہی ہے کہ غیر ظالموں (غیر مشرکوں) کی شفاعت ہوگی۔

اور ایک جگہ فرمایا:

﴿فما تنفعهم شفاعۃ الشافعين﴾^③

”ان فرقوں کو شافعین کی شفاعت کا نفع نہ ہوگا۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چار فرقوں کے علاوہ باقی کو شفاعت نفع دیگی۔ نفی

شفاعت کی آیتوں میں مشرکین کا ذکر ہے یا کافروں کا۔ اور مغفرت کے مفید ہونے کا جہاں ذکر ہے، اس سے مراد موحد مسلمان ہیں۔

شفاعت کی حقیقت:

باقی یہ کہ یوسف علیہ السلام کا اس حدیث میں ذکر نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے محشر کے دن کے تمام امور کا یہاں بیان نہیں کیا۔ صرف جو آپ کو بذریعہ کشف دکھائی دیئے، وہ بتائے۔ (مسند احمد)

① الحشر: ۱۰

② غافر: ۱۸

③ المدثر: ۴۸

باقی رہی یہ بات کہ شفاعت سے لوگ گناہ پر دلیر ہو جائیں گے، غلط ہے۔ کیونکہ شفاعت بے نماز کی نہیں ہوگی، بلکہ نمازی کی ہوگی۔ پھر شفاعت مذکور اس وقت شروع ہوگی، جب گناہگار جہنم میں جا چکے ہوں گے۔ پھر سب کے سب ایک ہی بار نہیں نکالے جائیں گے، بلکہ متعدد دفعہ میں نکالے جائیں گے۔ کوئی پہلے اور کوئی پیچھے، اس کی یہی وجہ ہوگی کہ گناہ کے مراتب مختلف ہوں گے، پس جو لوگ سب سے پہلے نکالے جائیں گے، باوجود نمازی، روزہ دار اور حاجی ہونے کے بعض کبار کی بناء پر اتنی دیر جہنم میں رہیں گے۔ اس سے پہلے میدانِ معشر میں اور اس سے پہلے عالمِ برزخ میں سزا اٹھا چکے ہونگے۔ شفاعت کے باوجود اگر گناہگار کو اتنی سزا کا ڈر ہو، تو کب گناہ پر دلیر ہو سکتا ہے؟

اگر بہ نظر غور دیکھا جائے، تو حقیقت میں شفاعت آنحضرت ﷺ کی اتباع کی صورت ہے، یعنی گناہ کی سزا دو قسم کی ہے۔ ایک اس گناہ کی حقیقت اور مرتبہ کے لحاظ سے۔ اور ایک اس لحاظ سے کہ وہ متبع ہے۔ ظاہر ہے کہ متبع اور مجرم برابر نہیں ہو سکتے۔ متبع کی سزا میں تخفیف ہونی چاہئے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ ایک گناہ کی سزا فی نفسہ ایک سال ہے، مگر متبع ہونے کی بناء پر اس کی سزا ایک ماہ ہے۔ پس گیارہ ماہ جو سزا میں تخفیف ہے وہ اتباع کی وجہ سے ہے۔ یہ اتباع چونکہ آنحضرت ﷺ کی ہے۔ اس واسطے یہ تخفیف قیامت کے دن شفاعت کی صورت میں ظاہر ہوگی، جس سے آنحضرت ﷺ کی قدر و منزلت کا اظہار بھی ہوگا اور آپ ﷺ کی اتباع کی افادیت کا بھی!



پندرہواں باب

”قرآن سے متصادم احادیث“

”قرآن میں ہے: ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾^① (دین میں کوئی جبر نہیں) ایک حاکم کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی قلمرو میں امن قائم کرنے کے لئے جرائم کا استیصال کرے۔ اس کیلئے تلوار استعمال کرے۔ اس نازک فرض کو سمجھنے کیلئے یہ آیت پڑھیے:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كَلَهُ لِلَّهِ﴾^②
 ”تم کفار سے اس وقت تک لڑو، جب تک بدامنی ختم نہ ہو جائے، اور تمہارا قانون قلمرو میں نافذ نہ ہو جائے۔“

دین کے دو معنی ہیں:

☆ **اول:** ضابطہ اسلامی۔

☆ **دوم:** اس ضابطہ کا وہ حصہ جس کا نفاذ قیام امن کیلئے قلمرو میں ضروری ہے۔

پہلی حدیث:

اب یہ حدیث ملاحظہ ہو:

((أَمَرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوا))

① البقرة: ۲۵۶

② الأنفال: ۳۹

ذلک عصموا منی دماء ہم و أموالهم إلا بحق الإسلام
وحسابهم علی اللہ))^①

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں، جب تک وہ خدا کو ایک جان کر میری رسالت کا اقرار نہ کریں اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کے پابند نہ ہو جائیں۔ اگر وہ ان باتوں کو مان لیں، تو پھر میں ان کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ ہاں جان و مال میں اللہ کے حقوق کسی طرح ساقط نہیں ہوں گے۔“

یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے:

اول: قرآن حکیم نے بدامنی کو روکنے اور مظالم کے انسداد کیلئے جہاد کا حکم دیا ہے، نہ کہ قرآن کی تعلیم زبردستی منوانے کیلئے۔ لیکن اگر مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کوئی پیدا ہو جائے تو جنگ ختم کر دو:

اول: جب بدامنی اور فتنہ ختم ہو جائے۔

دوم: جب دشمن سے صلح ہو جائے:

﴿وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا.....﴾^②

”اگر وہ صلح چاہیں تو ان سے صلح کر لو۔“

سوم: جب وہ جزیہ دینے پر راضی ہو جائے:

﴿حَتَّىٰ يَعْطُوا الْجِزْيَةَ.....﴾^③

① صحیح البخاری: کتاب الإیمان، باب ﴿فَإِنْ تَأْتَوْا وَ أَقَامُوا الصَّلَاةَ.....﴾ رقم

الحديث (۲۵) صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب الأمر بقتال الناس حتى يقولوا لا إله إلا

الله، رقم الحديث (۲۲)

② الأنفال: ۶۱

③ التوبة: ۲۹

”یہاں تک کہ جزیہ ادا کرنے پر راضی ہو جائیں۔“

چہارم: جب وہ اسلام قبول کرے:

﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ﴾^①
 ”یعنی وہ توبہ کرنے کے بعد اگر صلوٰۃ و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں، تو پھر ان کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔“

سورہ توبہ کی ابتدائی آیات میں مشرکین سے اعلان جنگ کی وجہ یہ نہیں بتائی گئی کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ یہ کہ انہوں نے تمام معاہدات توڑ دیئے:

﴿أَلَا تَقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ﴾^②
 ”تم ان مشرکوں سے کیوں نہیں جنگ کرتے، جنہوں نے سارے معاہدات توڑ ڈالے!“

نیز ان کے متعلق کہا گیا ہے:

﴿فَاتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ﴾^③

”تم بھی ان معاہدوں کو پورا کرو۔“

اور ساتھ ہی یہ رعایت دی گئی کہ اگر کوئی مشرک تمہارے ہاں پناہ لینے کے لیے کہے، تو انکار نہ کرو۔ چونکہ یہ حدیث لوگوں کو بہ جبر مسلمان بنانے کیلئے جہاد کا حکم دیتی ہے اور قرآن کی تعلیم سے متصادم ہوتی ہے، اس لئے اس

کی صحت مشتبہ ہے۔“ (دوا سلام: ۲۹۴)

① التوبة: ۵

② التوبة: ۱۳

③ التوبة: ۴

جواب:

سورہ توبہ کی آیت اور حدیث دونوں کے الفاظ ملتے جلتے ہیں۔ آیت میں بھی غایتِ قتال تین چیزیں ذکر کی ہیں۔ توبہ (یعنی توحید اور رسالت کی شہادت) اور پابندیِ صوم و صلوٰۃ..... حدیث میں بھی یہی تین چیزیں ہیں۔ توحید و رسالت کا اقرار اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کی پابندی۔ اگر سورہ توبہ میں مراد خاص مشرکین ہیں، تو حدیث میں بھی ”الناس“ سے مراد وہی گروہ ہے۔ کیونکہ ”الف لام“ عہد کا ہے۔ اس جواب سے دوسرا اعتراض بھی اٹھ گیا۔

اعتراض:

دوم: آنحضرت ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اہل بحرین کی طرف جزیہ وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا،^① حالانکہ وہ لوگ غیر مسلم تھے اور اس حدیث کی رو سے ان کے خلاف جہاد کرنا چاہئے تھا۔

جواب:

لیکن چونکہ ”الف لام“ عہد کا ہے، لہذا اہل جزیہ اس سے خارج ہیں۔ اس طرح تیسرا اعتراض بھی اٹھ گیا۔

اعتراض:

سوم: حضور ﷺ نے جنگ خیبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

① صحیح البخاری: أبواب الجزية والموادعة، باب الجزية والموادعة مع أهل الذمة والحرب، رقم الحديث (۲۹۸۸)، صحیح مسلم: کتاب الزهد والرقائق، رقم الحديث (۲۹۶۱)، اس حدیث میں یہ ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح کو بحرین کی طرف جزیہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ واللہ اعلم

((ثم ادعهم إلى الإسلام لأن يهدي بك رجل واحد

خير لك من حمر النعم))^①

”پھر تم انہیں اسلام کی طرف دعوت دو اور یاد رکھو، ایک انسان کا ہدایت پا

جانا بھی تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔“

یہ نہیں فرمایا کہ غیر مسلم کو قتل کر ڈالو (جب تک مسلمان نہ ہو جائے، جنگ جاری رکھو)

جواب:

اس لئے حدیث خاص ہے۔ اس طرح چوتھا اعتراض بھی اٹھ گیا۔

اعتراض:

چہارم: ”موطا“ میں مذکور ہے: ایک اعرابی نے حضور ﷺ کے ہاتھ پر

بیعت کی اور پھر کہنے لگا: میں بیعت کو توڑتا ہوں، تین مرتبہ یہی بات

دہرائی۔ لیکن آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر

چلا گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: مدینہ ایک بھٹی کی طرح ہے، جہاں دعوات

باقی رہ جاتی ہے اور کثافت نکل جاتی ہے۔“^②

جواب:

کیونکہ یہ اعرابی مرتد نہیں ہوا، بلکہ ہجرت کو چھوڑ گیا اور بیعت کی واپسی

① صحیح البخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب دعاء النبی ﷺ إلى الإسلام، رقم الحدیث

(۲۷۸۳)، صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب،

رقم الحدیث (۲۴۰۶)

② صحیح البخاری: کتاب الأحکام، باب بیعة الأعراب، رقم الحدیث (۶۷۸۳)، صحیح

مسلم: کتاب الحج، باب المدینة تنفی خبیثها، رقم الحدیث (۱۳۸۳)، الموطا: ۸۸۶/۲

سے بھی اس کی غرض ہجرت پر بیعت مراد تھی، نہ اسلام پر۔ لہذا اعتراض باطل ہے۔

پس اس پر جو متفرع ہے کہ یہ حدیث ”من بدل دینہ فاقتلوه“^① (جو شخص اسلام چھوڑ دے اسے مار ڈالو) موضوع ہے۔ ”باطل ہوا! اس مسئلہ پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔



① صحیح البخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب لا یعذب بعذاب اللہ، رقم الحدیث

ستر ہواں باب

تقدیر

اس کا خلاصہ یہ ہے:

”تقدیر کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہاں کو ایک خاص نظام میں مربوط کر دیا ہے۔ علت و معلول، سبب و مسبب کا سلسلہ بنا دیا ہے۔ ہر زمانے میں کابلی کا نتیجہ ناکامی، محنت کا کامیابی، بد اعمالی کا رسوائی، جہالت کا ذلت، علم کا عزت، عبادت کا پاکیزگی اور بلند کردار کا رفعت رہا ہے۔ یہ نتائج کسی قوم، کسی عقیدے، کسی دعا، کسی منتر، کسی چلے، یا کسی عبادت کی وجہ سے نہ آج تک بدلے اور نہ آئندہ بدلیں گے۔ انسان اعمال کے انتخاب میں آزاد ہے۔ وہ چاہے تو شریف بنے یا شریر، محنتی یا کاہل۔ لیکن نتائج جھگٹنے پر مجبور ہے۔ یہی تقدیر ہے اور اسی کا نام قضائے الہی ہے۔

کافر ہے تو تقدیر پر کرتا ہے بھروسہ

مومن ہے تو آپ ہے تقدیر الہی!

یہ تھا تقدیر کا قرآنی تخیل۔ اب ذرا حدیثی تخیل ملاحظہ ہو:

حضور فرماتے ہیں کہ نطفہ رحم میں پہنچ کر چالیس دن کے بعد منجمد سا خون بن جاتا ہے، پھر وہ لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے کہ جاؤ اور اس لوتھڑے کے اعمال زندگی، رزق، موت اور سعادت و شقاوت کا فیصلہ ابھی لکھ لو۔ اور اس کے بعد اس

میں روح پھونکی جاتی ہے۔^①

اگر یہ فیصلہ پہلے ہی لکھ لیا جاتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیے اتنے پیا مبر کیوں بھیجے، بیشمار اقوام کو غرق کیوں کیا اور چور کے ہاتھ کیوں کاٹے؟

آج ساری دنیائے اسلام حدیثی تقدیر کے مہلک تصور میں گرفتار ہے۔ ہر جگہ پٹ رہی ہے اور پھر بھی اس دھن میں مست ہے کہ اللہ کی مرضی میں کیا کر سکتا ہوں“ (دو اسلام)

جواب: تقدیر کی حقیقت

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تقدیر سے جبر لازم نہیں آتا۔ کیونکہ تقدیر حقیقت میں سلسلہ علت و معلول اور سبب و مسبب کے مجموعہ کا نام ہے۔ پھر اس کے علم کا جو باری تعالیٰ کو حاصل ہے، پھر اس کی کتابت کا، پھر اس کی قدرت کی تاثیر کا۔ یعنی جہاں میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کیلئے ایک سبب موجود ہوتا ہے۔ جس کے پورا ہونے سے وہ شے وجود اختیار کرتی ہے۔ مثلاً انسان بیمار ہوتا ہے، تو بیماری (جو نظام جسم کے بگاڑ کا نام ہے) کسی سبب سے ہوتی ہے۔ جب وہ سبب اپنے اس نصاب پر پہنچ جاتا ہے، نظام جسمانی میں اس کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو، تو بیماری نمودار ہو جاتی ہے۔ اور یہ سبب بھی دراصل کسی اور شے سے آمووجود ہوتا ہے۔ پھر یہ شے بھی کسی اور وجہ سے۔ اس طرح یہ سلسلہ ناخوشی میں جاتا ہے اور انسان جو کام کرتا ہے، پہلے اس کو اس کا علم ہوتا ہے۔ پھر شوق، پھر ارادہ۔ اور ارادہ سے عصبی اور عضلاتی تحریک سے اعضاء میں حرکت ہوتی ہے۔ پس یہ فعل ارادہ سے، ارادہ شوق سے، شوق علم سے، اور علم سننے، دیکھنے اور غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور شوق

① صحیح البخاری: کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائكة، رقم الحدیث (۳۰۳۶)، صحیح مسلم: کتاب القدر، باب کیفیة خلق الادمی فی بطن امه، رقم الحدیث (۲۶۴۳)

کے پیدا کرنے میں کسی فعل کے منافع کے نصاب مخصوص کو دخل ہوتا ہے۔ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں معمولی منفعت سے شوق پیدا ہو جاتا ہے اور بعض معمولی منفعت سے متاثر نہیں ہوتے۔ یہی حال تمام اسباب کا ہے۔ یہ سلسلہ اسباب اور ان کے نتائج اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں۔ اور اس نے اپنے اس علم کو غیب میں منضبط کر دیا ہے اور پھر اس کے سارے نظام کا ربط اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے۔ اس ربط کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اس سارے جہاں کے وجود اور تغیر میں دخل ہے اور اسی کا نام ”تقدیر“ ہے۔

انسان واقعی خود مختار ہے، چاہے مومن بنے، چاہے کافر بنے۔ تقدیر صرف نتائج کا نام نہیں، بلکہ اسباب اور نتائج کے مجموعہ کا نام ہے۔ حدیث میں جو ذکر ہوا ہے، وہ بھی تقدیر کا ایک حصہ ہی ہے، اگر ادویہ کے افعال و خواص کا ذکر ہے، تو وہ بھی تقدیر کا حصہ ہے۔ اگر انسانی مزاج کی بحث ہے، تو وہ بھی تقدیر کی بحث ہے۔ عناصر کے افعال و خواص بھی تقدیر کی بحث کا جزو ہیں۔ پھر یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں کو قبل از وقت جانتا ہے، یہ بھی تقدیر میں داخل ہے اور اللہ کے سہارے سارا جہاں قائم ہے۔ یہ بھی اسی تقدیر کا ایک شعبہ ہے۔ جب سارا جہاں اس کے سہارے قائم ہے، تو اس کی قدرت کو اس میں دخل ہے۔ تقدیر ایسی چیز نہیں، جس کے ماننے پر انسان اپنے آپ کو مجبور پائے، بلکہ یہ ایک علم کا نام ہے، جب ہم کھجور کی ایک گٹھلی کو دیکھتے ہیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ گٹھلی اگر اس قسم کی زمین میں بوئی جائے، تو اتنے عرصہ میں اس میں فلاں فلاں تغیرات ہوں گے اور اتنی مدت کے بعد یہ پھل دے گی اور اس کا پھل میٹھا ہوگا یا کڑوا؟

گندم از گندم بروید جو ز جو

از مکافات عمل غافل مشوا

اسی طرح نطفہ بھی گٹھلی کی طرح اپنے اندر وہ تمام امور لئے ہوتا ہے، جن کا

ظہور ان کے نشوونما میں اخیر تک ہوتا رہتا ہے۔ یعنی یہ نطفہ یہ تغیرات اختیار کریگا اور فلاں وقت باہر آئے گا، پھر اس کا نشوونما^① اس منہج پر ہوگا، بچپن میں اس کا رنگ، اس کی شکل اور اس کے جذبات اس قسم کے ہونگے۔ سخی ہوگا، یا کنجوس، دلیر ہوگا، یا بزدل وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا علم بہت وسیع ہے۔ اس کے علم میں تمام امور جزئیہ آ جاتے ہیں۔ اگر فرشتہ اللہ تعالیٰ کے علم سے اس نطفہ کی حالت میں مدد لے، تو سب کچھ قبل از وقت معلوم کر سکتا ہے۔ مگر باوجود اس کے انسان مجبور نہیں ہوتا، کیونکہ علم معلوم کے تابع ہوتا ہے، اس کے لئے علت و سبب نہیں ہوتا۔ پس سلسلہ اسباب اپنی جگہ جیسے پہلے تھا، ویسے اب ہے۔ جیسے پہلے انسان مختار تھا، ویسے اب بھی مختار ہے۔ جو چاہے کرے، حدیث انسان کو سست نہیں کرتی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ بعض لوگ جہالت کی بناء پر سست ہو جاتے ہیں۔ اگر حقیقت حال کو دیکھیں، تو دلیر ہو جائیں۔ کیونکہ تقدیر سے قرآن نے یہ سبق دیا ہے کہ مصیبت اور موت سے انسان کو مفر نہیں۔ اس واسطے مصیبت اور موت کے اندیشہ سے اپنی کوشش ترک نہیں کرنی چاہئے۔ فرمایا:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي

كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لَكِيلًا

تَأْسُوا عَلَى مَافَاتِكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۝﴾^②

”جو مصیبت زمین میں یا تمہاری جان میں آئے، تو ہم نے اس کو اس

① آج جینیاتی سائنس نے یہ حقیقت دریافت کر لی ہے کہ ایک انسان کا Genetic code (جینیاتی رمز) مختلف ہوتا ہے جس پر اس کی خصوصیات درج ہوتی ہیں اور اس کے مطابق اس کے جسم کی نشوونما ہوتی ہے جس کے لیے DNA ٹیٹ کروایا جاتا ہے (اگر یہ اضافہ مناسب سمجھیں تو لگائیں؟)

کے ہونے سے پہلے لکھ دیا ہے اور یہ اللہ پر کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ اس لئے کہ تم سے کوئی شے فوت ہو جائے، تو غم نہ کرو اور اگر کچھ مل جائے، تو زیادہ خوش نہ ہو جاؤ۔“



اٹھارہواں باب

متضاد احادیث

اس باب میں بخاری کی ایک حدیث لکھی ہے، جس سے عورت کے مرتبہ پر استدلال کیا ہے۔ مگر افسوس کہ ترجمہ پر نظر ثانی نہیں کی۔
پہلی حدیث:

چنانچہ لکھتے ہیں:
”آنحضرت (ﷺ) نے دورانِ تقریر فرمایا کہ جو تین بچے پیدا کرے گی، اللہ اسے نارِ جہنم سے بچالے گا۔ ایک عورت نے کہا: دو بچوں والی؟ فرمایا: دو والی بھی جنت میں جائے گی۔ (بخاری: ۲۰/۱)“
بالکل درست فرمایا تھا حضور نے، سارا قرآن شاہد ہے کہ انسانی خدمت بہت بڑے اجر کی مستحق ہے۔ تو کیا بچوں کی تولید و تربیت انسانی خدمت نہیں؟ (دو اسلام: ۳۰۵)

جواب:

اس حدیث کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”جو عورت تین بچے اگلے جہاں میں بھیج چکی

① صحیح البخاری: کتاب العلم، باب هل يجعل للنساء يوم على حدة في العلم، رقم الحديث (۱۰۱)، صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ والاداب، باب فضل من يموت له ولد فيحسنه، رقم الحديث (۲۶۳۳) حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ”ما منكن امرأة تقدم ثلاثة من ولدها الا كان لها حجابا من النار.....“ برق صاحب نے اس حدیث کا ترجمہ غلط کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کو حدیث میں تعارض محسوس ہو رہا ہے، مؤلف رحمہ اللہ نے اس کی تفصیل آگے بیان کر دی ہے۔

ہو، یعنی مر گئے، تو وہ بچے اس کیلئے جہنم سے حجاب بن جائیں گے۔“ چنانچہ یہی روایت (۱۶۷/۱) میں ہے۔ جس کے لفظ یہ ہیں:

((أَيْمًا أَمْرًا مَاتَ لَهَا ثَلَاثَةٌ مِنَ الْوَلَدِ كَانُوا لَهَا حِجَابًا مِنَ النَّارِ))^①

”جس عورت کے تین بچے مر جائیں، تو وہ اس کیلئے آگ سے حجاب ہو جاتے ہیں۔“

مگر مصنف نے تولید کے معنی سمجھ لئے ہیں اور اس سے عورت اور ماں کی فضیلت تولید کے اعتبار سے سمجھی ہے!

دوسری حدیث:

پھر اس کے بعد یہ حدیث ذکر کی ہے:

((الْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ أُمَّهَاتِكُمْ))^②

① صحیح البخاری: کتاب الجنائز، باب فضل من مات له ولد فاحسب، رقم

الحدیث (۱۱۹۲)، اس سے ما قبل حدیث کے الفاظ یہ ہیں..... یتوفى له ثلاث لم يلفوا الجنث.....“ جو صراحت دلائی کرتے ہیں کہ عورت کی یہ فضیلت اس کے نابالغ بچوں کی وفات کی

وجہ سے ہے، نہ کہ ان بچوں کی پیدائش کی وجہ سے!

② ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ دیکھیں: الکامل لابن عدي ۳۴۷/۶ (۱۸۲۹)،

المقاصد الحسنة: ۲۸۷، كشف الخفاء: ۶۱/۲ (۱-۷۸)، السلسلة الضعيفة: ۵۹/۲،

(۵۹۳) لیکن انہی معنوں میں رسول اکرم ﷺ سے یہ حدیث ثابت ہے، دیکھیں: سنن النسائي:

کتاب الجہاد، باب الرخصة في التخلف لمن له والدة، رقم الحدیث (۳۱۰۴)، سنن ابن

ماجه: کتاب الجہاد، باب الرجل يغزو وله أبوان، رقم الحدیث (۲۷۸۱)، مسند

أحمد: ۴۲۹/۳، المستدرک: ۱۱۴/۲، سنن البيهقي: ۲۶/۹، شعب الإيمان: ۱۷۸/۶،

المعجم الكبير: ۲۸۹/۲، الجامع للخطيب: ۲۳۱/۲، الأحاد والمثاني (۵۸/۳)

”جنت تمہاری ماؤں کے پاؤں تلے ہے۔“

اس کے بعد ایک اور حدیث لکھی ہے، جو ان کے خیال میں پہلی حدیث کے متعارض ہے، وہ حدیث یہ ہے:

① ((أریت النار فإذا أكثر أهلها النساء))

”آنحضرت فرماتے ہیں کہ میں نے جہنم کو دیکھا، تو اس میں اکثر آبادی عورتوں کی نظر آئی۔“

یعنی ایک طرف تو دو بچوں والی ماؤں کو جنتی بنایا جا رہا ہے، بلکہ ساری جنت ماں کے قدموں میں پھینکی جا رہی ہے اور دوسری طرف اس کے جہنمی ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ (دوا اسلام: ۳۰۸)

جواب:

ماں کی خدمت میں بچے کو جنت ملتی ہے۔ اگر ماں کے عمل اچھے نہ ہوں، تو اس صورت میں ماں جنت میں نہیں جاسکتی۔ اور اگر کسی مسلمان عورت کے تین یا دو بچے مر جائیں اور وہ صبر کرے، تو جنتی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو عورت بدزبان اور خاوند کی نافرمان ہو، وہ بھی جنت میں چلی جائے!

جس صورت میں یہ ذکر کیا ہے کہ میں نے آگ میں عورتوں کو زیادہ دیکھا ہے، اس میں اس کی وجہ بھی بیان کی ہے کہ اسکی وجہ خاوند کی ناشکری اور بدزبانی ہے۔ جو عورت صابرہ ہوگی، لامحالہ وہ بدزبان نہیں ہو سکتی، نہ خاوند کی نافرمان ہو سکتی ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمیشہ جہنم میں اکثر عورتیں ہی ہوں گی۔ بلکہ یہ آپ ﷺ نے اپنا کشف بتایا کہ مجھے ایسا نظر آیا اور اس کی وجہ بھی بتائی، یعنی یہ

① صحیح البخاری: کتاب الایمان، باب کفران العشر و کفر دون کفر، رقم الحدیث

(۲۹)، صحیح مسلم: کتاب العیدین، رقم الحدیث (۸۸۴)

بات ان کیلئے جہنم کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر دوسرے اسباب اس کے خلاف جمع ہو جائیں، تو جنت میں جاسکتی ہیں، بلکہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں سے عورتیں دوگنی جنت میں ہوں گی۔

آگے ایک حدیث ذکر کی ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ
 ”اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف بلائے اور وہ انکار کر دے
 اور شوہر ناراض ہو کر رات گزارے، تو اس عورت پر فرشتے صبح تک لعنت
 بھیجتے رہتے ہیں۔“^①

اس حدیث کے بعد فضول باتیں لکھی ہیں، لب و لہجہ، طرز کلام، بالکل سوچا نہ ہو
 گیا ہے۔ قرآن مجید سے بھی اس حدیث کی تائید ہوتی ہے:
 ﴿فَالصَّالِحَاتُ قُنَّتْ.....﴾^②

”نیک بیبیاں وہ ہیں، جو خاوند کی فرمانبردار ہوں۔“

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾^③

”مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔“

حاکم یا امیر کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

تیسری حدیث:

اس کے بعد دو متعارض حدیثیں لکھی ہیں:

① صحیح البخاری: کتاب بدء الخلق، باب إذا قال أحدكم آمین.....، رقم الحدیث

(۳۰۶۵)، صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب تحریم امتناعها من فراش زوجها، رقم

الحدیث (۱۴۳۶)

② النساء: ۳۴

③ مصدر سابق

درخت کاٹنا:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یزید بن ابوسفیان کو ایک فوج کا سالار بنا کر شام کی طرف روانہ کیا، تو ساتھ مندرجہ ذیل ہدایات بھی دیں:

کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کوئی پھل والا درخت نہ کاٹنا ^①

لیکن بخاری میں مذکور ہے کہ حضور نے بنی نضیر کے کچھ درخت جلا دیئے اور کچھ کاٹ کر رکھ دیئے۔ (بخاری: ۳۱/۲) ^② اگر حضور نے ایسا کیا ہوتا، تو حضرت صدیق آپ کی سنت کو ضرور زندہ رکھتے۔ (دو اسلام: ۳۱۱)

جواب:

ضرورت کے وقت درختوں میں دشمن پناہ لیں، تو ایسی حالت میں درختوں کا کاٹنا جائز ہے، ویسے منع ہے۔ یہ حکم قرآن مجید میں ہے:

﴿ مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ﴾ ^③

”اگر (مصلحت سمجھ کر) تم کوئی درخت کاٹو یا اس کو اسی طرح جڑوں پر کھڑا رہنے دو (اگر مناسب ہو) تو اس میں اللہ کی اجازت ہے اور فاسقوں کی رسوائی ہے۔“

اعتراض کرتے وقت قرآن بھی نہیں دیکھتے، یا جانتے ہی نہیں!

① الموطا: ۴۴۷/۲ (۹۶۵)، سنن البیہقی: ۸۹/۹-۹۰

② صحیح البخاری: کتاب المزارعة، باب قطع الشجر والنخل، رقم الحدیث (۲۲۰۱)؛

صحیح مسلم: کتاب الجہاد، باب جواز قطع أشجار الکفار و تحرقها، رقم الحدیث (۴۱۷۴۶)؛

③ الحشر: ۴

چوتھی حدیث: آگ سے عذاب دینا:

”ایک حدیث میں آگ کے عذاب کی ممانعت ہے اور اس کی وجہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمائی ہے کہ ”آگ سے عذاب دینا صرف اللہ کا کام ہے“ (بخاری) ^①

اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب ایک جماعت مسلمان ہو کر آنحضرت ﷺ کی اونٹنیوں کو چرا کر لے گئے اور چرواہے کو قتل کر گئے، تو آپ نے انہیں مندرجہ ذیل سزائیں دیں:

۱ پہلے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے۔

۲ پھر لوہے کی سلاخیں گرم کر کے ان کی آنکھوں میں پھیریں۔

۳ اس کے بعد گرم ریت پر پھینک دیا۔ وہ تڑپ تڑپ کر پانی مانگتے رہے، لیکن کسی نے نہ دیا اور ہلاک ہو گئے۔ ^② یہ بے رحمی للعالمین کی شان سے بعید ہے۔ ہاں باغیوں کے لئے چار سزائیں ہیں، قتل کر دیئے جائیں، یا سولی دیئے جائیں یا ان کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹ دیا جائے یا جلا وطن کر دیئے جائیں، لیکن ان چار سزاؤں میں سے صرف ایک کی اجازت ہے۔ اللہ کا ارشاد واضح ہے کہ یا یہ سزا دو اور یا وہ۔ خود حضور ﷺ کا ارشاد موجود ہے کہ ”آگ سے عذاب صرف اللہ کا کام ہے۔“ (دو اسلام: ۳۱۳)

الجواب:

جس وقت یہ لوگ پکڑ کر لائے گئے، یہ آیت نہیں اتری تھی۔ پھر آیت میں

① صحیح البخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب التوادیع، رقم الحدیث (۲۷۹۵)

② صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب أحوال الإبل والدواب والغنم ومراضها، رقم الحدیث

(۲۳۱)، صحیح مسلم: کتاب القسامۃ، باب حکم المخارین والمرتدین، رقم الحدیث (۱۶۷۱)

”او“ کا لفظ ہے،^① جس کا معنی ”اختیار“ کا ہے اور یہ لفظ کبھی ایسی جگہ بھی بولا جاتا ہے، جہاں دونوں کام جائز ہوتے ہیں اور ایک پر اکتفا بھی جائز ہوتا ہے:

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ﴾^②

”یہ لوگ یا تو فرشتوں کی آمد کے منتظر ہیں یا تیرے رب کے آنے کے اور یا تیرے رب کے بعض نشانات کے انتظار میں ہیں۔“

اب ظاہر ہے کہ فرشتے، رب اور رب تعالیٰ سبھی آ سکتے ہیں!

﴿لَا تَطْعَمُ مِنْهُمْ أَنْمًا أَوْ كَفُورًا﴾^③

”نہ کہا مان گناہگار یا ناشکرے کا۔“

یعنی نہ اس کا اور نہ اس کا۔ یہ مطلب نہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا حکم نہ مانو اور دوسرے کا مان لو!

باقی رہا آگ کا عذاب، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے چرواہے کو اسی طرح مارا تھا^④ لہذا بموجب نص قرآن:

① مندرجہ ذیل آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿إِنَّمَا حِزَابُ الَّذِينَ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَ يُسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ حِزْبٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (المائدة: ۳۳)

② الأنعام: ۱۵۹

③ الإنسان: ۲۴

④ صحیح مسلم: کتاب القسامۃ، باب حکم المحاربین والمرتدین، رقم الحدیث (۵۳۶۰): ولفظه: ”إِنَّمَا سَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ أَعْيُنَ أَوْلَئِكَ لِأَنَّهُمْ سَعَلُوا أَعْيُنَ الرِّعَاءِ“ مزید برآں برق صاحب کی پیش کردہ پہلی حدیث میں آگ سے جلانے کی ممانعت ہے اور مذکورہ بالا حدیث میں تو صرف بطور قصاص آنکھوں میں گرم سلائی پھیرنے کا ذکر ہے، مزید برآں سعید بن مسیب

﴿کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ﴾^①

مقتول کا بدلہ لینے میں تم پر مساوات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

آگ کا عذاب ابتداء منع ہے۔ یہ نہیں کہ صورت قصاص میں بھی منع ہو۔^②
آج کل جنگ میں آتشیں اسلحہ ہی استعمال ہوتا ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق تو آتشیں اسلحہ سے بالکل لڑائی نہیں کرنی چاہئے، خواہ دشمن ابتداء بھی کرے!
پانچویں حدیث: کیا گھوڑا منحوس ہے؟

اس ضمن میں دو حدیثوں میں تعارض اس طرح بیان کیا ہے:

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت کا گھوڑا تھا، جس کا نام ”لحیف“ تھا۔^③

← کی ”مرسل“ روایت میں ہے کہ ان کو پیاس کی حالت میں پانی بھی اسی لیے فراہم نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ یہ بھی ان کے اسی فعل شفع کا بدلہ تھا اور انھوں نے بھی چرواہوں کو پیاسا مارا تھا۔ دیکھیں: سنن النسائي (۴۰۳۶)

① البقرة: ۱۷۸

② قرآن مجید کی آیات بینات اسی بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بدلے کی صورت میں مساوات بری چیز نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ (البقرة: ۱۹۴) نیز فرمایا: ﴿الْعَيْنُ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفُ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنُ بِالْأُذُنِ وَالسِّنُّ بِالسِّنِّ وَالْحَرْبُ قِصَاصٌ﴾ (المائد: ۴۵) مزید برآں اللہ تعالیٰ نے یہ تاکید بھی دیا کہ سزا کی تحفیض میں تمہارے دلوں میں کسی قسم کی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہو، فرمایا: ﴿وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (النور: ۲) یعنی زانی مرد اور عورت پر سزا نافذ کرتے وقت تم کو ان دونوں پر کسی قسم کا رحم نہیں آنا چاہیے، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ لہذا بقیہ انسانوں کے ساتھ رحم و عدل کا تقاضا یہی ہے کہ مجرم کو سزا کے وقت کسی قسم کی ڈھیل نہ دی جائے، کیونکہ اس طرح بقیہ افراد کو معاشرے میں ظلم و ستم ڈھانے کی شہہ ملتی ہے۔

③ صحيح البخاري: كتاب الجهاد والمير، باب اسم الفرس والحصار، رقم الحديث (۲۷۰۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا منحوس نہیں ہوتا، اگر منحوس ہوتا، تو یہ نام نہ رکھتے۔
 دوسری حدیث میں ہے: تین چیزیں منحوس ہیں: گھوڑا، عورت، مکان۔^②

جواب:

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ تمام گھوڑے منحوس ہیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ نحوست ان چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ نہ سب عورتیں اور نہ سب مکان۔ ہاں ان میں سے بعض منحوس ہوتے ہیں۔ پھر منحوس ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی وجہ سے انسان کے حالات (غنی، فقر یا صحت و بیماری) میں کچھ تبدیلی ہوتی ہے۔ گھوڑا اگر ایسا ہو کہ سوار نہ ہونے دے، عورت نیک چلن نہ ہو، مکان کی آب و ہوا خراب یا کسی ارواح کی وجہ سے خطرناک ہو، تو یہ اس کی نحوست ہے۔^③

چھٹی حدیث: نماز میں بھولنے کی وجہ

”ابو ہریرہؓ، حضور سے روایت کرتے ہیں کہ جب نماز کیلئے اذان دی جاتی ہے، تو شیطان بھاگ نکلتا ہے اور اذان کے بعد واپس آ جاتا ہے۔ جب نمازی نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے، تو وہ پھر بھاگ جاتا ہے اور پھر نماز شروع ہونے کے بعد واپس آ کر نمازی پر مسلط ہو جاتا ہے، اسے بھولی ہوئی باتیں یاد دلانا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ نمازی بھول جاتا ہے اور اسے یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں؟ (بخاری)^④

① صحیح البخاری: کتاب الجہاد والسير، باب ما یذکر من شؤم الفرس، رقم الحدیث

(۲۷۰۳)

② مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباری: ۶/۶۰

③ صحیح البخاری: کتاب الأذان، باب فضل التأذین، رقم الحدیث (۵۸۳) صحیح مسلم:

کتاب الصلاة، باب فضل الأذان و هرب الشیطان عند سماعه، رقم الحدیث (۵۸۲)

شیطان کا اذان کی عربی عبارت سے گھبرانا، لیکن نماز کی لمبی چوڑی دعاؤں کی پرواہ نہ کرنا اور نمازی پر سوار ہونا، کیسی منطق ہے۔ اگر نماز میں بھول صرف شیطانی تسلط کی وجہ سے ہوتی ہے، تو آنحضرت کیوں بھول جاتے تھے؟“ (دو

اسلام: ۳۱۵)

جواب:

اس عبارت میں مصنف نے دو اعتراض کئے ہیں:

① اذان سے کیوں بھاگتا ہے اور نماز کی دعاؤں سے کیوں نہیں بھاگتا؟

② آنحضرت ﷺ کیوں بھولے؟

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ شیطان بھاگتا اس لئے نہیں کہ وہ اذان سے مرعوب ہو جاتا ہے، بلکہ وہ توحید کے اعلان کو سننا گوارا نہیں کرتا۔ دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے وہ اذان سے مرعوب ہو جاتا ہو۔ اس صورت میں مصنف کا یہ اعتراض پھر سامنے آتا ہے کہ وہ نماز کی دعاؤں سے کیوں نہیں بھاگتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق تو شیطانی سرشت اور کلمات کی تاثیر کے ساتھ ہے، اور شیطانی وسوسہ سے نسیان کا ہو جانا، قرآن میں بھی مذکور ہے:

﴿وَمَا أَنْسَانِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَن أذْكُرَهُ﴾ ①

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَأَمَّا يَنْسِينِكَ الشَّيْطَانُ﴾ ②

”اگر تجھے شیطان بھلا دے۔“

① الکہف: ۶۳

② الأنعام: ۶۸

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ شیطانی وسوسہ سے بھی نسیان ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں کہیں نسیان ہو، شیطان ہی کی جانب سے ہوگا۔
ساتویں حدیث:

اس کے بعد اسی قسم کی اور حدیث سناتے ہیں:
”آنحضرت کے سامنے کسی نے کہا کہ فلاں شخص دن چڑھے تک سویا رہا، آپ نے فرمایا کہ شیطان اس کے کانوں میں موت گیا تھا، اس لئے سویا رہا۔“^①
اس حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ”ایک دفعہ آنحضرت بھی سو گئے تھے“^②
(دوامِ اسلام)

جواب:

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ وہ شخص فرض نماز پڑھے بغیر سو گیا تھا۔ جیسے فتح الباری میں ہے^③ سفیان کی روایت میں ہے کہ یہ شخص فرضی نماز سے سو گیا تھا۔^④

① صحیح البخاری: أبواب التهجد، باب إذا نام ولم يصل بال الشيطان في أذنه، رقم الحديث (۱۰۹۳)، صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرين، باب ما روي فيمن نام الليل أجمع حتى أصبح، رقم الحديث (۷۷۴)، برق صاحب نے اس حدیث کے ترجمہ میں گڑبڑ کی ہے، جس کی وضاحت مؤلف رحمہ اللہ نے کر دی ہے۔ جزاء الله أحسن الجزاء

② صحیح البخاری: کتاب مواقيت الصلاة، باب الأذان بعد ذهاب الوقت، رقم الحديث (۵۷۰)

③ فتح الباری: ۲۸/۳

④ صحیح ابن حبان: ۳۰۲/۶ (۲۵۶۲)، المعجم الأوسط: ۱۵۱/۸، یہ الفاظ سفیان ثوری کی مرفوع حدیث کے نہیں، بلکہ حدیث کے آخر میں سفیان ثوری کا اپنا قول ہے۔ امام ابن حبان نے اس حدیث کو تنجید پر محمول کیا ہے۔ مزید برآں امام بخاری کا اسے ”أبواب التهجد“ میں ذکر کرنا اور

یعنی عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ بخاری میں یہ لفظ ہیں:

”ما زال نائما حتی أصبح“

”صبح تک سویا رہا۔“

آنحضرت ﷺ نے تو عشاء کی نماز پڑھی تھی۔ صبح کی نماز سے غفلت ہو گئی تھی۔ اس جگہ عشاء کی نماز مراد ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی حالت اور اس شخص کی حالت میں فرق ہے کہ وہ شخص ایسے وقت میں سویا جس وقت سونا ممنوع تھا۔ عشاء کی نماز عداً چھوڑ دی۔ آنحضرت ﷺ اس وقت سوئے، جس وقت سونے کی اجازت ہے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بطور نگہبان مقرر کیا، مگر سب پر نیند ایسی غالب آئی کہ دن چڑھے اٹھے۔ یہ سونا اختیاری معاملہ نہ تھا۔ مصنف نے حدیث کا ترجمہ ایسا کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص بھی دن چڑھے اٹھا تھا۔ حالانکہ حدیث میں ہے کہ ”وہ صبح تک سویا رہا۔“

آٹھویں حدیث: تعظیم قبلہ

”حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کے لیے بیٹھے، تو وہ قبلہ کی طرف منہ نہ کرے اور نہ پیٹھے۔“ (بخاری) ①

صحیح مسلم میں امام نووی کی تبویب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں: ”ویراد به صلاة الليل أو المكتوبة“ (فتح الباری: ۲۸/۳)، امام نسائی نے اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے: ”باب الترغیب فی قیام اللیل“ رقم الحدیث (۱۶۰۸)، اسی طرح امام ابن ماجہ نے ”باب کراهة ترك قیام اللیل وإن کان تطوعاً لأفرضاً“ رقم الحدیث (۱۱۳۰) اور امام ابن ابی شیبہ نے ”من کان یأمر بقیام اللیل“ (۶۶۱۲) باب قائم کیا ہے، لہذا محدثین کرام کی تبویب سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ اس نماز سے مراد رات کی نفلی نماز ہے۔ واللہ اعلم۔

① صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب لا تستقبل القبلة بغائط أو بول إلا عند البناء جدار أو نحوه، رقم الحدیث (۱۴۴)، صحیح مسلم: کتاب الطہارۃ، باب الاستطابة، رقم الحدیث (۲۶۴)

اور یہ بھی ملاحظہ ہو: عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میں حضرت حصہؓ کے پاس والے مکان کی چھت پر چڑھا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور ﷺ قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے قضائے حاجت فرما رہے ہیں۔^① کس کو صحیح سمجھیں؟ (دوا اسلام)

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی حدیث کے لفظ یہ ہیں: ”جب تم میں سے کوئی شخص ”غائط“ (جنگل)^② کو جائے، تو وہ قبلہ کی طرف نہ منہ کرے نہ پیٹھ۔“ اس حدیث کا تعلق میدان کے ساتھ ہے اور دوسری حدیث کا تعلق عمارت کے ساتھ ہے۔^③

① صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب التبرز فی البیوت، رقم الحدیث (۱۴۷)

② دیکھیں: النهاية لابن الأثیر: ۷۴۴/۳، القاموس المحیط: ۶۲۷

③ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ پیشاب کی حالت میں اس صورت میں استقبال قبلہ سے منع کیا گیا ہے، جب درمیان میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور انسان کھلے میدان میں پیشاب کر رہا ہو، لیکن جب آدمی اور قبلہ کے درمیان کوئی رکاوٹ ہو، تو اس صورت میں ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (سنن أبی داود، حدیث: ۱۱)

اسی طرح امام ابن خزیمہ دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ”باب ذکر الخبر المفسر للخبرین اللذین ذکر تمہما فی البایین المتقدمین والدلیل علی أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم إنما نهی عن استقبال القبلة واستدبارها عن الغائط والبول فی الصحاری والمواضع اللواتی لا سترۃ فیہا وأن الرخصة فی ذلك فی الکنف والمواضع التی فیہا بین المتغوط والبالل و بین القبلة حائط أو سترۃ“ (صحیح ابن خزیمہ: ۳۵/۱)

اسی طرح امام ابن حبان تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ”ذكر الخبر الندل علی أن الزجر عن استقبال القبلة واستدبارها بالغائط والبول إنما زجر عن ذلك فی الصحاری دون الکنف والمواضع المستورة“ (صحیح ابن حبان: ۲۷۹/۴) نیز امام ابن حبانؒ نے فرمایا ہے: ”باب لا تستقبل القبلة بغائط أو بول إلا عند البناء جدار أو نحوه“ (صحیح البخاری: ۶۶/۱)

دوسرا جواب یہ ہے کہ پہلی حدیث قوی ہے اور دوسری فعلی، قول و فعل میں اگر تعارض ہو، تو اس کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ فعل آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص ہو اور باقی قول پر عمل کریں۔^①

تیسرا جواب یہ ہے کہ سب احادیث کو جمع کر کے مطلب نکالا جائے۔ پس پہلی حدیث عام ہے اور دوسری اس کی مخصوص ہے۔ پس عمارت کی صورت اس پہلی حدیث سے مستثنا ہوگی۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ پہلی حدیث میں نہی ”تزیہہ“ کے لیے ہے۔ پس فعل اس لئے ہے کہ اس نہی کا مرتبہ معلوم ہو جائے۔

نویں حدیث: کیا احرام میں شکار کا گوشت کھانا جائز ہے؟

”صعب کہتے ہیں کہ میں نے حضور کے پاس ایک گور خر بھیجا، آپ نے لوٹا دیا اور فرمایا کہ میں نے احرام باندھا ہوا ہے، ورنہ ضرور لے لیتا۔“^②

اب دیکھئے یہ حدیث:

”سال حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ابو قتادہ بھی تھا، جس کے بغیر

① رسول اکرم ﷺ کا ہر قول و فعل امت محمدیہ کے لیے اسوہ اور قدوہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب: ۲۱) لہذا نبی اکرم ﷺ کا کوئی بھی عمل اس وقت تک مخصوص نہیں، جب تک اس کی کوئی دلیل یا قرینہ نہ ہو، ورنہ وہ عمل امت کے لیے بھی مشروع ہے، کیونکہ خصائص رسول ﷺ کسی دلیل کی بنیاد پر تسلیم کیے جاتے ہیں، جب تک کوئی صریح دلیل نہ ہو، اس وقت تک کسی عمل کو آپ ﷺ کا خاصہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ واللہ اعلم بالصواب

② صحیح البخاری: کتاب الہبة وفضلها، باب قبول ہدیۃ الصيد، رقم الحدیث (۲۴۳۴)،

صحیح مسلم: کتاب الحج، باب تحریم الصيد للمحرم رقم الحدیث (۱۱۹۳)

باقی سب نے احرام باندھا ہوا تھا۔ اثناء سفر میں ایک گورخر نظر آ گیا۔ پھر ابو قتادہ سوار ہو کر اس کے پیچھے دوڑ پڑا اور آخر اسے برچھے سے مار لیا۔ ذبح کر کے پکایا اور صحابہ کو پیش کیا۔ صحابہ نے حضور ﷺ سے پوچھا: کیا ہم کھالیں؟ فرمایا: کھالو! یہ حلال ہے۔^①

جواب:

اصل مسئلہ اس طرح ہے کہ حلال اگر اپنے لئے شکار کرے، تو محرم کھا سکتا ہے، اگر محرم کیلئے یا محرم کو زندہ شکار پکڑ کر دے، تو ہدیہ قبول نہ کرے، حدیث کے لفظ اس طرح ہیں:

”صيد البر لکم حلال ما لم تصيدوه أو یصد لکم“^②
 ”جنگلی شکار تمہارے لئے حلال ہے، بشرطیکہ تم خود شکار نہ کرو، یا تمہارے لئے نہ کیا جائے۔“

① صحیح البخاری: کتاب جزاء الصيد، باب إذا صاد الحلال فأهدى للمحرم الصيد أكله، رقم الحديث (۱۷۲۵)، صحیح مسلم: کتاب الحج، باب تحريم الصيد للمحرم، رقم الحديث (۱۱۹۷)

② سنن أبي داود: کتاب المناسك، باب لحم الصيد للمحرم، رقم الحديث: (۱۸۵۱) سنن الترمذی: أبواب الحج باب ما جاء في أكل الصيد للمحرم رقم الحديث: (۸۴۶) سنن النسائی: کتاب مناسك الحج باب إذا أشار المحرم إلى الصيد فقتله الحلال، رقم الحديث (۲۸۲۷)، مسند أحمد: ۳/۳۸۲، ابن خزيمة: ۴/۱۸۰، ابن حبان: ۹/۲۸۳، سنن الدارقطني: ۲/۲۹۰، المستدرک: ۱/۶۲۱، سنن البيهقي: ۵/۱۹۰، شرح معانی الآثار: ۲/۱۷۱، المتقى لابن الجارود: ۱۱۵، یہ حدیث ”ضعیف“ ہے۔ اس کی سند میں مطلب بن عبد اللہ بن حنطب اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے۔ مطلب کا حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: التلخیص الحییر: ۲/۲۷۶۔

پس پہلی صورت میں اس شخص نے آنحضرت ﷺ کے آگے چونکہ زندہ گورخر پیش کیا، اس واسطے آپ ﷺ نے سمجھا یہ میرے لئے لایا ہے۔ اسی لئے بعد میں بھی جب اس نے اس کا ایک عضو پیش کیا، تو قبول نہ کیا۔ (فتح الباری)^①

اور دوسری صورت میں اس نے خود شکار کیا، پھر خود ہی ذبح بھی کیا، پھر پکا کر آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، تو آپ ﷺ نے اس سے لیکر کھا لیا۔

دسویں حدیث: کیا احرام میں خوشبو لگانا جائز ہے؟

”حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ احرام میں ایسے کپڑے مت پہنو، جس پر زعفران یا کوئی اور خوشبو لگائی گئی ہو۔“ (مسلم)^②

”ایک آدمی خوشبودار جبہ پہنے آپ کی خدمت میں آیا، آپ ﷺ نے فرمایا: جبہ دھو ڈالو، خوشبو کا اثر مٹا دو اور پھر عمرہ کرو۔“ (مسلم)^③

قولِ جمہور یہی ہے کہ خوشبو حرام ہے، لیکن ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ احرام باندھتے اور توڑتے وقت میں حضور پر خوشبو چھڑکا کرتی

① فتح الباری: ۳۲/۴

② صحیح البخاری: کتاب الحج، باب ما لا یلبس المحرم من الثیاب، رقم الحدیث (۱۴۶۸)، صحیح مسلم: کتاب الحج، باب ما یباح للمحرم بحج أو عمره، رقم الحدیث (۱۱۷۷)

③ صحیح البخاری: کتاب الحج، باب غسل الخلق ثلاث مرات من الثیاب، رقم الحدیث: (۱۴۶۳)، صحیح مسلم: کتاب الحج، باب ما یباح للمحرم بحج أو عمره و ما لا یباح و بیان تحریم الطیب علیہ، رقم الحدیث (۱۱۸۰)، اس حدیث میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آدمی کو تین کاموں کا حکم دیا: (۱) اپنے آپ سے خوشبو کو تین مرتبہ دھو ڈالو۔ (۲) اپنے جسم سے جبہ کو اتار پھینکو۔ (۳) عمرہ کے اندر اسی طرح کرو، جیسا تم حج میں کرتے ہو۔ لہذا براق صاحب کا کہنا ”پھر عمرہ کرو“ درست نہیں اور نہ ہی حدیث میں کوئی ایسا لفظ ہے، جس کا یہ معنی ہو!

تھی۔“ (مسلم) ^①

”اس خوشبو میں مشک (کستوری) ڈال دیا کرتی تھی اور احرام کی حالت میں اس تیل کی چمک حضور کے بالوں میں دور سے آتی تھی۔“ (مسلم) ^②

جواب:

احرام باندھنے کے وقت خوشبو لگانی جمہور کے نزدیک جائز ہے اور بدن میں لگانے کے بعد اس کا اثر احرام کے بعد باقی رہے، تو کوئی حرج نہیں:

”بل الصواب ما قاله الجمهور إن الطيب مستحب للإحرام“
(نووی شرح مسلم: ۳۷۸/۱)

”جمہور کا مذہب یہی ہے کہ خوشبو احرام کیلئے جائز ہے اور یہی ٹھیک ہے۔“ پہلی حدیث میں زعفران لگانے سے روکا گیا ہے۔ زعفران ویسے بھی مردوں کیلئے بطور خوشبو استعمال کرنا منع ہے اور جس کپڑے کو لگا ہو، اس کو محرم نہیں پہن سکتا۔ اور بدن پر اگر احرام کے وقت خوشبو لگائے اور احرام کے بعد باقی رہے، تو کوئی حرج نہیں۔ کپڑے اور بدن کا فرق ہے۔ زعفران اور غیر زعفران کا بھی فرق ہے۔ پس دونوں حدیثیں ٹھیک ہیں۔ احرام کے وقت خوشبو لگانا جائز ہے اور جس کپڑے کو زعفران لگا ہوا ہو، اس کا پہننا محرم کو منع ہے۔ اور احرام باندھ کر خوشبو لگانا مطلقاً ممنوع ہے۔

① صحیح البخاری: کتاب الحج، باب الطیب عند الإحرام و ما یلبس إذا أراد أن یحرم و یترجل و یدھن ، رقم الحدیث (۱۴۶۵)، صحیح مسلم کتاب الحج، باب الطیب للمحرم عند الإحرام، رقم الحدیث (۱۱۸۹)

② صحیح مسلم: کتاب الحج، باب الطیب للمحرم عند الإحرام ، رقم الحدیث (۱۱۹۰)،

گیارہویں حدیث: کیا رسول اللہ نے اللہ کو دیکھا تھا؟

”ابو ذر رضی اللہ عنہ نے حضور سے پوچھا کہ کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ فرمایا:

ہاں میں نے دیکھا تھا، وہ ایک نور ہے۔“ (مسلم)

لیکن یہی ابو ذر رضی اللہ عنہ اگلی حدیث میں کہتے ہیں: میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ کو دیکھا تھا؟ فرمایا:

”ہو نور انیٰ اراہ“^①

”وہ نور ہے، میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟“

جواب:

پہلی حدیث کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ اصل لفظ یہ ہیں:

”قال أبو ذر: قد سألتہ فقال رأیت نوراً“^②

”ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ نے رب کو دیکھا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے نور دیکھا ہے“ ”یعنی اللہ کو نہیں دیکھا، بلکہ نور کو دیکھا ہے۔ جیسا اس کے بعد کی روایت میں ہے:

”حجابہ النور“^③

”اللہ کا حجاب نور ہے۔“

امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

① صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب فی قوله علیہ السلام ”نور انیٰ اراہ“ و فی قوله:

رأیت نوراً“ رقم الحدیث (۲۹۱)

② مصدر سابق، رقم الحدیث (۲۹۲)

③ صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب فی قوله علیہ السلام ”إن اللہ لا ینام“ و فی قوله:

حجابہ النور“ رقم الحدیث (۲۹۳)

”رأيت نورا معناه رأيت النور فحسب ولم أر غيره“^①
 ”رأيت نوراً“ کا معنی یہ ہے کہ میں نے صرف ”نور“ دیکھا ہے اور کچھ نہیں
 دیکھا۔“

بارہویں حدیث: شہد والا قصہ

مشہور واقعہ ہے کہ حضور نے اپنی ایک زوجہ کے ہاں جا کر شہد کھایا۔ چند
 دیگر ازواج نے سازش کر کے کہا کہ آپ کے منہ سے بدبو آتی ہے۔ جس
 پر حضور نے قسم کھالی کہ میں آئندہ شہد نہیں کھاؤں گا اور معاً یہ آیت نازل
 ہوئی: ”اے نبی! ایک حلال چیز کو حرام کرنے کا اختیار آپ کو کس نے
 دیا؟ کیا آپ بیویوں کو خوش کرنے کیلئے یہ کر رہے ہیں؟“^② (القرآن)
 اس حدیث کو تجرید البخاری کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا
 ہے کہ حضور نے حضرت زینب کے ہاں شہد کھایا اور حضرت عائشہ اور
 حفصہ نے سازش کی۔^③ لیکن ایک اور حدیث تجرید البخاری
 ۸۹۳: میں بتایا گیا ہے کہ شہد حفصہ کے ہاں کھایا گیا اور سازش حضرت
 عائشہ، حضرت سودہ اور حضرت صفیہ نے کی تھی۔“^④

① شرح النووي علی مسلم: ۱۲/۳

② رکبیں: التحريم: ۱

③ صحيح البخاري: كتاب الطلاق، باب ﴿لَمْ تُحْرَمْ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾، رقم الحديث:

(۴۹۶۶)، صحيح مسلم: كتاب الطلاق، باب وجوب الكفارة على من حرم امرأته ولم

ينو الطلاق، رقم الحديث (۱۴۷۴)

④ صحيح البخاري: كتاب الطلاق، باب ﴿لَمْ تُحْرَمْ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾، رقم الحديث:

۴۹۶۷، صحيح مسلم: كتاب الطلاق، باب وجوب الكفارة على من حرم امرأته ولم ينو

الطلاق، رقم الحديث (۱۴۷۴)

جواب:

محدثین نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کو صرف معرفت کیلئے لائے ہیں یا اصل واقعہ کی تحقیقات کیلئے۔ اور ممکن ہے کہ شہد کا واقعہ دو دفعہ گذرا ہو۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے مائی حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں شہد کھایا ہو۔ پھر آپ ﷺ نے ان کے گھر میں اس قسم کا شہد کھانا بند کر دیا ہو۔ پھر اتفاقاً جب تازہ شہد مائی زینب رضی اللہ عنہا کے گھر آیا، تو آپ ﷺ وہاں کھانے لگے، تو مائی حفصہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے مطلقاً شہد حرام کرا دیا اور اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، جو ہر دو واقعہ پر چسپاں ہو سکتی ہے۔ مگر تحقیق یہی ہے کہ مائی حفصہ رضی اللہ عنہا اور مائی عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس فعل کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ شان نزول کے واقعات تفاسیر میں متعدد ذکر ہوئے ہیں۔ مگر ایک واقعہ شان نزول بنا اور باقی پر آیت منطبق ہوئی۔ صحابہ انطباق کو بھی نزول سے تعبیر کر دیتے تھے۔^① اور قرآن مجید میں واقعات کے تعدد کی طرف اشارہ موجود ہے۔ شروع سورت میں ”ازواج“ بصریہ ”جمع“ ذکر کیا ہے۔ یعنی دو سے اوپر ازواج مطہرات اس واقعات میں شریک تھیں اور آگے چل کر ”تنبیہ“ کا صیغہ استعمال کیا ہے۔^② جس کے معنی ”دو“ کے ہیں۔ چونکہ آخری واقعہ میں دو ہی تھیں، اور اسی واقعہ کے متصل قرآن کی آیات اتریں۔ اس واسطے ان کا ذکر نمایاں طور پر کیا ہے۔

تیسری حدیث:

آگے ایک اور واقعہ ذکر کرتے ہیں:

① الإتيان: ٩٤/١، مناهل العرفان: ٨٣/١

② دیکھیں: التحريم: ٤

شق صدر

”صفحاتِ گذشتہ میں ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کا سینہ بچپن میں چیر کر دل کا وہ حصہ کاٹ ڈالا تھا، جس پر شیطان کا تسلط ہوا کرتا ہے۔ اس واقعہ کے متعلق ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جبریل چھت پھاڑ کر گھر میں اتر آیا تھا اور اس نے آپ کا سینہ چیرا تھا۔“ (مسلم: ۱/۳۲۴) ^①

”چھت پھاڑنے کی بھی خوب کہی۔ ایک نوری مخلوق جس کا نہ کوئی حجم تھا، نہ وزن، اس کو چھت پھاڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر بالفرض وزن و حجم تھا، تو کیا گھر میں داخل ہونے کیلئے دروازہ نہ تھا؟ سب کچھ تھا۔ لیکن جب تک ہمارے علماء داستان میں ڈرامائی رنگ نہ بھر لیں، انہیں تسلی نہیں ہوتی۔ اسی واقعہ کو ”مالک بن صعصعة“ خواب کا واقعہ بتاتے ہیں۔ اور میرے خیال میں یہ صورت زیادہ قرین قیاس ہے۔“ (دوا سلام: ۳۲۱)

جواب:

پہلے تو اعتراض کیا، بعد میں خواب کا واقعہ بتا کر سب واقعہ کو صحیح بنا لیا۔ کیونکہ اعتراض تو اس صورت میں پڑتا ہے، جب واقعہ بیداری کا ہو۔ اگر خواب کا واقعہ ہو، تو چھت پھاڑنا اور سینہ چاک ہونا، سب کچھ روزمرہ کے واقعات کی طرح خواب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اور اگر اس طرح کہا جائے کہ آنحضرت ﷺ کو چونکہ اس خاص گھر سے نکالنا مقصود تھا، اس لئے چھت پھاڑی۔ اب اگرچہ دروازہ سے نکالے جاسکتے تھے، مگر آسمان

① صحیح البخاری: کتاب الصلاة، باب کیف فرضت الصلوات فی الإسراء، رقم الحدیث (۳۴۲) صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الإسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، رقم الحدیث (۱۶۳)

سے سیدھا آنے کا اشارہ تھا کہ اب کسی خاص کام کیلئے آئے ہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس واقعہ کا پہلا حصہ خواب کا ہو۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ اس رات جیسا کہ بعض روایات میں ہے، مسجد میں تھے۔^② مگر آپ ﷺ کو خواب میں ایسا معلوم ہوا کہ میں ام ہانی کے گھر میں ہوں۔ جبرائیل علیہ السلام چھت پھاڑ کر مجھے لائے۔ پھر مسجد میں لٹا کر سینہ چاک کیا۔

چودہویں حدیث: خیر النساء کون ہے؟

”ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ مردوں میں بڑے بڑے کامل انسان ہو کر گزرے ہیں۔ لیکن عورتوں میں آسیہ زوجہ فرعون اور مریم بنت عمران کے بغیر کوئی عورت درجہ کمال تک نہیں پہنچی۔ اور یاد رکھو کہ جس طرح ٹرید کھانوں کا سردار ہے، اسی طرح عائشہ تمام عورتوں کی سردار ہے۔“^③

خلاصہ یہ کہ حضرت عائشہ ”خیر النساء“ ہیں۔ لیکن ایک اور حدیث میں مذکور ہے کہ:

”امت عیسیٰ کی بہترین عورت مریم تھی۔ اور میری امت کی بہترین عورت خدیجہ الکبریٰ ہیں۔“ (بخاری)^④

① صحیح البخاری: کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکہ، رقم الحدیث (۳۰۳۵)، صحیح

مسلم: کتاب الإیمان، باب الإسرائاء برسول اللہ ﷺ، رقم الحدیث (۱۶۴)، مسند

أحمد: ۲۰۸/۴، ابن حبان: ۲۳۶/۱، المعجم الكبير: ۲۷۰/۱۹، الأحاد والمثنائی: ۱۱۴/۴

② صحیح البخاری: کتاب الأنبياء، باب قول الله تعالى ﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ

فرعون.....﴾ رقم الحدیث (۳۲۳۰)، صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب فضل

خديجة أم المؤمنين رضی اللہ عنہا، رقم الحدیث (۲۴۳۱)

③ صحیح البخاری: کتاب الأنبياء، باب، رقم الحدیث (۳۲۴۹)، صحیح مسلم: کتاب فضائل

الصحابة، باب فضل خديجة أم المؤمنين رضی اللہ عنہا، رقم الحدیث (۲۴۳۰)

یعنی خدیجہ الکبریٰ ”خیر النساء“ ہیں۔ اور ایک حدیث میں حضرت فاطمہؓ کو جنتی عورتوں کا سردار قرار دیا گیا ہے۔ (بخاری)^①
اب ہم کیا سمجھیں کہ ”خیر النساء“ کون ہے؟ (دو اسلام)

جواب:

وجہ فضیلت مختلف ہیں۔ مائی خدیجہؓ نے مالی اعانت سب سے زیادہ کی۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ کی سب ازواج مطہرات سے بہتر ہیں۔ اور مائی عائشہ صدیقہؓ علمی خدمات میں سب ”امہات المؤمنین“ سے بہتر ہیں اور حضرت فاطمہؓ جو ہر فطرت کے اعتبار سے سب سے بہتر ہیں۔
دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے متعلق ”خیر النساء“ کا لفظ آیا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق آیا ہے کہ جیسے ثرید کی فضیلت باقی کھانوں پر ہے، اسی طرح عائشہ صدیقہؓ کی فضیلت باقی عورتوں پر ہے۔ ثرید کی فضیلت جزئی ہے، کلی نہیں۔ اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ کی فضیلت بھی جزئی ہے، اور وہ ہے علمی خدمت۔ اور حضرت فاطمہؓ کے متعلق آیا ہے کہ ”سیدۃ نساء اہل الجنة“ (وہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں) اور یہ فضیلت مطلقہ ہے، جو کسی اور عورت کو حاصل نہیں۔ فافہم!



① صحیح البخاری: کتاب المناقب، باب علامات النبوة، رقم الحدیث (۲۴۲۶)، صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل فاطمہ رضی اللہ عنہا، رقم الحدیث (۲۴۲۶)، صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل فاطمہ رضی اللہ عنہا، رقم الحدیث (۲۴۵۰)، ولفظہ: ”سیدۃ اہل الجنة أو نساء المؤمنین“

انیسواں باب

چند دلچسپ احادیث

سجدہ آفتاب:

”ابو ذرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ غروب آفتاب کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ غروب کے بعد آفتاب کہاں چلا جاتا ہے؟ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سورج بعد از غروب خدائی تخت (عرش) کے نیچے سجدے میں گر جاتا ہے۔ رات بھر اسی حالت میں پڑا دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا رہتا ہے۔ چنانچہ اسے مشرق سے دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مل جاتی ہے، لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اسے اجازت نہیں ملے گی اور حکم ہو گا کہ لوٹ جاؤ، جس طرف سے آئے ہو۔ چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے نکلنا شروع کر دیگا۔ اور ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا﴾^۱ کی تفسیر یہی ہے۔“ (بخاری)

اگر ہم رات کے دس بجے ریڈیو پاکستان سے دنیا کو یہ حدیث سنائیں اور کہیں کہ اس وقت سورج عرش کے نیچے سجدے میں پڑا ہے، تو ساری مغربی دنیا کھلکھلا کر ہنس دے اور وہاں کے تمام مسلمان اسلام چھوڑ جائیں!“

• جواب:

جواب دینے سے قبل ضروری ہے کہ اس حدیث کے الفاظ نقل کئے جائیں کہ جب ایک لفظ کا یا کلام کا حقیقی معنی نہ ہو سکے، تو مجازی معنی پر اس کو حمل کرنا ضروری ہوتا ہے:

”قال النبي صلى الله عليه وسلم لأبي ذر حين غربت الشمس أتدري أين تذهب؟ قلت: الله ورسوله أعلم! قال فإنها تذهب حتى تسجد تحت العرش فتستأذن ويؤذن لها ويوشك أن تسجد فلا يقبل منها وتستأذن فلا يؤذن لها يقال لها ارجع من حيث جئت فتطلع من مغربها فذلك قوله تعالى:

﴿والشمس تجري لمستقر لها ذلك تقدير العزيز العليم﴾^①

”آنحضرت ﷺ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ جب سورج غروب ہوتا ہے، تو کہاں جاتا ہے؟ ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے کہا: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں! فرمایا: وہ جاتا ہے، یہاں تک کہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے۔ پھر اذن چاہتا ہے، تو اس کو اذن مل جاتا ہے۔ قریب ہے کہ سجدہ کرے اور اس کا سجدہ قبول نہ ہو اور اذن چاہے، تو اس کو اذن نہ ملے۔ کہا جائے: واپس ہو جا (جہاں سے آیا ہے، اسی طرف چلا جا) پھر مغرب سے نکلے گا۔ قرآن کی اس آیت ”سورج اپنی قرار گاہ کی طرف جا رہا ہے، یہ غالب جاننے والے کا اندازہ ہے“ کا یہی مطلب ہے۔“

① صحیح البخاری: کتاب بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر، رقم الحديث (۳۰۲۷)،

صحیح مسلم: کتاب ایمان، باب بیان الزمن الذي لا يقبل فيه الإيمان، رقم

الحديث (۱۵۹)

اس حدیث میں (۱) سورج کا جانا (۲) عرش کے نیچے سجدہ کرنا (۳) اذن مانگنا پھر اذن ملنا (۴) سجدہ کا قبول نہ ہونا (۵) اذن مانگنا اور اذن نہ ملنا (۶) واپسی کا حکم (۷) آیت کا مطلب مذکور ہیں۔

سورج کا جانا:

① سورج کے جانے کا مطلب تو صاف ہے کہ آگے کی طرف چل رہا ہے، یعنی جس طرح وہ طلوع سے غروب اور غروب سے طلوع تک چلتا ہے، اب بھی اسی طرح چل رہا ہے۔

عرش کے نیچے سجدہ کرنا:

② عرش کے نیچے جانے کا یہ مطلب ہے کہ اب وہ ہمارے آسمان پر نہیں، کیونکہ عرف میں آسمان ”ما فوق الأفق“ کا نام ہے۔ جو حصہ دائرہ افق سے اوپر نظر آتا ہے، اس کو آسمان کہتے ہیں۔ جب اس دائرہ سے نیچے ہو گیا، تو جہاں رات ہو گئی، وہاں کے آسمان سے گویا نیچے اتر گیا۔ مگر عرش کا دائرہ چونکہ آسمان کے دائرے سے وسیع ہے، اس لئے وہ آسمان کے دائرہ سے اتر جانے کے بعد بھی عرش کے نیچے ہی رہے گا۔ اگرچہ پہلے بھی جب وہ آسمان کے نیچے دکھائی دیتا تھا، عرش کے بھی نیچے تھا۔ مگر عرف میں قریب کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اگر مکان کے اندر ہو، تو کہتے ہیں کہ چھت کے نیچے ہے۔ جب باہر نکل جائے، تو آسمان کے نیچے چلا گیا۔ حالانکہ پہلے بھی وہ آسمان کے نیچے تھا، مگر درمیان میں چونکہ واسطہ چھت کا تھا، اس لئے چھت کے نیچے کہا گیا۔ اسی طرح سورج پہلے آسمان کے نیچے تھا، اب عرش کے نیچے کہا جائے گا۔ پس جہاں سورج موجود ہے، وہاں آسمان کے نیچے ہے اور جہاں غروب ہو چکا ہو،

وہاں سورج آسمان کے نیچے نہیں صرف عرش کے نیچے ہوگا۔

اذن مانگنا:

﴿ اذن مانگنا، جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿

﴿يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾^①

”آسمان اور زمین میں ہر کوئی اسی سے مانگ رہا ہے۔“

یا جس طرح فرمایا:

﴿قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ﴾^②

”ہم آسمان اور زمین مطیع ہو کر آئے۔“

پس اذن مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے وہ چل رہا ہے۔ سجدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تابع فرمان ہو کر اس کے حکم کے مطابق چل رہا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنَّجُومُ.....﴾^③

”کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے اور سورج،

چاند اور ستارے سب اللہ تعالیٰ کو سجدہ کر رہے ہیں؟“

نیز فرمایا:

﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾^④

① الرحمن: ۲۹

② فصلت: ۱۱

③ الحج: ۱۸

④ الرحمن: ۶

”ستارے اور درخت بھی (اسی کو) سجدہ کرتے ہیں۔“

سجدہ قبول نہ ہونا:

❖ سجدہ قبول نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کو اس طرح چلنے کی اجازت نہ ہوگی، جس طرح وہ چل رہا ہے۔

اذن نہ ملنا:

❖ اذن نہ ملنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اب اسے اپنا سفر پہلے کی طرف طے کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اب اسے الٹا چلنا پڑے گا، یعنی اسے واپس کر دیا جائے گا اور مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔

حدیث کا مطلب:

پوری حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سورج اب بھی پہلے کی طرح چل رہا ہے، لیکن ایک وقت آئے گا کہ جب یہ افقِ غرب سے بعد از غروب طلوع کریگا (اور یہ قیامت کے قریب ہوگا۔)

ایک اور توجیہ اس کی یہ ہے کہ اس جگہ سورج سے مراد سورج کی روحانیت ہے یا وہ ملائکہ ہیں، جو سورج پر مقرر ہیں۔ اس کی حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر وقت اللہ کے حکم سے سورج چل رہا ہے۔

ایک اور توجیہ یہ ہے کہ آسمان عرفاً ”ما فوق الأفق“ کو کہتے ہیں۔ جب سورج کسی افق والوں کے افق سے نیچے ہو جائے، تو وہاں کے لوگوں کے نزدیک آسمان سے اتر جاتا ہے۔ اسی طرح عرش کا بھی یہی حال ہے، کیونکہ عرش آسمانوں کو محیط ہے۔ پس جب کسی افق سے سورج نیچے ہو جاتا ہے، تو اس افق والوں سے جس طرح دور ہوتا جاتا ہے، اسی طرح عرش سے بھی اس کی دوری تصور ہوگی اور یہ دوری آدمی رات تک بڑھتی چلی جاتی ہے اور عین آدمی رات میں سورج اپنی انتہائی دوری پر ہوتا

ہے۔ اور ہر افق والوں کے عین نیچے اور درمیان ہوتا ہے۔ اسی مقام سے آگے بڑھے، تو مشرق کی طرف طلوع کرتا ہے اور پیچھے ہٹے، تو مغرب سے طلوع کریگا۔ قیامت کے قریب جب سورج اور زمین کے تماسک میں خلل واقع ہوگا، اس وقت عرب کی نصف رات سے پیچھے ہٹ کر مغرب کی طرف طلوع کریگا، اور یہی ہے مطلب حدیث کا!

حدیث کی دوسری توجیہ:

ایک اور توجیہ یہ بھی ہے کہ ہر چیز جو عالم میں پائی جاتی ہے، اس میں دو چیزیں ہیں۔ ایک اس کی ظاہری شکل و صورت، دوم اس کا فعل، ظاہری شکل و صورت مادے کی طرف منسوب ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفت قیومیت کا ظہور ہے۔ اور اس کا فعل اس کی قوت کی طرف منسوب ہے، جو اللہ تعالیٰ کی صفت حیات کا ظہور ہے۔ حقیقت میں قوت ایک روحانی شے ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ہر چیز میں روح موجود ہے، تو نہایت موزوں ہوگا۔ اہل کشف کے نزدیک ہر چیز اپنا ایک وجود ثانی رکھتی ہے۔ یا اہل کشف کو ہر چیز کا ایک لطیف وجود نظر آتا ہے۔ وہ شہادی وجود کی طرح ہوتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے جو سورج کے متعلق ذکر فرمایا تھا، وہ اس کے وجود مثالی کی نقل و حرکت کے متعلق ذکر کیا تھا، یہ عام وعظ نہ تھا۔ صرف ایک زاہد آدمی کے ساتھ کلام تھی۔

آگے چل کر ایک دوسرا اعتراض کرتے ہیں:

شیطان کا طول و عرض:

”کہتے ہیں کہ پیشانی طویل جسم کا سولہواں حصہ ہوتی ہے۔ انسان کا قد اوسطاً ۶۴ انچ ہوتا ہے اور اس کی پیشانی چار انچ۔ یہی نسبت باقی حیوانات میں

بھی پائی جاتی ہے۔

ماہرینِ ارض و سما نے سالہا سال کی تحقیق و تلاش کے بعد اعلان کیا ہے کہ زمین کا محیط ۲۵ ہزار میل ہے۔ یعنی اگر ۲۵ ہزار میل لبادھا کہ تیار کر کے زمین کے ارد گرد لپیٹ دیں، تو وہ بالکل پورا ہو جائے گا۔ سورج زمین سے بارہ لاکھ اسی ہزار گنا بڑا ہے۔ اور اس کا محیط بتیس ارب پچاس کروڑ میل ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ سورج نکلنے اور ڈوبنے وقت نماز نہ پڑھا کرو، اس لئے کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ (بخاری: ۱۳۴/۲)

سورج کی موٹائی بتیس ارب میل ہے، اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ پیشانی طول جسم کا سولہواں حصہ ہوتی ہے، تو شیطان کے جسم کی لمبائی پانچ کھرب بیس ارب میل ہونی چاہیے۔ اور چوڑائی بھی اسی نسبت سے، اتنا بڑا شیطان کہاں کھڑا ہوتا ہوگا؟ زمین سے سورج پینتیس لاکھ میل دور ہے اور شیطان کی لمبائی سوا پانچ کھرب میل۔ اگر شیطان کو زمین پر کھڑا کیا جائے، تو سورج اس کے ٹخنوں سے بھی نیچے رہ جاتا ہے۔ اسے شیطان کے سینگوں تک پہنچانے کیلئے کیا انتظام کیا جاتا ہے اور اتنا بڑا شیطان زمین میں سماتا کیسے ہے؟ اور زمین کے کسی نہ کسی حصے پر ہر وقت سورج طلوع ہوتا رہتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج ہر وقت شیطان کے سینگوں میں پھنسا رہتا ہے! (دو اسلام: ۳۲۵)

جواب:

اس سوال کی دو شقیں ہیں:

① شیطان کی پیشانی جب تک سورج کی موٹائی (ساڑھے بتیس ارب میل) کے برابر نہ ہو، تو اس وقت تک ہم نہیں کہہ سکتے کہ سورج شیطان کے سر کے دونوں حصوں کے مابین ہے۔

② چونکہ سورج ہر وقت طلوع کر رہا ہے، اس سے لازم آتا ہے کہ شیطان ہر وقت سورج کے ساتھ رہے۔

قبل اس کے کہ ہم جواب دیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے لفظ اور اس کا ترجمہ نقل کر دیا جائے، بخاری کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

”إذا طلع حاجب الشمس فدعوا الصلوة حتى تبرز وإذا غاب حاجب الشمس فدعوا الصلوة حتى تغيب ولا تحينوا بصلاتكم طلوع الشمس ولا غروبها فإنها تطلع بين قرني شيطان“^①

”جب سورج کا کنارہ نکلے، تو جب تک پورا طلوع نہ ہو جائے، نماز نہ پڑھو اور جب سورج کا کنارہ ڈوب جائے، تو جب تک پورا غروب نہ ہو جائے، نماز نہ پڑھو، نماز پڑھنے کیلئے سورج کے طلوع و غروب کو وقت نہ بناؤ۔ کیونکہ جب سورج نکلتا ہے، اس وقت شیطان کے دو کناروں کے مابین طلوع ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے“

② ”قرنا الشيطان جانبارأسه“ (فتح الباري: ۲۰۸/۳)

③ صحيح البخاري: كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، رقم الحديث (۳۰۹۹)، صحيح مسلم: كتاب صلاة المسافرين، باب الأوقات التي نهى عن الصلاة فيها، رقم الحديث (۸۲۹)

④ فتح الباري: ۲۵۲/۶، ط: دار المعرفة، بيروت

”شیطان کے دو قرن سے مراد اس کے سر کے دونوں جانب ہیں۔“

”يقال إنه ينتصب في محاذاة مطلع الشمس حتى إذا طلعت كانت بين جانبي رأسه لتقع السجدة له إذا سجد عبدة الشمس لها وكذا عند غروبها وعلى هذا فقوله: ”تطلع بين قرني الشيطان“ أي بالنسبة إلى من يشاهد الشمس عند طلوعها فلو شاهد الشيطان لرآه منتصبا عندها“ (فتح الباري ٢٨/٢: ١)

”اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شیطان سورج کے جائے طلوع پر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے، جب سورج نکلتا ہے، تو اس کے سر کے دونوں کناروں کے مابین نکلتا ہے، تاکہ سورج پرستوں کا سجدہ اس کے آگے ہو۔ یہی صورت غروب کے وقت ہوتی ہے۔ اس صورت میں سورج کا شیطان کے سر کے دونوں کناروں کے مابین نکلنے کا یہ مطلب ہوگا کہ اگر کوئی دیکھنے والا اس منظر کو دیکھ لے، تو اس کو سورج شیطان کے سر کے دو کناروں کے مابین نکلتا ہوا معلوم ہوگا۔“

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص جو غیر اللہ کی پرستش کرتا ہے، حقیقت میں وہ شیطان کی پرستش کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَرِيدًا﴾^②

شرک کی حقیقت:

مشرک خواہ کسی کو پکارتا ہو، حقیقت میں شیطان کو پکارتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی اگر

① فتح الباری: ٢٨٠/٦

② النساء: ١١٧

”لات“ کو پکارتا ہے، تو اس کے متعلق اس کا خیال یہ ہے کہ وہ میری حاجت ردائی کی قدرت رکھتا ہے۔ اس قسم کا ”لات“ نفس الامر میں تو موجود نہیں، کیونکہ اس قسم کے اختیارات اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے ہی مخصوص رکھے ہیں۔ پس وہ ”لات“ جو اس کے دماغ میں مشکل کشائی کے وصف کے ساتھ متصف ہو گیا ہے، وہ شیطان کا پیدا کردہ ہے، پس جو شخص ”لات“ کو پکارتا ہے، دراصل شیطان کو پکارتا ہے۔ اور ”لات“ کا وہ تصور جو اس کے ذہن میں پیوست ہو چکا ہے، کبھی کبھی اس کو خواب اور کشف میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ قوت متخیلہ کا ایک کرشمہ ہے۔ پس وہ صورت جو کبھی کبھی اس کو مختلف مناظر میں جلوہ گر نظر آتی ہے، دراصل اس کی روح شیطان ہے، اس لئے وہ صورت ایک قسم کا شیطان کا بیکل اور اس کا لطیف دماغی مجسمہ ہے۔ اور یہ بات شرک کی ہر صورت میں پائی جاتی ہے۔ مشرک خواہ سورج پرست ہو یا چاند کا پرستار، بت کا پجاری ہو یا کسی دیوی دیوتا کا، اس قسم کے تخیلات میں گرفتار اور اسی کے خمار میں مست و سرشار ہے۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ میری باطن کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور میں نے حقیقت کو پایا ہے۔ دراصل وہ شیطان کے وسوسے کا شکار اور خرابی دماغ میں گرفتار ہے۔ اسی طرح سورج پرست جب سورج کو کسی غلط فہمی کی بناء پر اپنا مشکل کشا سمجھ لیتا ہے اور اس کی روحانیت کے متعلق اس کا خیال ایک دماغی تصویر بنا لیتا ہے، تو خواب و کشف میں اس کو وہ تصویر نظر آنی شروع ہوتی ہے۔ سورج پرستوں کے ہاں اس قسم کے واقعات جن کی بناء پر اسی تخیل پر ہے، مشہور و معروف ہیں۔ پس جب کوئی سورج پرست سورج کی عبادت کرتا ہے، اور اس کو اپنا مشکل کشا خیال کرتا ہے، تو جھٹ وہ دماغی تصویر دماغی حرکت میں آ جاتی ہے اور سورج کے ساتھ اس کو پیوست نظر آتی ہے۔ مگر جب اس کی عبادت کا وقت گزر جاتا ہے، تو وہ تصویر بھی اس کے وہم کے مطابق اس کے سامنے سے ہٹ کر اس کے خیال میں چلی جاتی ہے، اسی

تصویر کو آنحضرت ﷺ نے شیطان کہا ہے، جو ہر عابد کو اپنے معبود کے ساتھ خواب و کشف میں نظر آتی ہے۔ اور یہ کلام اس کے مشاہدہ اور اعتقاد کی بناء پر ہے۔ جیسے فتح الباری کی عبارت میں تصریح ہے۔ یہاں کسی شے کا چھوٹا یا بڑا دکھائی دینا، اس کے خارجی وجود کی بناء پر نہیں، تاکہ اس کے لئے حساب کا قاعدہ جاری کیا جائے، بلکہ حسی وجود کی بناء پر ہے۔ حسا چونکہ سورج صرف ایک بالشت موٹا نظر آتا ہے، پس ایسی صورت جس کے سر کا قطر ایک بالشت ہو، اگر سورج کے ساتھ نظر آجائے، تو وہ کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے، جو حدیث میں مذکور ہے۔

ایک اور توجیہ:

شیطان ایک نہیں، بلکہ بہت سے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

﴿أَنَا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾^①

”ہم شیاطین کو کافروں پر چھوڑ دیتے ہیں۔“

پس ہر افق کا شیطان الگ الگ ہے۔ یہ شیطان اس وقت عابد کے سامنے ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے کہ جب ”ذوالقرنین“ مغرب میں پہنچے، تو سورج کو دیکھا

کہ ایک دلدل کے چشمے میں غروب ہو رہا ہے:

﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾^②

اس کا مطلب صاف ہے کہ مغرب کی انتہائی آبادی میں اس وقت دلدل تھی۔

اور یہ قاعدہ ہے کہ سورج غروب ہوتے وقت مغربی جانب کی اشیاء میں غروب ہوتا

نظر آتا ہے۔ پس سمندر کے سوار کو سورج سمندر میں غروب ہوتا نظر آئیگا۔ اسی طرح

① مریم: ۸۳

② الکہف: ۸۶

”ذوالقرنین“ کو کچھڑ اور چشمے میں غروب ہوتا معلوم ہوا۔ اب اگر آپ کے مطابق یہ کہا جائے کہ سورج کی موٹائی ساڑھے بتیس ارب میل ہے، تو یہ چشمہ جس میں یہ غروب ہوتا انہیں معلوم ہوا، کتنا بڑا ہوگا؟ ظاہر ہے یہ سورج کی موٹائی سے بڑا ہوگا۔ اب بتائیے کہ یہ چشمہ کہاں ہے جو زمین سے بھی بڑا ہے اور سورج سے بھی بڑا ہے، لیکن زمین پر موجود ہے۔ کہئے یہ گتھی آپ کیونکر سلجھائیں گے؟ کہہ دیجئے کہ زمین (جس پر یہ چشمہ ہے، جس میں سورج بھی سما جاتا ہے) سورج سے بہت بڑی ہے۔ لیکن اس پر تو مغربی دنیا کھلکھلا کر ہنسنے لگی گی۔ تو پھر جناب من بات وہی ہے، جو ہم نے کہہ دی ہے۔ اسے تسلیم کر لیجئے۔

ویسے بھی عام بول چال میں یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ سورج صحن میں ہے، سورج ابھی دیوار کے پیچھے ہے، سورج سر پر ہے، سورج درختوں کی اوٹ میں ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان محاوروں کا مطلب بچے بھی جانتے ہیں، مگر جب اعتراض کرنا ہی غرض ہو، تو انسان کی عقل بچے سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ سورج یا چاند کو کسی پانی کے گڑھے میں دیکھ کر اس کو نکالنے، مانپے اور کبھی حیرت میں پڑھ کر چہ میگوئیاں کرنی شروع کر دیتا ہے۔

۲۔ دوسرے اعتراض کا جواب بھی اب سمجھ میں آ گیا ہوگا، کیونکہ مقترض نے یہ سمجھا ہے کہ شاید وہ شیطان سورج کے ساتھ پیوست ہوتا ہے اور وہ ایک ہی ہے۔ ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ شیطان ہر عابد کی دماغی تصویر ہے، یا ہر علاقہ کا الگ شیطان ہے۔

حدیث کا علم الجغرافیہ:

”موسم کس طرح بدلتے ہیں؟ ہم اور آپ تو اتنا ہی جانتے ہیں اور حقیقت

بھی یہی ہے کہ موسم گرما میں ہم سورج کے قریب ہو جاتے ہیں اور سرما میں دور۔ اس لئے گرمی اور سردی محسوس کرتے ہیں۔ گرمی میں زمین کے خاکی ذرات گرم ہو جاتے ہیں، اور چونکہ یہ ذرات پہاڑوں پہ کم ہوتے ہیں۔ اس لئے وہاں مقابلتاً ٹھنڈک ہوتی ہے۔ لیکن حدیث کہتی ہے:

”ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جہنم نے خدا کے پاس شکایت کی کہ میرا دم گھٹ چلا ہے، اس لئے مجھے سانس لینے کی اجازت دی جائے، اللہ نے کہا کہ تم سال میں صرف دو سانس لے سکتے ہو۔ چنانچہ اس کی ایک سانس سے موسم گرما اور ایک سانس سے موسم سرما پیدا ہو گیا۔“ (بخاری) ^①

لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ہر سال گرمیوں میں صرف دو ہی علاقے اس سانس کی لپیٹ میں کیوں آتے ہیں، جو خط استوا کے قریب ہیں۔ اور سارا یورپ، سا بھریا، گرین لینڈ اور کینیڈا وغیرہ کیوں بچ جاتے ہیں؟
الح (دو اسلام: ۳۲۶)

جواب:

اس اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ جب سردی اور گرمی کا تعلق سورج کے قریب اور دور ہونے سے ہے، تو حدیث کا مطلب کیا ہے؟
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گرمی کا تعلق سورج کے ساتھ ہے اور ایک حدیث میں بھی اس کا ذکر ہے:

① صحیح البخاری: کتاب مواقیب الصلاة، باب الإبراد بالظہر فی شدة الحر، رقم الحدیث (۵۱۲)، صحیح مسلم: کتاب المساجد، باب إستحباب الإبراد بالظہر فی شدة الحر، رقم الحدیث (۲۱۷، ۲۱۵)

① ”ما أيقظنا إلا حر الشمس“ (بخاری)

”ہم کو سورج کی گرمی نے جگایا“

مگر اس حدیث میں ایک اور بات کی طرف اشارہ ہے کہ عالم میں جتنی چیزیں ہیں، ان کا ظہور مادے کی بناء پر ہے اور ان کا فعل ان کی قوت کی بناء پر ہے۔ ہر چیز مادہ اور قوت فنا یا انتشار کا شکار ہو رہے ہیں اور محدود زندگی کے لئے ان کو ہر لمحہ روحانی امداد پہنچ رہی ہے۔ اگر ان کو روحانی امداد نہ ملے، تو ہر شے تھوڑے عرصہ میں فنا ہو جائے یا منتشر ہو جائے۔ سورج گرمی چھوڑ دے اور برف سردی۔ پس وہ منبع جس سے سورج کو گرمی اور ہوا اور پانی کو سردی میں مدد ملتی ہے، وہ جہنم ہے۔ حدیث میں سورج سے گرمی پہنچنے سے انکار نہیں، بلکہ اس میں گرمی کا منبع بتایا گیا ہے۔

بعض محققین نے ایک لطیف جواب دیا ہے اوزوہ یہ کہ عالم شہادت جس کی شکل و صورت اور کیفیت کو ہم حواس اور عقل سے محسوس کرتے ہیں اور عالم مثال جس کو ہم اپنے خیال سے جان سکتے ہیں، یہ دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ پھر ان دونوں کیلئے ایک ایسا منبع ہے، جس سے اچھی کیفیات کا ظہور ہوتا ہے اور دوسرا ایسا منبع ہے، جس سے مخالف اور مضر کیفیات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ مضر کیفیت خول جہنم میں جائے یا دنیا میں آئے، اس کا منبع ایک ہے۔ جب ایک منبع سے دو نہریں نکلتی ہوں، اگر ان میں سے ایک کا پانی بند کر دیا جائے، تو دوسری میں پانی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگر دونوں میں پانی چھوڑا جائے، تو پہلی میں بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس عالم کے پیدا ہونے سے قبل عالم مثال تھا اور اس وقت منبع سے صرف جہنم ہی کی کیفیات مضرہ کا اخراج

① صحیح البخاری: کتاب التیمم، باب الصعیذ وضوء المسلم یکفیه من الماء، رقم

الحديث (۳۳۷)، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة، رقم

الحديث (۶۸۲)

ہوتا تھا۔ یہی شکایت کا وقت تھا (اور یہ شکایت بعض علماء کے نزدیک زبان حال سے تھی اور بعض کے نزدیک زبان قال سے) اس کے بعد یہ عالم پیدا ہوا، تو اس عالم میں بھی کیفیات مضمرہ کے اسباب پیدا کر دیئے۔ کیفیات مضمرہ کے ظہور کیلئے جیسے فاعل کے بغیر چارہ نہیں، ویسے ہی محل کی قابلیت کی بھی ضرورت ہے۔ پس وہ کیفیات مضمرہ جو اس عالم کے وجود سے پہلے صرف جہنم کی طرف رجوع کرتی تھیں، اس عالم کے پیدا ہونے کے بعد اس میں کمی ہو گئی۔

اور بعض علماء اس حدیث کو صرف تمثیل قرار دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ گرمی تکلیف دہ چیز ہے۔ ان کے نزدیک نہ کلام ہے، نہ انتقال، بلکہ صرف ایک تمثیل ہے۔ جیسے مثل مشہور ہے کہ سب قومیں اللہ کے پاس گئیں اور سب کو ایک ایک کسب دیا۔ ایک قوم باقی رہ گئی اور کسب ختم ہو گئے، تو اللہ نے فرمایا کہ تمہارے لئے کوئی کسب نہیں، جو کسب دیکھو کر لو۔ اس تمثیل کا یہ مطلب ہے کہ یہ قوم سب کسب کرتی ہے۔ اسی طرح اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ گرمی تکلیف دہ چیز ہے، ایسی تکلیف دہ جیسے جہنم سے آئی ہوئی ہے۔

اس کے آگے ایک اور حدیث پہ جرح کرنی چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں:

حدیث کا علم الطب:

”ماہرین طب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ مکھی ایک نہایت خطرناک جانور ہے، جو مہلک امراض کے جراثیم ایک جسم سے دوسرے جسم تک منتقل کرتی رہتی ہے۔“

لیکن حدیث کہتی ہے کہ:

”إِذَا وَقَعَ الذَّبَابُ فِي شَرَابٍ أَحَدُكُمْ فَلْيَغْمَسْهُ ثُمَّ لِيَنْزِعْهُ فَإِنَّ

ففي إحدى جناحيه داء و الآخرى شفاء“^①
 ”اگر مکھی پانی میں گر جائے، تو اسے ڈبو کر نکال دو، اس لئے کہ اس کے
 ایک پر میں بیماری ہے اور دوسرے پر میں شفا ہے۔“ (دوا اسلام: ۳۲۷)

جواب:

اعتراض کی حقیقت یہ ہے کہ مکھی بیماری کے جراثیم اٹھا کر لے جاتی ہے اور
 گندگی اس کی غذا ہے اور اس کے جسم میں موجود ہوتی ہے۔ پس حدیث کا یہ کہنا کہ
 ”اگر پانی میں گر جائے، تو اس کو ڈبو کر نکالو، کیونکہ اس کے دوسرے پر میں شفا ہے۔“
 ٹھیک نہیں!

مگر اس امر پر غور نہیں کیا کہ اس کے جسم میں ایک ایسا تریاق موجود ہے، جو اس
 گندگی کو فنا کر دیتا ہے، جو اس کے جسم کے اندر موجود ہوتی ہے اور اس کے جراثیم کے
 مہلک اثرات کا اس میں علاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکھی ان تمام زہریلی چیزوں کو کھا
 جاتی ہے، جو ہمارے لئے مہلک ہیں، مگر ان کے کھانے سے مرقی نہیں، بلکہ چست و
 چالاک ہوتی ہے۔ بعض بچے جن کو دق الاطفال کی بیماری ہو جاتی ہے، ان کا علاج
 مکھیوں کے کھلانے سے کیا جاتا ہے۔ اور ایک قسم کی مکھی ذبح خانے میں موجود ہوتی
 ہے، اس سے مرگی کا علاج کیا جاتا ہے۔ مکھی کے افعال سے جن علماء نے بحث کی
 ہے، ان کا اقرار ہے کہ مکھی کے جسم میں جراثیم کش تریاق موجود ہے۔

مکھی کی عادت ہے کہ جب گرتی ہے، تو ایک پہلو پر گرتی ہے۔ اپنے آپ کو
 بچانے کیلئے پر جھاڑتی ہے، اس طرح جو مادہ پروں کے ساتھ ہوتا ہے، جھڑ جاتا ہے۔

① صحيح البخاري: كتاب بدء الخلق، باب إذا وقع الذباب في شراب أحدكم.....، رقم الحديث

اب اس میں تریاقیت کا اثر باقی ہے، جوڑ بونے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس حدیث سے تو آنحضرت ﷺ کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ الناعتراض کر رہے ہیں! آگے پھر ایک حدیث پر اعتراض ہے:

حدیث کا علم التولید:

”رحم مادر میں بچہ کیسے بنتا ہے؟ نروادہ کی علامات اس میں کس منزل پر کس طرح پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ ماں یا باپ دونوں کے خدوخال کیسے حاصل کر لیتا ہے؟ یہ فطرت کے وہ رموز ہیں، جنہیں کوئی ماہر فطرت آج تک نہیں سمجھ سکا، لیکن ہمارے علماء ان مسائل کو صدیوں پہلے حل کر چکے ہیں۔

”مرد کا نطفہ سفید ہوتا ہے اور عورت کا زرد، انزال کے بعد یہ ہر دو قسم کے نطفے مل جاتے ہیں، اگر یہ مائل بہ سفیدی ہو، تو بچہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ بچی۔“^① (مسلم)

ماہرین تولید اس امر پر متفق ہیں کہ عورت کا نطفہ مقدار میں بیحد کم یعنی بمشکل ایک آدھ قطرہ ہوتا ہے اور مرد کا کافی زیادہ۔ اگر دونوں نطفے مل جائیں، تو عورت کا نطفہ نظر تک نہ آئے۔ اس صورت میں چاہئے تو یہ تھا کہ مجامعت میں ہمیشہ لڑکا پیدا ہو، چہ جائیکہ وہ نطفہ مرد کا رنگ بدلتا پھرے۔

خدوخال کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ”مجامعت کے وقت اگر مرد کا انزال پہلے ہو، تو بچہ باپ پر جاتا ہے، ورنہ ماں پر۔“ (بخاری)^②

① صحیح مسلم: کتاب الحيض، باب وجوب الغسل على المرأة بخروج المني منها، رقم الحديث (۳۱۱)، برق صاحب کے ذکر کردہ ترجمہ کے بارے میں وضاحت آگے آ رہی ہے۔

② صحیح البخاری: کتاب الانبياء، باب قول الله تعالى ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ﴾ رقم الحديث (۳۱۵۱)

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ہاں ایسی اولاد پیدا ہو، جو فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ اور ابلیس کی زد سے بالکل باہر ہو، تو لیجئے نسخہ حاضر ہے:

ابن عباس رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص مجامعت کرنے لگے، تو یہ دعا پڑھ لے:

”بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان ما رزقنا“
(بخاری) ①

”اے اللہ! مجھے اور میری اولاد کو شیطان سے بچا۔“
تو اس کی اولاد کو شیطان کبھی گمراہ نہ کر سکے گا۔

کتی امرت دھارا قسم کی دعا ہے کہ نہ قرآن کی ضرورت باقی رہی اور نہ رسول کی۔ (دو اسلام)

جواب:

یہاں یہ اعتراض ہے کہ:

حدیث میں باپ یا ماں کے ساتھ بچے کی مشابہت کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح لڑکا یا لڑکی ہونے کا سبب ذکر کیا گیا ہے۔ ابھی تک اس کا پتہ نہیں چلا، بلکہ واقعہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ نطفہ کا صرف ایک ذرہ استعمال ہوتا ہے، باقی بالکل بہہ جاتا ہے اور عورت کا نطفہ بالکل قلیل ہوتا ہے۔ رگت کے لحاظ سے اس کے غالب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر دعا پڑھنے سے بچہ شیطان کے اثر سے بچ جائے، تو پھر قرآن، رسول کی کہاں ضرورت رہی؟

② صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب التسمیۃ علی کل حال و عند الوقاع، رقم الحدیث (۱۴۱)، صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب ما یستحب أن یقولہ عند الجماع، رقم

الحدیث (۱۴۳۴)

یہ ہے اعتراض! اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی لڑکا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی، اور کبھی بچہ ماں کے مشابہ ہوتا ہے اور کبھی باپ کے۔ ماہرین کو ابھی تک اس کا سبب معلوم نہیں۔ مگر بعض ماہرین کہتے ہیں مکہ مذکور و مؤنث کا تعلق عورت کے نطفہ سے ہوتا ہے۔ بعض مہینوں میں لڑکے پیدا ہوتے ہیں اور بعض میں لڑکیاں۔ مگر ان کا یہ قاعدہ تخمینہ ہی ہے، کلی نہیں۔ ماہرین کو بہر کیف کوئی ٹھوس چیز معلوم نہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اس کے متعلق بتایا ہے۔ حدیث میں یہ لفظ نہیں کہ یہ مرکب مائل بہ سفیدی ہو، تو بچہ ہوتا ہے۔ بلکہ حدیث کے یہ لفظ ہیں کہ اگر مرد کا نطفہ غالب ہو، تو لڑکا، ورنہ لڑکی۔ غلبے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ زیادہ ہو، بلکہ معنوی غلبہ مراد ہے۔ یعنی مرد کے نطفہ میں لڑکا بننے کا اثر ہوتا ہے اور عورت کے نطفہ میں لڑکی بننے کا۔ اب جس کا اثر غالب ہو گا، وہی صورت ہوگی۔ غلبہ سے مراد یہ نہیں کہ اگر مرد کا نطفہ زیادہ ہوگا، تو لڑکا، ورنہ لڑکی۔ اگر غلبہ میں کثرت کا بھی لحاظ رکھا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مرد کا نطفہ جتنا انعقادِ حمل میں خرچ ہوتا ہے، اس کے اندازے میں تفاوت ہوتا ہے۔ لڑکا بننے کیلئے کچھ زیادہ خرچ ہوتا ہے اور لڑکی بننے کیلئے کچھ کم۔

مشابہت والی حدیث میں ”سبق“ کا لفظ ہے، جس کے معنی بڑھنے کے ہیں۔ اگر مرد کا نطفہ بڑھ جائے، تو باپ سے مشابہت ہوگی ورنہ ماں سے۔ بڑھنے کے معنی پہلے انزال ہونے کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور معنوی بڑھنا بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ دعاء کے اثر کا یہ مطلب نہیں کہ بچہ ایسا نیک ہوگا کہ اس کو قرآن اور رسول کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اس کے شامل حال ہوگا اور قرآن و سنت سے مستفید ہونے کی اس میں قابلیت ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ بچے کو شیطان جسمانی ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ شیطان مرد کے ساتھ اس کے فعل میں شریک ہو کر بچے

میں ضرر کا باعث نہ بنے گا۔ نیز ان امور کا تعلق ایمان کے ساتھ ہے۔ کیونکہ دعا کے اثر کا ذکر تو قرآن میں بھی ہے۔ جب مریم علیہا السلام پیدا ہوئیں، تو ان کی ماں نے یہ کہا:

﴿إِنِّي أَعِيزُهَا بِكَ وَذَرِيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾^①

”میں اس کو اور اس کی ذریت کو مردود شیطان سے تیری پناہ میں دیتی

ہوں۔“

جب ولادت کے بعد دعا کی جا سکتی ہے، تو انعقادِ حمل سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾^②

”مجھ سے مانگو، میں دوں گا۔“

آگے ایک اور حدیث پر اعتراض کرتے ہیں:

حدیث کا علم الاصوات:

”مرغ کیوں بانگ دیتا ہے؟ گدھا کیوں ہینکتا ہے؟

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ تم مرغ کی صدا سنو،

تو اللہ سے فضل کی دعا مانگو، اس لئے کہ اس وقت مرغ کو فرشتہ نظر آیا کرتا

ہے۔ اور جب گدھے کی آواز سنو، تو شیطان سے پناہ مانگو۔ اس لئے کہ وہ

شیطان کو دیکھ کر ہینکتا ہے۔“ (بخاری)^③

① آل عمران: ۳۶

② غافر: ۶۰

③ صحیح البخاری: کتاب بلد الخلق، باب خیر مال المسلم غنم یتبع بها شعف الجبال، رقم

الحديث (۳۱۲۷)، صحیح مسلم: کتاب الذکر والدعاء والتوبة، باب استجاب الدعاء عند

صباح الديك، رقم الحديث (۲۷۲۹)

جواب:

مرغ جب بڑا ہوتا ہے، تو بانگ دیتا ہے، یعنی نشوونما کی تکمیل پر پہنچ کر اس میں یہ فعل ہوتا ہے اور رات کو اس کی آواز سے متنبہ ہو کر آدمی نماز کیلئے تیار ہوتا ہے اور اس کی آواز سریلی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں اس قسم کی ہیں کہ ان کو فرشتوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور گدھے کی آواز کو قرآن نے بھی قبیح قرار دیا ہے، بلکہ سب آوازوں سے اس کو برا کہا ہے:

﴿إِنْ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتَ لَصُوتَ الْحَمِيرِ﴾^۱

”سب آوازوں سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔“

اس لئے اس کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔

بعض محققین نے یہ ذکر کیا ہے کہ ہر نوع کے لئے عالم مثال میں ایک صورت ہے۔ اسی صورت کی طرف اس کے نوعی احکام منسوب ہیں۔ بہترین انواع کی تصاویر بہتر ہیں اور منکر ترین انواع کی تصاویر بری۔ بہترین مثالی صورت کو فرشتے اور بری صورت کو شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مرغ کی آواز اور گدھے کی آواز اپنی اپنی مثالی صورت کے تابع ہیں۔ ہر حیوان چونکہ اپنی تصویر یا اپنی جنس کو دیکھ کر یا خیال کر کے آواز کرتا ہے، اس لئے اس کو فرشتے اور شیطان کے دیکھنے سے تعبیر کیا۔

اور عین ممکن ہے کہ جب مرغ میں بانگ کہنے کی تحریک ادنیٰ درجہ پر ہو، تو فرشتہ دیکھنے سے وہ تحریک اس درجہ پر پہنچ جائے کہ بانگ دیدے۔ اسی طرح گدھے میں آواز کی خواہش کو تیز کرنے میں شیطان کو بھی دخل ہو، جیسے انسانی تحریکات میں بھی

بعض وقت شیطان کو اور بعض وقت فرشتے کو دخل ہوتا ہے۔ حالانکہ اصل تحریک انسان کے دماغ سے ہی اٹھتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِذْ يُوْحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾^①
 ”تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، پس مومنوں کو ثابت قدم بناؤ۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿الشَّيْطٰنُ يَعْصِيْكَ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكَ بِالْفَحْشَآءِ﴾^②
 ”شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔“
 آگے ایک مسئلہ لکھتے ہیں:

حدیث کا علم الآداب:

”عن أنس أن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان إذا سلم سلم ثلاثاً وإذا تكلم بكلمة أعادها ثلاثاً“^③
 ”انس کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی یہ عادت تھی کہ وہ تین مرتبہ سلام کہتے اور ہر بات کو تین بار دہراتے۔“ (بخاری)

جواب:

اس جگہ سلام سے مراد وہ سلام ہے، جو کسی مکان کے دروازے پر جا کر کہا جاتا

① الأنفال: ۱۲

② البقرة: ۲۶۸

③ صحيح البخاري: كتاب العلم، باب من أعاد الكلمات ثلاثاً

الحديث (۹۴)

ہے، یعنی کسی شخص کو مکان سے باہر بلانا ہو، تو سلام کہو، اگر جواب نہ ملے، تو پھر تین بار تک کہو۔ اس پر بھی جواب نہ آئے، تو واپس چلے جاؤ، جیسا کہ دوسری احادیث سے اس کا پتہ چلتا ہے۔^①

اور تکرار اس کلمہ کا کرتے، جس کی تاکید مقصود ہوتی یا خطرہ ہوتا کہ ذہن سے کہیں اتر نہ جائے۔ اس سے مقصد شریعت کی حفاظت تھی۔ یہ مطلب نہیں کہ ہر کلام تین تین بار کرتے۔ کیونکہ اس حدیث کے پیچھے یہ لفظ ہیں۔ ”حتی تفہم عنہ“ تاکہ کلمہ ذہن نشین ہو جائے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر کلام تین بار نہیں کہتے تھے۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا

اس سے آگے حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک حدیث کی نقل کرتے ہیں:

”حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھاد کے ایک ڈھیر کے قریب آئے اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔“^②

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں کھاد کا ڈھیر تھا، وہاں پاس دیوار تھی اور حذیفہ کو اپنے

- ① ویکھیں: صحیح مسلم، کتاب الآداب، باب الاستئذان، رقم الحدیث (۲۱۵۳)، سنن الترمذی: کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی الاستئذان ثلاثہ، رقم الحدیث (۲۶۹۰)، مسند أحمد: ۳۹۳/۴، نیز ویکھیں: فتح الباری: ۲۵۰/۱
- ② صحیح البخاری: کتاب العلم، باب من أعاد الحدیث ثلاثا لیفہم عنہ، رقم الحدیث (۹۵)
- ③ صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب البول عند صاحبه والتستر بالحائط، رقم الحدیث (۲۲۳)، صحیح مسلم: کتاب الطہارۃ، باب المسح علی الخفین، رقم الحدیث (۲۷۳)

پاس پشت کی جانب پھرا کر کھڑا کر دیا کہ کوئی نہ دیکھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے گھٹنے میں درد تھا، جیسا کہ ”سنن بیہقی“ میں ہے۔^① آپ ﷺ وہاں بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ عذر کے وقت ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ آگے ایک اور حدیث لکھتے ہیں:

حدیث کا علم الزلزال:

((قال النبي صلى الله عليه وسلم اهتز عرش الرحمن لموت سعد بن معاذ))^②

”آنحضرت فرماتے ہیں کہ سعد بن معاذ کی موت پر خدائی تخت کا ہلنے لگ گیا تھا۔“ سعد کی موت پر عرش کیسے ہل گیا؟

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے آسمان اور زمین روتے ہیں، اسی طرح عرش بھی ہل گیا۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ﴾^③

”فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہونے پر آسمان و زمین نہ روئے۔“

① سنن بیہقی: ۱۰۱/۱، المستدرک ۲۹۰/۱، اس کی سند میں ”یحییٰ بن عبد اللہ بن ماہان

الکرایسی“ اور ”حماد بن غسان“ ضعیف ہیں۔ (لسان المیزان: ۲۶۵/۶، ۳۵۱/۲۰) اسی بناء پر امام بیہقی اور حافظ ذہبی رحمہما نے اسے ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔

② صحیح البخاری: کتاب فضائل الصحابة، باب مناقب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث (۳۵۹۲)، صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث (۲۴۶۶)

③ الدخان: ۲۹

یہ تو ایک محاورہ ہے کہ فلاں کی موت پر دنیا ال گئی، یعنی اس کی موت مسلمانوں کیلئے ایک بڑا صدمہ تھا، یا یہ مطلب ہے کہ عالم بالا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ فرشتوں نے استقبال کیا، قرآن مجید میں ہے:

﴿تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ﴾^①

”آسمان قریب ہیں کہ اوپر سے پھٹ پڑیں۔“

اگر عرش کے ٹپنے کو حقیقت پر محمول کیا جائے، تو اس میں کیا استحالہ ہے؟
”زلزال“ کا تعلق زمین سے ہے نہ کہ عرش سے!

حدیث کا علم الألسنة:

”حضور ﷺ نے فرمایا کہ قرآن سات زبانوں میں اتارا گیا ہے۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ وہ باقی زبانیں کہاں گئیں؟ پھر ایک مضمون کو ایک ہی فقرے میں ادا کیا جائے، تو اسے یاد کرنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن یہ حدیث کچھ اور ہی بتاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ سے جبریل نے کہا کہ قرآن صرف ایک زبان میں پڑھا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ چیز میری امت کی طاقت سے باہر ہے۔“^②

جواب:

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن سات حروف پر اترا ہے۔ اس کا مطلب

① الشوری: ۵

② صحیح البخاری: کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائكة، رقم الحديث (۳۰۴۷)، صحیح

مسلم: کتاب صلاة المسافرين، باب بیان أن القرآن على سبعة أحرف، رقم الحديث

(۸۱۹)، صحیح ابن حبان: ۱۳/۳، (۷۳۸)

ہے کہ قرآن تو قریش کی زبان پر اتر ا ہے۔ مگر دوسرے قبائل بھی قرآن کے حروف کو اپنی لغت میں پڑھ سکتے ہیں۔ زیادہ مشہور لغات اس وقت سات تھیں۔ یہ شروع میں آسانی کیلئے تھا۔ جیسا کہ پنجابی زبان ایک ہے، مگر ملتان، شاہ پور اور لاہور کی زبانوں میں فرق ہے۔ مگر یہ فرق کلی نہیں، تھوڑا تھوڑا ہے۔ قرآن تو ایک ہی زبان میں نازل ہوا، مگر زبانوں میں پڑھنے کی رخصت جبریل علیہ السلام لے کر آئے۔

اگر مضمون کو ایک فقرہ میں ادا کیا جائے، تو وہی فقرہ دوسرے شہر کی زبان پر نہ چڑھتا اور اگر اس کو اپنے شہر کی زبان میں پڑھنے کی اجازت دی جائے، تو اس کو ایک گونہ آسانی ہوتی ہے۔

حدیث کا علم النباتات:

”جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ مسجد نبوی میں ایک درخت تھا، جس کے پاس کھڑے ہو کر حضور ﷺ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ پھر جس روز منبر تیار ہو گیا اور آپ منبر پر چڑھ کر وعظ کہنے لگے، تو اس درخت نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے لوحوں کی صدا اس اونٹنی کی طرح تھی، جس کا بچہ مر جائے۔ ہم یہ صدا سن رہے تھے۔ حضور منبر سے اترے، اس درخت پر ہاتھ پھیرا اور وہ چپ ہو گیا۔“^①

اگر آپ کہیں کہ یہ معجزہ تھا، تو پھر رسول نے کفار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کیا تھا؟

﴿هل كنت إلا بشرار سولا﴾^②

① صحیح البخاری: کتاب المناقب باب علامات النبوة، رقم الحدیث (۳۳۹۲)، و لفظہ

”..... کصوت العشار“ یعنی اہی کے رونے کی آواز ایسی تھی، جیسے دس ماہ کی حاملہ اونٹنی روتی ہے۔

② بنی اسرائیل: ۹۳

”میں ایک انسان ہوں، جس کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا تھا، نہ کہ معجزہ دکھانا، اور مسلمانوں کے سامنے معجزہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی، وہ تو پہلے ہی ایمان لا چکے تھے؟

جواب:

- ① اس اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ درخت کا رونا عادت نہیں۔ اگر درخت رویا تھا، تو مکہ کے درخت کیوں نہیں روئے؟
- ② مسلمانوں کو معجزہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟
- ③ کفار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کیا؟

شبہ اول کا جواب یہ ہے کہ رونا خرق عادت تھا، جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿فَالْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثَعْبَانٌ مُّبِينٌ﴾^①

”موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ڈالی، تو ظاہری طور پر اڑدھا بن گیا۔“

علاوہ ازیں آنحضرت ﷺ کے فراق پر ممکن ہے سب درخت روئے ہوں، مگر لوگوں کو یہ رونا سنائی نہ دیتا ہو۔ جب اللہ نے چاہا تو سنا دیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ چاہے، تو کوئی چیز روئے اور جب چاہے نہ روئے۔

﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ﴾^②

”ان پر آسمان و زمین نہ روئے“ یعنی دوسروں پر روتے ہیں۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ رونا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس لئے دکھایا کہ ان کو طمانیت حاصل ہو، جیسا کہ نزولِ مائدہ کی وجہ بیان کی ہے:

① الأعراف: ۱۰۷

② الدخان: ۲۹

﴿نريد أن ناكل منها وتطمئن قلوبنا ونعلم أن قد صدقتنا ونكون عليها من الشاهدين﴾^①

”دستر خوان کے اترنے کی درخواست اس لئے کرتے ہیں کہ ہم اس سے کھائیں، ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم کو یقین ہو جائے کہ تو نے ہم سے سچ فرمایا اور ہم گواہ بن جائیں۔“

تیسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ معجزہ (قرآن مجید) کفار کو دکھایا گیا تھا۔ وہ محض ضد کی بناء پر خاص خاص معجزے طلب کرتے تھے۔ جس کے جواب میں یہ کہا گیا:

﴿سبحان ربی هل كنت إلا بشراً رسولا﴾^②

”میرا رب (اس عیب سے کہ معجزہ نہ دکھائے) پاک ہے (مگر) میں تو صرف بشر رسول ہوں (یعنی مجھے طاقت نہیں کہ کوئی مطالبہ بذات خود پورا کروں۔)“

حدیث کا علم الحقائق:

”ام شریک راوی ہے کہ حضور نے چھپکلی کو مارنے کا حکم دیا تھا، اس لئے کہ یہ آگ کو پھونکوں سے بھڑکاتی تھی، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھینکا گیا تھا۔ (بخاری)^③

① المائدة: ۱۱۳

② بنی اسرائیل: ۹۳

③ صحيح البخاري: كتاب الأنبياء، باب قول الله تعالى ﴿وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ رقم الحديث (۳۱۸۰)، صحيح مسلم: كتاب السلام، باب استحباب قتل الوزغ، رقم الحديث (۳۱۳۱)

بھلا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھپکلی کا کیا بگاڑا تھا؟ اور اس آگ کو جس میں ساٹھ ستر من خشک ایندھن جل رہا تھا، ایک ننھا سا کیڑا کیا بھڑکا سکتا تھا اور اس کے تنفس میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ وہ آگ کے شعلوں میں ذرہ بھر بھی اضافہ کر سکے؟

جواب:

❶ اعتراض یہ کہ وہ کیوں پھونک مارتا تھا؟

❷ اس کی پھونک سے کیا بن سکتا تھا؟

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ وہ کوئی ممیز جانور نہیں، جس نے ابراہیم علیہ السلام کو سمجھ کر پھونک ماری۔ اصل میں حدیث اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ بعض جانور شیطان کا آلہ کار بن جاتے ہیں اور شیطانی الہام کے قبول کرنے کی استعداد ان میں زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ چھپکلی کا پھونک مارنا اسی بناء پر تھا۔ اور اس کو قتل کرنا، حقیقت میں شیطانی آلات کو بے کار کرنا ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ شیطان جب مادے میں کوئی حرکت دینا چاہتا ہے، تو مادی تحریک کو تلاش کر کے اس کے ضمن میں اپنا کام کرتا ہے۔ اگر کسی نے دروازہ تھوڑا سا ہلایا، تو اس کو زیادہ کھول دیا۔ اسی طرح اگر کسی نے پھونک ماری، تو اس کے اثر کو بڑھا دیا، یہ پھونک اگرچہ بظاہر تھوڑی ہے، مگر شیطانی آمیزش سے اس کا اثر بڑھ جاتا ہے۔

اس کے بطل لکھتے ہیں:

”ایک اور حقیقت ملاحظہ ہو، ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے جبریل کو

دیکھا، تھا اس کے چہ سو پر تھے۔“ (بخاری)^①
 صرف ابن مسعود میں کیا خوبی تھی کہ انھیں جبریل نظر آیا، کسی اور صحابی کو
 کیوں نہ دکھائی دیا؟ چہ سو پر آپ نے کیسے کن لیے تھے؟ اور جبرائیل کے
 لیے پروں کی ضرورت ہی کیا تھی؟“

جواب:

اس میں تین شبہات ہیں:

- ① عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ جبرائیل کسی اور کو کیوں نہ دکھائی دیے؟
- ② پر کیسے گئے؟
- ③ پروں کی جبرائیل کو ضرورت ہی کیا تھی؟

پہلا شبہ اس لیے بے اصل ہے کہ دیکھنے والے رسول اللہ ﷺ ہیں، عبد اللہ بن
 مسعود رضی اللہ عنہ نہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو راوی ہیں۔ (بخاری)^②

دوسرا شبہ اس پہلے شبہ پر متفرع ہے۔ جبرائیل کو اصل شکل میں دیکھنے کا ذکر

① صحیح البخاری: کتاب التفسیر، باب قوله ﴿فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی﴾ رقم الحدیث (۴۵۷۵)، صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب فی ذکر سدرۃ المنتہی، رقم الحدیث (۱۷۴)، اس حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے خود جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا تھا۔ بعض روایات میں اس آیت ﴿فَاَنَّ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَذْنٰی﴾ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی کی تفسیر بیان کرتے ہوئے، امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت بایں الفاظ ”حدَّثَنَا ابْنُ مَسْعُودٍ أَنَّهُ رَأَى جِبْرِیْلَ لَهُ سَمَاءٌ حَنَاحٌ“ لائے ہیں۔ جس سے برقی صاحب کو غلط ہوئی ہے۔ کہ دیکھنے والے ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں، حالانکہ وہ آیت کی تفسیر فرما رہے ہیں کہ دیکھنے والے نبی اکرم ﷺ ہیں، جس کی تصریح دیگر روایات میں موجود ہے۔ دیکھیں: صحیح البخاری (۴۵۷۶) کیونکہ جبریل علیہ السلام کے قریب ہونے والے وہی ہیں، جن کی طرف وحی کی گئی تھی۔

② دیکھیں: صحیح البخاری: کتاب التفسیر، باب قوله ﴿فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی﴾ رقم الحدیث (۴۵۷۶)

قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ﴾^①

آپ ﷺ نے جبرائیل کو دوبار دیکھا۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ رَآهُ فِي الْأَفْقِ الْمُبِينِ﴾^②

”آپ ﷺ نے جبرائیل کو افقِ مشرقی میں دیکھا۔“

✽ تیسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ ہر ”أجنحة“ کا ترجمہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿حَاجِلُ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولَىٰ أَجْنَحَةٍ مَّتَنًى وَثَلَاثَ وَرَبْعَ﴾^③

”اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو رسول بنا دیا، جن کے دو دو، تین تین، چار چار پر ہیں۔“

﴿يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ﴾^④

”پیدائش میں جس قدر چاہے اضافہ کرتا ہے۔“

اس کے بعد کہتے ہیں:

حدیث کا علم التاریخ:

”ابو ہریرۃ حضور ﷺ سے راوی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ختنہ اسی

(۸۰) برس کی عمر میں ہوا۔“^⑤

① النجم: ۱۳

② النکویر: ۲۳

③ الفاطر: ۱

④ الفاطر: ۱

⑤ صحیح البخاری: کتاب الأنبياء، باب قول الله تعالى ﴿وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ رقم

الحديث (۳۱۷۸)، صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب من فضائل إبراهيم الخليل عليه السلام،

رقم الحديث (۲۳۷۰)

جواب:

اس پر اعتراض یہ ہے کہ

① پہلے کیوں نہ کیا؟

② ضعف پیری کے باوجود حجام کے آگے جا بیٹھے۔

③ ختنہ کا مقصد اسی برس میں حاصل نہیں ہو سکتا۔

❁ شبہ اول کا جواب یہ ہے کہ پہلے حکم الہی نہیں ہوا، جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے۔

❁ شبہ دوم کا جواب یہ ہے کہ ختنہ آپ نے خود کیا، حجام سے نہیں کرایا۔

❁ اور شبہ سوم کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی سال کی عمر میں ازدواجی زندگی

سے مستغنی نہیں ہو گئے تھے۔ ان کے لڑکے حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت

اسماعیل علیہ السلام اس کے بعد ہی پیدا ہوئے۔ اور ان کے علاوہ اور لڑکے بھی پیدا ہوئے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ:

اس کے بعد ایک اور حدیث لکھتے ہیں:

”ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے راوی ہیں کہ ایک دن حضرت سلیمان علیہ السلام

نے کہا کہ آج رات میں اپنی تمام بیویوں سے، جن کی تعداد ایک سو یا

ننانوے تھی، مجامعت کروں گا۔ ہر بیوی سے شہسوار پیدا ہوگا، جو اللہ کی راہ

میں جہاد کریگا۔ کسی نے کہا کہ ”إن شاء اللہ“ بھی کہئے، مگر آپ نے پرواہ

نہ کی۔ چنانچہ ایک کے بغیر کوئی حاملہ نہیں ہوئی۔^① (بخاری)

حضرت سلیمان عہد تاریخ کے انسان ہیں، عام انسانوں جیسا قد، اتنی ہی عمر اور

طاقت۔ ہم یہ کیسے یقین کر لیں کہ وہ پوری ایک سو بیویوں کے ساتھ مجامعت کی

① صحیح البخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب من طلب الولد للجہاد، رقم الحدیث

(۲۶۶۴)

طاقت رکھتے تھے۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر ایک بیوی کے ساتھ مجامعت کیلئے کم از کم پندرہ منٹ درکار ہوں، تو تمام کے پاس جانے کیلئے پچیس گھنٹے چاہئیں، حالانکہ سردیوں کی لمبی سے لمبی رات چودہ گھنٹوں کی ہوتی ہے، بشرطیکہ اسے غروبِ آفتاب سے طلوعِ آفتاب تک شمار کیا جائے۔“ (دوا اسلام: ۳۳۹)

جواب:

اعتراض کی حقیقت یہ ہے:

① سلیمان علیہ السلام عام انسانوں جیسے ہونے کے باوجود اتنی طاقت کے مالک کیسے ہو گئے؟

② اگر ہر عورت کے لیے پندرہ منٹ درکار ہوں، تو ۲۴ گھنٹے چاہئیں، حالانکہ بڑی سے بڑی رات چودہ گھنٹوں کی ہوتی ہے۔ پس دس گھنٹوں کی کمی کیسے پوری ہوگی؟

پہلے اعتراض میں تو صرف استبعاد ہی استبعاد ہے۔ بعض حالات میں انسان میں طاقت زیادہ ہو سکتی ہے۔ خصوصاً پیغمبروں میں! باقی رہا دس گھنٹے کا تفاوت تو اگر پندرہ منٹ کی بجائے ۵ منٹ مقرر کر لئے جائیں، صرف آٹھ گھنٹے درکار ہیں۔

اختتامی کلمات

الحمد لله! مصنف نے جتنے اعتراضات حدیث پر حملہ کرنے کی غرض سے تراشے تھے، ہم ان کے جوابات سے بری الذمہ ہو چکے ہیں۔ مصنف نے بعض جگہ موضوعِ احادیث سے کام لیا اور بعض جگہ مرفوع کو موقوف بنا کر اعتراض کیا۔ اور بعض جگہ تابعی کو جلیل القدر صحابی فرض کر لیا۔ بعض جگہ حدیث کی غلط ترجمانی کی اور بعض جگہ ضعیف حدیثوں سے استدلال کیا۔ ان کے مقابلہ میں صحیح حدیثوں کو چھوڑ دیا۔ بعض جگہ قرآن مجید میں اضافہ کیا اور غلط آیات لکھیں۔ بعض ایسے مسائل پر اعتراضات کئے، جو قرآن میں بھی موجود تھے۔ لب و لہجہ سوقیانہ اختیار کیا اور بے

سوچے سمجھے کچھ کا کچھ لکھ دیا۔ کبھی محدثین کی تنقید پر اعتراض اور کبھی راویوں پر بے جا حملے، کبھی اپنی عقل پر بے جا اعتماد، حقیقت سے دور، محض عبارت آرائی اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سو اللہ کے فضل سے میں نے ان تمام باتوں کا بالاستیعاب جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ناظرین کیلئے ان کو فائدہ مند بنائے۔ (آمین)

خلاصہ کلام

صفحات گزشتہ میں ہم نے جو وضاحت کی ہے، اس سے روزِ روشن کی طرح

ثابت ہو چکا ہے کہ

① خلفائے راشدین حدیث کو قرآن کے بعد انتہائی سند قرار دیتے تھے اور آنحضرت ﷺ کی احادیث نقل کر کے عمال کو بھیجتے اور حدیث کی حفاظت میں انتہائی کوشش فرماتے رہے۔ احادیث کے جلانے یا مٹانے کی نسبت ان کی طرف غلط اور بے بنیاد ہے۔

② آنحضرت ﷺ نے خود احادیث لکھوائیں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے لکھیں اور تابعین رضی اللہ عنہم نے یہ سلسلہ جاری رکھا، تاآنکہ باقاعدہ حدیث کی تدوین ہونے لگی۔ آنحضرت ﷺ کی طرف مطلقاً کتابت حدیث کی ممانعت کو منسوب کرنا، حدیث سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جو حدیث لکھنے سے منع کیا ہے، اس سے صرف قرآن مجید کے ساتھ ساتھ لکھنا مراد ہے۔

③ حدیث کے متعلق یہ خیال کرنا کہ ”اڑھائی سو برس تک اس کے لکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا، بعد میں لکھی گئی“، فن حدیث اور تاریخ سے بالکل ناواقف ہونے کی وجہ سے ہے۔

④ محدثین نے حدیث کی تنقید میں جو روایت اور درایت کے اعتبار سے ممکن تھا، سب کچھ کیا۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت کا صحیح اور مکمل نقشہ لکھ کر

دنیا کو ممنون احسان کیا۔ جزا ہم اللہ

جو حدیث محدثین کے طریق پر صحیح ہوگی، اس میں مندرجہ ذیل امور نہیں ہونگے:

- ① تعلیم قرآن کے خلاف ہونا۔
 - ② قرآنی تحریف کا ظاہر کرنا۔
 - ③ رسول کریم ﷺ، ازواج مطہرات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توہین کرنا۔
 - ④ حقائق کو نبیہ کے خلاف ہونا۔
 - ⑤ انسانی فطرت کو جھٹلانا۔
 - ⑥ عقل، تجربہ، اور مشاہدہ کے الٹ ہونا۔
 - ⑦ مسلمہ تاریخی واقعات کی تردید کرنا۔
 - ⑧ اسلام کے اہم اصول مثلاً توحید و عبادت اور اہم مسائل مثلاً جہاد و ایثار وغیرہ کی منزلت کم کرنا۔
 - ⑨ مسلمانوں کو دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی ہر آن تلقین کرنا۔
 - ⑩ کتاب و سنت کے خلاف کسی عمل کی فضیلت بتانا۔
 - ⑪ وضو سے سارے گناہ معاف ہونا۔
 - ⑫ ذکر کو دائماً اتارا جتنا، جس سے جان و مال کی قربانی کی اہمیت بالکل نہ رہے۔
- سوال اللہ کا فضل ہے کہ مصنف نے اپنے زعم میں جن احادیث کو مندرجہ بالا امور کے تحت لانے کی کوشش کی ہے، ان سب کا جواب ہو چکا ہے۔
- کج بحثی میں آکر صحیح حدیثوں کا انکار کرنے والے نہ جانے مسلمانوں کو کس غار کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمان مسلمان نہ رہیں۔ دہریہ بن جائیں یا یہودی عیسائی ہونے کو ترجیح دیں۔

فتنہ اشتراکیت اور اسلام:

آج کل جو اشتراکیت کا فتنہ سیلاب بن کر دنیا کا رخ کئے ٹھانھیں مارتا آرہا ہے۔ اس سے بچاؤ کا ذریعہ صرف اسلام ہے۔ وہی اسلام جو حدیث کے ذریعہ قرآن مجید کی ترجمانی سے ہمارے سامنے آیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت سے یہ دشمنانِ اسلام پوری طرح واقف ہیں۔ اس لئے حدیث کا انکار کر کے یہ لوگ غلط فہمیاں پیدا کرنا اور اس بناء پر مسلمانوں کو دینِ اسلام سے برگشتہ کرنا چاہتے اور الحاد و دہریت کیلئے راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔

آخری تنبیہ

لیکن سن لو اے منکرینِ حدیث! اگر تم نے اس دیوار (حدیث و سنت) کو گرانے کی کوشش کی، تو تم خود اور تمہارے دوسرے ہمنوا اس سیلاب کی نذر ہو جائیں گے اور پاکستان جو لاکھوں جانوں کی قربانی سے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ یہ بھی خطرہ میں پڑ جائے گا۔

تم قرآن کا نام لے کر حدیث کی تردید کرتے ہو اور حدیث کے مسائل کی تردید کرتے کرتے قرآن پر بھی ہاتھ صاف کر جاتے ہو۔ کیونکہ قرآن کا بیان حدیث ہے۔ جب بیان نہ ہو گا، تو قرآن پر ہاتھ صاف کرنا، آسان ہو جاتا ہے۔ شاید تم لوگ یہ خیال کر رہے ہو کہ اسلامی نظام میں حدیث کے وجود کو بڑا دخل ہے، اس لئے اس کی اہمیت کم کرنے سے ہم نظامِ اسلام میں رکاوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بات تمہارے دماغی عدم توازن کی پیدا کردہ ہے۔

آسان نہیں مٹانا نام و نشان ہمارا

فللہ الحمد!



دوامِ حدیث خالص علمی انداز کی کتاب ہے، اصطلاحات عموماً وہی استعمال ہوئی ہیں، جو علمائے مدارس عربیہ میں متداول ہیں، بعض مباحث دقیق ضرور ہیں، لیکن ٹھوس اور تحقیقی ہیں، زبان کا چٹکارہ اور چاشنی شاید اس میں نہ ملے، کیونکہ اصل غرض نفسِ مسئلہ سے رکھی گئی ہے، یہ طرزِ تصنیف مروجہ طریقہ سے ہٹا ہوا ہے، مگر متلاشیانِ ہدایت و تحقیق کے لیے غالباً مفید ہوگا۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ اس کا مطالعہ اسی نظر سے کیا جائیگا، واضح رہے کہ ”مقامِ حدیث“ کا یہ جواب سینکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا تحقیقاتِ نادرہ اور مباحثِ بدیعہ پر مشتمل ہے۔“

مولانا عطاء اللہ حنیف محدث بھوجپانی رحمہ اللہ

اس تصنیفِ لطیف میں حضرتِ العلام محدث گوندلوئیؒ نے ہمارے زمانے کے عجوبہ روزگار گروہ کی حقیقت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے، جو پوری امت کے متفق علیہ اور اجماعی موقف سے انحراف ہی نہیں بغاوت کر کے صرف یہی نہیں کہ سنتِ مطہرہ کو حجت نہیں سمجھتا، بلکہ خاش بدہن اسے دین کے خلاف سازش قرار دیتا ہے اور اس کے باوصف اسے یہ اصرار بھی ہے کہ وہ قرآن پر ایمان رکھتا ہے، واللہ یشہد انہم لکذیون!

دوامِ حدیث صرف بیانِ حجیتِ حدیث ہی نہیں، بلکہ بیانِ عظمتِ حدیث اور بیانِ ضرورتِ حدیث بھی ہے۔ ”دوامِ حدیث“ حدیث کے وجوہِ اعجاز کا بیان ہے، اس لیے کہ حدیثِ بیان ہے قرآن کا، جس کا امتیازی وصف ہے کہ وہ ایسا آفتاب ہے، جو خود ہی دلیلِ آفتاب ہے۔
غرضیکہ یہ سفرِ جلیلِ علوم و معارفِ حدیث کا خزینہ ہے اور ایک صاحبِ نظر اسے دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے گا:

ز فرقِ تابہ قدم ہر کجا کہ می نگرم

کہ شمعِ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

علامہ زمان کی اس عظیم الشان تالیف جس کی نظیر اس کے نظائر میں نہیں، مجھے یقین ہے کہ دین سے تعلق رکھنے والا جو شخص بھی حضرتِ العلام کی اس تصنیفِ لطیف کا مطالعہ کرے گا، میری اس دعا پر آمین ثم آمین کہے گا کہ اللہ تعالیٰ مؤلفِ علام کو سلفِ امت کے ساتھ اعلیٰ علیین میں مقامِ عطا فرمائے اور ان کے درجاتِ بلند فرمائے۔

حافظ عبد الحمید ازہر حفظہ

